ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر عبادت بریلوی
کے
تحقیقی و تنقیدی مقدمات

جلد دوم

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر عبادت بریلوی
کے
تحقیقی و تنقیدی مقدمات

جلد دوم

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

تصنیف: ڈاکٹر عبادت بریلوی
کے
تحقیقی و تنقیدی مقدّمات
مُصنّف: پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی
ناشر: فرحان عبادت ڈپٹی ڈائریکٹر
ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
سرورق: سیّد انور حسین شاہ نفیس رقم۔ لاہور
کتابت: سیّد محمّد ابراھیم خوش نویس۔ لاہور
مطبع: ندیم یونس پرنٹرز۔ لاہور
اہتمام: سیّد محمّد ابراھیم۔ لاہور
جلدسازی: مدنی بُک بائینڈنگ ہاؤس۔ لاہور
تاریخ اشاعت: مارچ ۱۹۹۸ء
تعاون: اکادمی ادبیات پاکستان۔ اسلام آباد

صوفی صافی بزرگ

جنابِ مقبولؒ میاں صاحب خیرآبادی
کی
خدمت میں

اِن میں سے ایک بزرگ خیرآباد والے مقبول میاںؒ بھی تھے۔ "جن پر ہر وقت ایک عالمِ جذب طاری رہتا تھا۔ صرف جُمعہ کے دِن وہ کسی قدر ہوش میں آتے تھے۔ نہاتے دھوتے اور وضو کرتے، اور کپڑے بدل کر جُمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں جایا کرتے تھے۔

اِس علاقے میں دُور دُور تک لوگوں کو اِس بات کا عِلم تھا کہ عالمِ جذب میں ہونے کی وجہ سے جو کچھ اُن کے مُنہ سے نِکل جاتا تھا وہ ہو جاتا تھا۔"

—— یادِ عہدِ رفتہ (صفحہ ۱۵۵)

عبادت بریلوی

۱۰ر مارچ ۱۹۹۸ء

فہرست

پیشِ لفظ ۵۲۵

(۱۶)

۲۹- کلیاتِ میر ۵۲۷

(۱۷)

۳۰- خطوطِ غالب ۵۳۳

(۱۸)

۳۱- ضرب الامثال ۵۶۱

(۱۹)

۳۲- دیوانِ مُبتلا ۵۷۵

۳۳۔ نقلیاتِ ہندی ۵۸۳

۳۴۔ جشن نامہ ۵۹۱
۳۵۔ جشنِ صدسالہ ۵۹۵
۳۶۔ اورینٹل کالج میگزین ۵۹۹
۳۷۔ جشن نامہ ۶۰۳

(۲۲)

۳۸۔ سحرُ البیان (ایک تنقیدی مُطالعہ) ۶۰۹

(۲۳)

۳۹۔ مُرقع مخلص ۶۲۷

(۲۴)

۴۰۔ رہ نوردانِ شوق ۶۵۷

(۲۵)

۴۱۔ آوارگانِ عشق ۶۵۹

(۲۶)

۴۲- میر تقی میرؔ ۶۶۱

(۲۷)

۴۳- نالۂ درد ۶۶۵

(۲۸)

۴۴- اورینٹل کالج میگزین (شذرات) ۶۷۳

(۲۹)

۴۵- میر تقی میر نکاتُ الشّعراء ۶۷۹

(۳۰)

۴۶- دیوانِ فارسی ۷۰۷

(۳۱)

۴۷- ولی اورنگ آبادی ۷۱۷

(۳۲)

۴۸- سیاحت نامہ ۷۲۱

(۳۳)

۴۹۔ دیوانِ ولا ۷۴۱

(۳۴)

۵۰۔ خواجہ میر دردؔ دہلویؒ ۷۵۷

(۳۵)

۵۱۔ تنقید اور اُصولِ تنقید ۷۶۱

(۳۶)

۵۲۔ خطوطِ عبدالحق ۷۶۳

(۳۷)

۵۳۔ جلوہ ہائے صدرنگ ۷۶۷

(۳۸)

۵۴۔ جہانِ میر ۷۶۹

(۳۹)

۵۵۔ افسانہ اور افسانے کی تنقید ۷۷۳

۵۶- ترکی میں دو سال ۷۷۵

۵۷- دیارِ حبیبؐ میں چند روز ۷۷۷

۴۲

۵۸- غالب کا فن ۷۷۹

۴۳

۵۹- یادِ عہدِ رفتہ ۷۸۵

۴۴

۶۰- آزادی کے سائے میں ۷۸۹

۴۵

۶۱- یارانِ دیرینہ ۷۹۳

۴۶

۶۲- فیض احمد فیض جدید اُردو شاعری ۷۹۷

۶۳- بلاکشانِ محبّت ۸۰۹

۶۴- سیّد آغا حسن عابدی ۸۱۱

۶۵- شاعری کیا ہے؟ ۸۱۵

۶۶- غزالانِ رعنا ۸۱۷

(۵۱)

۶۷- آہوانِ صحرا ۸۲۱

(۵۲)

۶۸- شجر ہائے سایہ دار ۸۲۵

(۵۳)

۶۹- لندن کی ڈائری (جلد اوّل) ۸۲۹

(۵۴)

۷۰۔ خطوط پروفیسر محمد حسن عسکری ۸۳۱

(۵۵)

۷۱۔ لندن کی ڈائری (جلد دوم) ۸۶۳

(۵۶)

۷۲۔ خطوط پروفیسر سیّد احتشام حسین ۸۶۵

(۵۷)

۷۳۔ غالب اور مطالعہ غالب ۸۸۹

(۵۸)

۷۴۔ خطوط احمد ندیم قاسمی ۸۹۳

(۵۹)

۷۵۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ ۹۰۶

پیش لفظ

اللہ تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے 'مقدمات اور پیش لفظ' کی دوسری جلد بھی جنوری، فروری ۱۹۹۸ء میں تیار ہو گئی اور جیسا کہ میں نے پہلی جلد میں وعدہ کیا تھا، اس وقت مارچ ۱۹۹۸ء میں شائع کی جا رہی ہے۔

اس میں ولی اور میر تقی میر، خواجہ میر دردؒ اور ڈاکٹر جان گل کرسٹ سے لے کر غالب، مومن، پروفیسر سیّد احتشام حسین اور احمدؔ ندیم قاسمی تک اُن نادر و نایاب کتابوں کے وہ پیش لفظ اور مقدمات شامل ہیں جو میں نے ایک درویش کے منہ سے نکلے ہوئے فقروں کے تحت مختلف اوقات میں لکھے، اور اب اس کتاب میں شائع کئے جاتے ہیں۔

یہ مقدمات اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ اِن

سے آرزو کی علمی ادبی کاموں کی اہمیّت کا پتہ چلتا ہے، اور اُردو ادب
کی اہم شخصیتوں کی تخلیقات کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اِن میں سے بعض تحریریں ایسی ہیں جو آج تک بھی شائع نہیں
ہوئیں اور بعض ایسی ہیں جو آج سے پہلے سو سال قبل شائع ہوئی
تھیں لیکن اب اُن کا مِلنا مشکل ہے۔

یہ سب کچھ جناب مقبول میاں صاحبؒ کے منہ سے نکلی ہوئی
اُن باتوں کا نتیجہ ہے جو کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں۔

عبادت بریلوی

۲۱۔ سی، یونین پارک
سمن آباد۔ لاہور
۱۰ / مارچ ۱۹۹۸ء

کُلّیاتِ میرؔ

کُلّیاتِ میر سب سے پہلے ۱۸۱۱ء میں فورٹ ولیم کالج نے شائع کیا تھا۔ اِس کو مرتب کرنے والے کالج کے فاضل منشی تھے، اور یہ کلکتّہ کے ہندوستانی پریس میں اے، ایچ، ہبرڈ (A. H. HUBBURD) کے زیرِ اہتمام ٹائپ میں چھپا تھا۔ بلوم ہارٹ[1] نے اِنڈیا آفس کے ہندوستانی مخطوطات کی کیٹیلاگ میں کلّیاتِ میر کے اسی اڈیشن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میرؔ کا کُلّیات اُن کی وفات کے تھوڑے ہی عرصے بعد، فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی

---

[1] کلیاتِ میر، فورٹ ولیم اڈیشن، مطبوعہ ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۱۱ء۔

کے پروفیسر کیپٹن جے، ڈبلیو، ٹیلر (CAPTAIN. J. W. TAYLOR) کی زیرِ نگرانی، ۱۸۱۱ء میں کلکتہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کو مرتب کرنے والے منشی ترنینی چرن، مرزا کاظم علی جوآن اور منشی غلام اکبر تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ میں ۱۸۶۷ء اور ۱۸۷۶ء میں اس کے اڈیشن لیتھو میں شائع ہوئے۔ غالباً یہ وہی اڈیشن ہیں جن کو نول کشور پریس نے چھاپا تھا۔ نول کشور نے کُلیاتِ میر کے متعدّد اڈیشن شائع کیے ہیں۔ آخری بار اس کا اڈیشن ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ اِس نسخے کو مولانا عبدالباری آسی مرحوم نے بڑی محنت سے مُرتّب کیا تھا۔ یہ سب نسخے اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں، لیکن اِن میں سے کسی ایک کو بھی مکمّل نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اوّل تو ان میں میرؔ صاحب کا سارا کلام موجُود نہیں ہے، دُوسرے اِن میں غلطیاں بھی بہت ہیں — یہ نسخے بھی اب عرصے سے نایاب ہیں اور کسی قیمت پر دستیاب نہیں ہوتے۔

مَیں نے کُلیاتِ میرؔ کے اس نسخے کی ترتیب و تدوین میں اِن تمام مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھا ہے اور ان کے علاوہ کلامِ میرؔ کے تقریباً تمام اہم غیر مطبُوعہ نسخوں کو بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے کتب خانۂ ریاست رام پور، کتب خانہ سر سالار جنگ، کتب خانۂ انجمنِ ترقّیٔ اُردو، اور کتب خانۂ محمُود آباد کے مخطُوطے خاص طور پر میرے پیشِ نظر رہے ہیں۔ اسی لیے یہ نُسخہ، اس سے قبل شائع ہونے والے نسخوں سے مختلف ہے۔ اِس میں میرؔ صاحب کا تقریباً سارا کلام موجُود ہے۔ اس سے مکمّل صورت میں کُلّیاتِ میرؔ اس

سے قبل شائع نہیں ہُوا ـــــ مَیں نے کوشش یہی کی ہے کہ میر صاحب کا تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اُردو، کلام، نئی ترتیب اَور صحت کے ساتھ اس میں یک جا ہو جائے۔

میر صاحب کے مراثی اور تین نئی مثنویاں جو اس سے قبل کلیاتِ میر کے کسی اڈیشن میں شائع نہیں ہوئیں، اُن کو مَیں نے اِس نُسخے میں شامل کر دیا ہے اَور مَیں اس کے لیے پروفیسر سیّد مسعود حسن صاحب رضوی ادیب، مسیح الزّماں صاحب اور ڈاکٹر گیان چند صاحب کا ممنُون ہُوں۔

اِس نسخے میں سَو صفحے کا ایک مفصّل مقدمہ بھی شامل ہے۔ مَیں نے اِس مقدمے میں میر صاحب کی زندگی کے حالات، ان کی شخصیت، تصانیف اَور فن کی ساری تفصیل کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اَور اس سِلسلے میں تحقیق و تنقید دونوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

کلامِ میر کی ترتیب و تدوین کا یہ کام مَیں نے آج سے کوئی بارہ سال قبل اپنے شفیق اُستاد پروفیسر سیّد احتشام حُسین صاحب کے ایما پر شروع کیا تھا۔ اُن کی اَور میری دونوں کی یہ خواہش تھی کہ اس کو لکھنؤ یونیورسٹی میں ڈی لٹ کی ڈگری کے لئے پیش کیا جائے۔ مَیں نے ۱۹۴۶ء میں پی، ایچ، ڈی کے مقالے کو لکھنؤ یونیورسٹی میں پیش کرنے کے فوراً ہی بعد اِس کام کو شروع کر دیا تھا لیکن تقسیمِ مُلک کے نتیجے مَیں پیدا ہونے والے حالات میری راہوں میں حائل رہے، اَور مَیں اس کام کو خاطر خواہ تیزی کے ساتھ نہ کر سکا۔ اب خُدا خُدا کر کے اس کے مکمل ہونے کی نوبت آئی ہے اور اَب

پورے بارہ سال بعد یہ کام مطبوعہ صُورت میں لکھنؤ یونیورسٹی کے سامنے ڈی لٹ کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔

اِس کام کو کبھی بھی تکمیل سے ہم کنار ہونا نصیب نہ ہوتا اگر احتشام صاحب کی رہنمائی اور رہبری مجھے حاصل نہ ہوتی مَیں نے اپنی زندگی میں احتشام صاحب سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ کُلّیاتِ میؔر کی ترتیب و تدوین کوئی آسان بات نہ تھی۔ لیکن اُن کے مفید مشوروں نے اِس کام کو میرے لئے آسان بنا دیا۔ ان کے عِلاوہ مَیں نے وقتاً فوقتاً ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب قبلہ، امتیاز علی خاں صاحب عرشؔی، قاضی عبدالودود صاحب، مرزا جعفر علی خاں صاحب اثؔر لکھنوی، نصیرُالدّین ہاشمی صاحب، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب اور سیّد وقار عظیم صاحب سے بھی مشورے طلب کیے، اِن سب بزرگوں اور دوستوں کے مفید مشوروں نے میری بہت سی مُشکلوں کو آسان کیا۔ مَیں ان سب کا تہِ دل سے شکریہ اَدا کرتا ہوں۔

کُلّیاتِ میؔر کا یہ نسخہ ڈیڑھ ہزار صفحات پر پھیلا ہُوا ہے۔ اس کی صحیح کتابت اور اعلیٰ طباعت کا کام بھی آسان نہ تھا۔ کتابت کے کام کو اپنے ہاتھ میں لے کر برادرم سیّد انور حُسین شاہ صاحب زیدی "نفیس رقم" نے میرا بڑا ہاتھ بٹایا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر وُہ اس کام میں ذاتی طور پر دلچسپی نہ لیتے تو اِس کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ انہوں نے اس کام کو اپنا کام سمجھ کر کیا اور اس کے لِیے مَیں اُن کا شکر گزار ہُوں۔ اِس کی طباعت کا سہرا سیّد نائب حُسین صاحب نقوی کے

سَر ہے۔ انہوں نے بھی اس کام میں ذاتی دلچسپی لی اور مَیں اس دلچسپی کے لیے اُن کا بھی شکر گزار ہوں۔ مَیں اپنے عزیز دوست اور دیرینہ کرم فرما عبدالرحمٰن چغتائی صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے میری گزارش پر بہت تھوڑے وقت میں اس کا نہایت ہی حسین گرد پوش تیار کیا۔ اس کی اشاعت کا بیڑہ "اُردو دُنیا" کراچی کے مالک سعادت یار خاں صاحب اور وحیدالدین احمد صاحب نے اُٹھایا اور اِس زمانے میں اتنی ضخیم ادبی کتاب کو چھاپنے کی ہمّت کی۔ اُن کے اس اقدام کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ میری اہلیہ بیگم فہمیدہ عبادت نے اِس کی کاپیاں اور پروف پڑھنے میں میری مدد کی۔ مَیں اُن کا بھی شکر گزار ہُوں۔

دَور جدید میں مِیر صاحب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیشِ نظر کُلیاتِ مِیر کے ایک اچھے نسخے کی ضرورت عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی۔ مَیں نے اپنی سی پوری کوشش کی ہے کہ یہ نسخہ اِس ضرورت کو پورا کرے۔ ؎

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

حافظؒ

عبادت بریلوی

یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور
۲/ جنوری ۱۹۵۸ء

۳۰
خطوطِ غالب

مغلوں کا دور آخر اگرچہ سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے انحطاط و زوال کا زمانہ ہے لیکن اس کے باوجود دلّی میں ایک دفعہ پھر اس زمانے میں علم و ادب کی محفلیں جم جاتی ہیں۔ میؔر و سوؔدا جس دلّی کو ناسازگار حالات کے باعث چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے اب اس نے ایک بار پھر غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، ظفرؔ اور شیفتہؔ کے نغموں سے اپنی محفلوں میں گرمی پیدا کر لی تھی۔ علم و ادب کے چرچے بھی نظر آتے تھے۔ بہت سے باکمالوں کا ان دنوں دلّی میں مجمع تھا۔ مولانا سیّد احمد بریلوی،

مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا فضل حق خیرآبادی، نواب صدرالدین خاں آزردہ، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور امام بخش صہبائی وغیرہ نے علم و عمل کی ایک فضا بھی پیدا کرلی تھی ـــــ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے میدانوں میں اس طرح کمال حاصل کیا کہ ہر ایک کی شخصیت میں اجتہادی شان نظر آتی ہے۔ غالب بھی ان میں سے ایک تھے اُنھوں نے نہ صرف اُردو شاعری کو نئے انداز سے آشنا کیا بلکہ اُردو نثر کو بھی ایک نیا اسلوب دیا۔ اس اعتبار سے وہ ہماری نظم و نثر دونوں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام اسداللہ بیگ خاں اور عرف میرزا نوشہ تھا۔ نجم الدولہ دبیرالملک، نظام جنگ خطابات تھے۔ اُنھوں نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ ایبک ترکوں کا مشہور خاندان تھا۔ اِس خاندان کا پیشہ سپہ گری تھا۔ اور وہ ہمیشہ سے یہی کام کرتے آئے تھے۔ غالبؔ نے خود ایک جگہ اس کا اظہار کیا ہے ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ غالب سپہ گری اختیار نہ کرسکے اور شاعری ان کے لئے ذریعہ عزت بن گئی۔ البتہ سپہ گری کی جو بُنیادی خصوصیات ہوتی ہیں وہ ہمیشہ غالب کے دم کے ساتھ رہیں۔

میرزا غالب کے دادا احمد شاہ کے زمانے میں ہندوستان آئے اور لاہور میں معین الملک کی ملازمت اختیار کی۔ لاہور سے وہ دلّی گئے اور

وہاں ذوالفقارالدولہ مرزا نجف کی سرکار میں انہیں ایک معقول ملازمت مل گئی ـــــ اور پہاسو کا پرگنہ بطور جاگیر کے عطا ہوا۔ انہیں کی اولاد میں میرزا غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولھا تھے۔
میرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کیدان کی بیٹی سے ہوئی ـــــ اور ان کے دو بیٹے ہوئے ـــــ ایک تو میرزا اسداللہ خاں غالب جنہوں نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں نام پیدا کیا اور دوسرے میرزا یوسف خاں جو جوانی میں پاگل ہو گئے، اور اسی عالم میں ایام غدر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مرزا غالب ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے انہیں پالا۔ نصراللہ بیگ خاں پہلے مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد میں صوبہ دار تھے، لیکن بعد میں انگریزوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ۱۸۰۶ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ غالب اس وقت نو برس کے تھے۔

چچا کے انتقال کے بعد میرزا غالب کی پرورش ننہیال میں ہوئی۔ ان کی ننہیال خاصی فارغ البال تھی۔ اس لئے بچپن اور عنفوانِ شباب میں غالب کو جو ماحول ملا وہ امیرانہ ماحول تھا۔ اس ماحول کی جو خصوصیات ہوتی ہیں غالب ان سے دوچار ہوئے۔ اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ رنگینیوں اور سرمستیوں میں گزرا۔ اس زمانے کے بارے میں غالب ایک جگہ خود لکھتے ہیں کہ میں "لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور اور عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔" یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ امارت اور ریاست کے ماحول میں اس صورتِ حال کو پیدا ہونا ہی

چاہیئے تھا۔ غالب کی یتیمی کو بھی اس میں دخل ہے بہر حال اس زمانے کے نقوش غالب کی شخصیت پر بڑے گہرے ہیں —— زندگی بھران کا اثر باقی رہا ہے —— بے فکری۔ شراب نوشی۔ یار باشی، تعیش پسندی اور خود پرستی کی خصوصیات ان کی شخصیت میں اسی ماحول نے پیدا کی ہیں۔

غالب کا بچپن اور عنفوانِ شباب اگرچہ لہو ولعب اور عیش وعشرت میں گزرا لیکن ان کی تعلیم کسی قدر باقاعدگی کے ساتھ ہوئی —— آگرے میں اُنہوں نے شیخ معظم سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ نظیر اکبرآبادی سے بھی انہیں تلمذ حاصل تھا۔ مُلّا عبدالصمد سے بھی اُنہوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ مُلّا عبدالصمد پارسی تھا اور اس کا اصلی نام ہرمزد تھا۔ لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد وہ عبدالصمد کے نام سے مشہور ہوا۔ ۱۸۱۰ء میں سیاحت کی غرض سے وہ آگرے آیا۔ غالب دو سال اس کے ساتھ رہے، اور انہوں نے اس سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اپنے خطوط میں غالب نے اس بات کی کئی جگہ وضاحت کی ہے — اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علمی استعداد خاصی تھی۔ وہ فارسی زبان سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے اور انہیں فارسی ادب کے مطالعے کا شوق تھا۔ عربی کی استعداد اگرچہ فارسی کے برابر نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کے بارے میں خاصی معلومات رکھتے تھے۔ فلسفہ، تصوف، طب، منطق، معانی وبیان سے بھی انہیں دلچسپی تھی۔

میرزا غالب کی شخصیت میں ان کی شادی شدہ زندگی کو بھی خاصا

دخل ہے۔ ان کی شادی ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ اس وقت غالب کی عمر تیرہ ۱۳ سال تھی۔ غالب نے اس نسبت کے بعد مستقل طور پر دلی میں سکونت اختیار کر لی۔

دلی میں غالب کو ادب و شعر کا ماحول ملا۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف خود اچھے شاعر تھے۔ تصوف کو بھی ان سے خاص نسبت تھی۔ غالب پر ان کا اثر ہوا۔ اس کے علاوہ دلی کے دوران قیام میں وہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے زیر اثر بھی آئے۔ فضل حق خیرآبادی اپنے زمانے کے بڑے مشہور عالم تھے اور شعر و سخن کا بھی نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ غالب پر ان کی شخصیت کا بھی اثر ہوا۔ ان سب اثرات نے مل کر غالب کو بے راہ روی سے روکا اور ان کی شخصیت میں ایک سنبھلا ہوا انداز پیدا کیا۔

دلی کے دوران قیام میں مالی مشکلات ہمیشہ غالب کے دم کے ساتھ رہیں۔ پنشن بند ہوئی اور اس سلسلے میں انہیں کلکتے کا سفر کرنا پڑا۔ ۱۸۲۶ء میں وہ دلی سے کلکتے روانہ ہوئے اور لکھنؤ میں سال بھر قیام کرنے کے بعد کانپور، بنارس، پٹنہ، اور مرشد آباد ہوتے ہوئے ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے۔ اور تین برس بعد ۱۸۲۹ء میں دلی واپس آئے۔ جہاں تک پنشن کا تعلق ہے کلکتہ کے سفر کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ کیونکہ انہیں اس سلسلے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس سفر سے ایک فائدہ غالب کو ضرور ہوا، وہ یہ کہ انہیں مختلف مقامات کے دیکھنے اور لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ اور اس سے ان کی شخصیت میں وسعت نظر کی خصوصیت

پیدا ہوئی۔

غالبؔ کی مالی حالت جب زیادہ خراب ہوئی تو انہوں نے ملازمت کرنے کی ٹھانی ۱۸۴۲ء میں دلی کالج میں فارسی کی مدرسی خالی ہوئی۔ غالبؔ بھی فینس میں سوار ہو کر اس سلسلے میں پرنسپل سے ملنے گئے، لیکن کوئی ان کی پذیرائی کو نہیں آیا، کیونکہ وہ ملازمت کے لئے آئے تھے۔ مسٹر ٹامسن جوان دنوں دلی کالج کے پرنسپل تھے۔ انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ چونکہ مرزا غالبؔ رسمی ملاقات کے لئے نہیں آتے بلکہ ملازمت کے لئے آتے ہیں اس لئے پذیرائی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میرزا غالبؔ نے اس پر یہ کہا کہ خیال تھا ملازمت سے عزّ و وقار میں اضافہ ہوگا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ جو وقار رہا سہا ہے اس میں بھی کمی آجائے گی ـــــ اس لئے اس ملازمت کو میرا دور ہی سے سلام ہے۔ اور یہ کہہ کر وہ واپس چلے آئے۔

مالی مشکلات کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اسی دوران میں میرزا غالبؔ پر ایک بلائے ناگہانی بھی آئی۔ یعنی وہ قمار بازی کے الزام میں گرفتار کر لئے گئے اور انہیں کچھ عرصے قید خانے میں رہنا پڑا۔ چھوٹ کر آئے تو مالی حالت اور بھی خراب ہو گئی کل باسٹھ روپے مہینے کی پنشن میں کیا ہو سکتا تھا ـــــ

جب یہ مالی مشکلات انتہا کو پہنچ گئیں تو میرزا کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ قلعے سے متعلق ہو جائیں۔ چنانچہ یہ تعلق انہوں نے پیدا کیا۔ لیکن ابتدا میں مستقل ملازمت اختیار نہیں کی۔ گاہے گاہے قصیدے پڑھ دیتے تھے، اور وظیفہ انہیں ملتا تھا۔

ذوقؔ کے انتقال کے بعد وہ بادشاہ کی غزلیں بھی بنانے لگے اور اس طرح باقاعدہ قلعہ سے منسلک ہو گئے —— غدر سے کچھ عرصہ قبل دربار رام پور سے بھی اُنہوں نے وابستگی پیدا کر لی تھی —— اور وہاں سے بھی انہیں وظیفہ ملتا رہا۔

غدر کا ہنگامہ غالبؔ کے سامنے ہوا۔ اس نے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا۔ غالب اس ہنگامے میں اپنے مکان کے اندر مقیّد رہے۔ اس زمانے میں ان کا قیام بلّی ماروں کے محلّے میں تھا۔ جب شہر میں ہنگامہ بڑھا تو شریف خانی حکیموں کی حفاظت کے لئے مہاراجہ پٹیالہ نے کچھ فوجی دستے بھجوا دیئے۔ جس کی وجہ سے یہ محلّہ بچ گیا۔ لیکن غالبؔ کو سب کے ساتھ بڑی تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔ ان کے بھائی مرزا یوسف کا انتقال بھی انہیں حالات میں ہوا —— غالبؔ نے غدر کے مفصّل حالات اپنی کتاب دستنبو میں لکھے ہیں۔

غدر کے بعد غالبؔ کی پنشن بھی بند کر دی گئی۔ کیونکہ ان پر بھی انگریزوں کو شبہ تھا۔ لیکن ۱۸۵۹ء میں پھر پنشن جاری کر دی گئی۔ غدر کے بعد دربار رام پور سے ان کے تعلّقات بہت بڑھ گئے اور وہاں ان کی آمد و رفت برابر جاری رہی۔ میرزا نے وہاں کچھ عرصہ قیام بھی کیا۔ وظیفہ بھی وہاں سے ملتا رہا۔

غالب کی وفات ۱۸۶۹ء میں ہوئی۔

یہ تمام حالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ غالبؔ کی زندگی ایک کشمکش کی کہانی ہے —— زندگی ان کا ساتھ نہ دے سکی لیکن اُنہوں نے ہمیشہ زندگی کا ساتھ دیا۔ وہ زندگی کے حالات سے

خوش نہیں تھے لیکن اُسے بسر کرنا جانتے تھے۔ چنانچہ اُن کی زندگی کے تمام حالات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اُنہوں نے زندگی اور اُس کے بدلتے ہوئے حالات سے بڑی حد تک مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان حالات کو سمجھا بھی ہے اور ان کو سمجھ کر برتا بھی ہے۔ وہ زندگی کے گہرے نباض تھے۔ اس کے ہر پہلو پر ان کی نظر گہرائی کے ساتھ پڑتی تھی۔ اور وہ اس میں نئے پہلو نکالتے بھی تھے۔ ان کے مزاج میں گہرائی کے ساتھ جدت پسندی بھی شامل تھی۔ حرکت اور عمل کی خصوصیات بھی ان کی شخصیت میں زیادہ نمایاں تھیں۔ کسی چیز کا نہ ہونا انہیں اُداس اور غمگین ضرور کر دیتا تھا لیکن وہ اس کے حاصل کرنے میں تھک کر نہیں بیٹھ جاتے تھے اس کو حاصل کرنے کی دُھن میں لگے رہتے تھے۔

غالبؔ نے ایک امیرانہ ماحول میں پرورش پائی۔ اس لئے اس امیرانہ ماحول کی تمام خصوصیات ان کی شخصیت میں بھی اپنی جھلک دکھاتی ہیں۔ اس امیرانہ ماحول کے افراد میں برتری کا احساس جس کی حدیں خود پرستی سے جا ملتی ہیں غالبؔ کے یہاں بھی نظر آتا ہے انحطاط و زوال کے زمانے میں یہ احساس اس طبقے کے افراد میں کچھ اور بھی بڑھ جاتا ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ افراد اس بڑھے ہوئے احساس کی نمائش زیادہ کرتے ہیں — غالبؔ کے یہاں بھی یہ صورت حال ملتی ہے۔ غالبؔ کو اپنی خاندانی برتری کا بڑا گہرا احساس ہے۔ وہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن یہ اظہار غالبؔ سے بہت کچھ کراتا بھی ہے۔ وہ اس کی نمائش ہی نہیں کرتے اس کو صیحح ثابت کرنے کے لئے عمل بھی کرتے ہیں۔ یہی اس ماحول میں پرورش

پانے کا ایک اچھا پہلو ہے۔ ورنہ اس ماحول سے انہیں بہت سی ایسی باتیں بھی ملی ہیں جن کو کسی حال میں بھی مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔

امیرانہ ماحول میں پرورش پانے کے باوجود یہ حرکت اور عمل کی خصوصیات جو غالبؔ کی شخصیت میں ملتی ہیں اور جن کا مظاہرہ برابر ان کی زندگی میں ہوتا رہا ہے اس میں اس عام فضا کو بھی دخل ہے جو ان دنوں ہندوستان اور خصوصاً دلی میں مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد نے پیدا کر دی تھی۔ غالبؔ اس تحریک کے ساتھ نہیں تھے وہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے ہم مشرب اور ہم نوا تھے۔ جن کو مولانا سید احمد بریلوی سے اختلاف تھا۔ لیکن غیر شعوری طور پر یہ علم و عمل کی فضا ان پر اثر انداز ہوئی۔ ان کی شخصیت میں حرکت اور عمل کی جو خصوصیت ملتی ہے وہ اسی اثر کا نتیجہ ہے۔

غالب کا زمانہ اگرچہ انحطاط و زوال کا زمانہ تھا لیکن یہ انحطاط و زوال میرؔ و سوداؔ کے زمانے کے انحطاط سے مختلف ہے۔ غالبؔ کے زمانے میں انحطاطی کیفیت تھی۔ لیکن انگریزوں کے حکمراں ہو جانے سے وہ افراتفری باقی نہیں رہی تھی۔ اب نسبتاً زیادہ تسلط تھا۔ اس صورت حال نے اس زمانے کی دلی میں ایک علمی فضا بھی پیدا کر دی تھی۔ بڑے بڑے علماء اور شعراء ان دنوں دلی میں جمع تھے۔ علماء میں شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ اسمٰعیلؒ، مولانا سید احمدؒ بریلوی اور مولانا فضل حق خیرآبادیؒ نے ایک علمی ماحول پیدا کر دیا تھا۔ مومنؔ۔ ذوقؔ اور شیفتہؔ وغیرہ نے شعر و ادب کی ایک فضا پیدا کی تھی۔ غالبؔ اس علمی ماحول سے بھی متاثر ہوئے۔ علمی مسائل سے ان کی دلچسپی بڑھی اور مختلف علمی و ادبی مسائل پر گہرائی کے ساتھ غور کرنے کا شعور ان کے یہاں عام ہوا۔ اُنھوں نے ان

معاملات میں اجتہادی شان پیدا کی — اجتہاد کے ساتھ جدّت و اُپج تو وجود میں آنی ہی چاہیئے۔ چنانچہ غالبؔ کے یہاں جدّت اور اُپج اسی صورتِ حال کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔

علم و عمل کے اس ماحول نے غالبؔ کی شخصیت میں شگفتگی اور جولانی کی خصوصیات کو بھی پیدا کیا ہے۔ اور اسی شگفتگی اور جولانی کا یہ اثر ہے کہ غالبؔ کے یہاں لطیفہ سنجی بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی بات بات میں لطیفہ ملتا ہے۔ غالبؔ فطرتاً بھی بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ ماحول کی اس کیفیت نے اس بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کو کچھ اور بھی نکھارا۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کی شخصیت میں اس شگفتگی اور جولانی کا اثر بہت رچا ہوا نظر آتا ہے۔

ادیب اور شاعر کی شخصیت اس کی تخلیقات میں پوری طرح بے نقاب ہوتی ہے۔ غالبؔ پر بھی یہ کلیّہ صادق آتا ہے۔ ان کی تصنیفات ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہیں ہر جگہ اس شخصیت کی بنیادی خصوصیت کے اثرات ان کی نظم و نثر دونوں میں جھلکتے ہیں نظم میں یہ اثر بالواسطہ طور پر نمایاں ہوتا ہے کیونکہ غالبؔ نے غزل کی صنف کو اپنایا، اور غزل کی صنف میں بات براہِ راست نہیں کی جا سکتی — اس لیے ان کی نثر میں ان کی شخصیت براہ راست اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اس شخصیت کے نقوش ان کی نثر میں اس قدر نمایاں ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے حالات، ان کے اخلاق اور عادات ان کے افکار و خیالات کو بڑی خوبی سے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

غالبؔ کی اُردو نثر اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہ نثر

ان خطوط پر مشتمل ہے جو غالب نے وقتاً فوقتاً اپنے مختلف احباب کو لکھے۔ غالب کی زندگی کا ہر پہلو اور ان کے مزاج کی ہر خصوصیت ان خطوط میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اعتبارات سے یہ خطوط ان کی شاعری کے مقابلے میں بھی بلند مرتبہ ہیں۔ مولانا حالی نے ٹھیک لکھا ہے کہ "مرزا کی عام شہرت جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ویسی نظم اُردو اور فارسی سے نہیں ہوئی" ــــ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان خطوط میں غالب چلتے پھرتے ہنستے بولتے، ملتے جُلتے، شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے، علمی و ادبی بحث و مباحثوں میں شریک ہوتے اور زمانے کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

مرزا کے خطوط کا پہلا مجموعہ، عودِ ہندی، کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے اُردو خطوط کو جمع کرنے کا خیال سب سے پہلے ممتاز علی خاں میرٹھی کو پیدا ہوا۔ چنانچہ اُنھوں نے چودھری عبدالغفور سرور اور خواجہ غلام غوث بے خبر کے توسط سے کچھ خطوط جمع کیے، ان کے ساتھ چند تقریظیں بھی جمع کیں اور ان سب کا مجموعہ عودِ ہندی کے نام سے مطبع مجتبائی میرٹھ سے ۱۸۶۸ء میں شائع کر دیا۔ میرزا کے خطوط کا دوسرا مجموعہ اُردوئے معلّٰی کے نام سے ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ یہ اُردوئے معلّٰی کا پہلا حصّہ تھا۔ ۱۸۹۹ء میں مولانا حالی کی فرمائش پر مطبع مجتبائی نے پہلا اور دوسرا حصّہ یکجا کر کے شائع کیا ــــ ایک اور مجموعہ "مکاتیب غالب" کے نام سے امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانہ رام پور نے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا ــــ "مکاتیب غالب" میں میرزا کے وہ خطوط ہیں جو

اُنہوں نے والیانِ رام پور کو لکھے تھے۔ مرزاؔ کے خطوط کا ایک اور مجموعہ
"نادراتِ غالب" کے نام سے ۱۹۴۹ء میں بھی شائع ہوا ہے۔ اس میں
آفاق حسین صاحب دہلوی نے وہ خطوط جمع کئے ہیں جو منشی نبی بخش
حقیر اکبرآبادی کے نام لکھے تھے۔ منشی مہیش پرشاد کو غالبؔ کے ان تمام
خطوط کو یکجا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ ان کی مرتب کی ہوئی پہلی جلد
"خطوط غالب" کے نام سے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے شائع ہوئی ——
دوسری جلد ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔

حالیؔ کے خیال کے مطابق "مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و
کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت
پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن "مہر نیم روز" کے لکھنے میں مصروف ہو گئے اس
وقت ان کو بہ ضرورت اُردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی
نثریں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر
نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے
تھے۔ پس جب ان کی ہمت "مہر نیم روز" کی ترتیب و انشاء میں مصروف
تھی ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی
اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں شاق معلوم ہوئی ہوگی۔ اس لئے قیاس
کہتا ہے کہ اُنہوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط
لکھنے شروع کئے ہیں" —— لیکن شیخ محمد اکرام اور غلام رسول مہر کو اس
سے اختلاف ہے۔ اکرام صاحب کا خیال ہے کہ "غالبؔ کے خطوط
کی نسبت عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بے تکلف
دوستانہ خطوط ہیں اور انہیں لکھتے وقت مرزا کو یہ سان گمان نہ تھا

کہ کبھی ان کی اشاعت کی نوبت آئے گی۔ نومبر ۱۸۵۸ء سے پہلے جو خطوط مرزا نے لکھے ان کے بارے میں تو یہ خیال صحیح ہے، لیکن بعد کے خطوط کے بارے میں نہیں" ـــــ اور اس سلسلے میں انہوں نے نہ غالب کے اس خط کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا تھا، اور جس میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ "رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے تو مجھ سے نہ پوچھو تم کو اختیار ہے" ــــ اکرام صاحب نے اس خط کی روشنی میں یہ خیال قائم کیا ہے کہ "اس کے بعد جو رقعات مرزا نے لکھے ہوں گے ان کی اشاعت کو وہ ضرور ممکن الوقوع سمجھتے ہوں گے اور اس وقت سے پہلے اور بعد کے خطوط میں جو فرق ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے کی نسبت بعد میں بہت زیادہ رقعات قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھے۔"

مولانا غلام رسول مہر نے مولانا حالی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے "مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں اس لئے کہ اول "مہر نیمروز" کوئی بڑی کتاب نہیں جس کی ترتیب میں غالب کے اوقات کا بیشتر حصہ صرف ہوتا ہوگا۔ یہ کتاب انہوں نے کم از کم دو برس میں مرتب کی۔ موجودہ مطبوعہ صورت میں اس کے کل ۱۱۸ صفحے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ باعتبار اوسط وہ سال بھر میں زیادہ سے زیادہ پچپن ۵۵ ساٹھ ۶۰ صفحات لکھتے رہے اور یہ غالب جیسے قادر الکلام اور مشاق نثر نگار کے لئے کوئی بہت بڑا کام نہیں تھا جس کی تکمیل کے سلسلے میں انہیں فارسی خط و کتابت ترک کرنی پڑی ہو ــــ ہمارا خیال یہی ہے

کہ غالبؔ ۱۸۵۰ء سے قبل اُردو خط وکتابت کر چکے تھے لیکن چونکہ اس زمانے میں اُردو نثر کو اہل علم چنداں وقیع نہیں سمجھتے تھے اس لئے وہ خط محفوظ نہ رہ سکے۔ بعد میں جیسے جیسے اُردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا تداول کم ہوتا گیا۔ غالبؔ فارسی کے بجائے زیادہ تر اُردو میں خط لکھتے رہے۔

ان میں سے کون سا خیال صحیح ہے ہمیں اس سے بحث نہیں ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ غالبؔ نے اُردو میں خطوط لکھے اور ۱۸۵۰ء کے بعد تو مستقل طور پر اُردو میں خط وکتابت کی۔ لیکن ان خطوط کو چھپوانے کا خیال ان کے دل میں کبھی بھی پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ جن احباب نے اس کی کوشش کی، غالبؔ نے انہیں منع کیا۔ منشی شیو نراین پہلے شخص ہیں جنہوں نے غالبؔ کے خطوط شائع کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ان سے اجازت مانگی۔ اس کے جواب میں غالبؔ نے لکھا:-

"اُردو خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں، یہ زائد بات ہے کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ اس کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔"

لیکن بعض دوسرے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعد میں وہ ان کو چھپوانے کے لئے تیار ہو گئے تھے اور جب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ خطوط شائع ہوں گے تو وہ خطوط دل لگا کر اور قلم سنبھال کر لکھنے لگے

تھے۔ لیکن اس خیال نے ان کے خطوط کو ان خصوصیات سے محروم
رکھا جو نجی خطوط میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی بے تکلفی اور بے باکی — وجہ
اس کی یہ ہے کہ غالب کی شخصیت میں دو رنگی نہیں تھی۔ اُن کی شخصیت
میں ایک خلوص تھا۔ ایک صداقت تھی، ایک بے تکلفی تھی، ایک بے باکی
تھی، ایک برجستگی تھی۔ چنانچہ یہ خصوصیات ان خطوں میں بھی پائی جاتی ہیں
جو نجی ضرور تھے لیکن جن کو لکھتے وقت یہ خیال ضرور ان کے پیش نظر تھا
کہ وہ چھپیں گے ضرور!

غالب کے خطوط کی یہ بنیادی اور سب سے اہم خصوصیت ہے کہ
ان میں بے پناہ خلوص ہے۔ وہ ایک ایسے انسان کے قلم سے نکلے ہوئے
معلوم ہوتے ہیں جو کسی بات کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ جس میں مبالغہ آرائی
نام کو نہیں تھی۔ تکلف جسے چھو بھی نہیں گیا تھا۔ تصنع سے جس کو کوئی دلچسپی
نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطوط میں ایک مانوس فضا ملتی ہے، ایک
دلکش ماحول نظر آتا ہے۔ اور غالب نے جو باتیں کی ہیں وہ اپنی باتیں معلوم
ہوتی ہیں، جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اپنے خیالات نظر آتے ہیں، ماحول
کی جو تصویریں بھی پیش کی ہیں وہ اپنی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ وجہ اس
کی یہ ہے کہ غالب جن لوگوں کو خطوط لکھتے ہیں ان سے اس درجہ قریب ہو
جاتے ہیں اور ان کی شخصیت میں اس درجہ گھُل مل جاتے ہیں کہ ان کی یہ
بات دلوں کو بہت بھاتی ہے۔ اور ہر شخص اُن سے اتنا قریب ہو جاتا ہے
کہ اس آئینے میں اسے اپنی صورت نظر آنے لگتی ہے۔

خطوطِ غالب کے موضوعات متنوع اور مختلف ہیں۔ ان خطوں میں
ان کی شخصیت سے متعلق عام باتیں موجود ہیں۔ پیدائش کے وقت سے

لے کر وفات تک کے واقعات کا ان خطوں سے اندازہ ہوتا ہے —
بچپن کے حالات، تعلیم و تربیت، شادی اور اس کے اثرات، احباب اور متعلقین، مالی اُلجھنیں اور پریشانیاں، اور پھر اس سلسلے میں دور دراز علاقوں کا سفر، پنشن اور اس کی ساری تفصیل، دلی کی حالت، قید کا واقعہ غدر اور اُس کے مفصل حالات، ان تمام موضوعات پر ان خطوط سے روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ان موضوعات کی صرف تفصیل ہی ان خطوط میں درج نہیں ہے، بلکہ غالبؔ نے ان سب پر روشنی ڈالتے ہوتے، اپنے ذہنی رجحان اور افتادِ طبع کو بھی سامنے رکھا ہے، ہر چیز کے بارے میں وہ ایک صائب رائے رکھتے ہیں اور اسی کا اظہار ان خطوط سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کی شخصیت اور ان کا نظریۂ حیات ان خطوط میں پوری طرح بے نقاب ہے۔

غالبؔ کے ان خطوط سے اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشی ماحول کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ اُنیسویں صدی کی دلّی میں لوگ کس طرح رہتے تھے۔ ان کے آداب اور طور طریقے کیا تھے — ان کی اُلجھنیں اور پریشانیاں کس قسم کی تھیں۔ پرانی روایات کے ساتھ ساتھ نئی روایات کا اثر معاشرت پر کس طرح چھانے لگا تھا۔ لوگ زندگی کے بارے میں کیا سوچتے تھے؟ ماحول نے انہیں کس طرح اسیر کر لیا تھا۔ مختلف طبقوں اور فرقوں کے تعلّقات آپس میں کیسے تھے؟ ان کا نظریۂ حیات کیا تھا؟ معاشی بدحالی اخلاق کو کس طرح بگاڑ رہی تھی؟ — بے عملی نے کس طرح معاشرت میں گھر کر لیا تھا؟ اُمراء اور شرفاء کی زندگی کس طرح وبالِ جان بن گئی تھی؟ لوگ کس طرح ایک دوسرے سے ملتے تھے۔

درباروں کی حالت کیا تھی ؟ درباروں نے زندگی کو کس طرح بگاڑا تھا؟ مغلوں کی کمزوری اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے کیا صورت پیدا کی تھی ؟ سیاسی تبدیلیوں کے اثرات لوگ کس طرح قبول کر رہے تھے ؟ سیاسی تبدیلیوں نے معاشی، معاشرتی زندگی کو کن راہوں پر لاکر کھڑا کر دیا تھا۔ کون سے حالات اور افکار و خیالات زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھال رہے تھے ــــ کون سی علمی، ادبی اور سیاسی تحریکیں تھیں جن کا اثر زندگی اور معاشرت پر ہو رہا تھا؟ ــــ کون سے ادبی مباحث تھے جن کا ان دنوں چرچا تھا؟ ــــ شاعرانہ ماحول کی کیا خصوصیات تھیں؟ کون کون سے شاعر تھے جن کا اثر ماحول قبول کر رہا تھا؟ ــــ یہ اور اسی طرح کے سینکڑوں مسائل ہیں۔ جن کی صحیح تصویر غالبؔ کے یہ خطوط پیش کرتے ہیں۔

یہ خطوط جس انداز سے لکھے گئے ہیں اس کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ان خطوط سے اردو میں خطوط نویسی کا ایک نیا معیار قائم ہوتا ہے اور ایک اچھوتے طرز کی ابتدا ہوتی ہے۔ مولانا حالیؔ نے لکھا ہے کہ "مرزا کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے پوری پوری تقلید ہو سکی"۔ اور یہ خیال بالکل صحیح ہے کیونکہ جس وقت مرزا غالبؔ نے یہ خطوط لکھے ہیں اس وقت عام طور پر فارسی میں خطوط لکھے جاتے تھے۔ اُردو بولنے کا رواج عام تھا لیکن لکھنے کی زبان فارسی تھی۔ فارسی میں جو خطوط لکھے جاتے تھے وہ "رقعات بیدل" اور انشائے مادھو رام کو معیار بنا کر لکھے جاتے تھے۔ اس لئے فارسی

خطوط نویسی میں کسی نمایاں تبدیلی کی توقع کم تھی۔ مرزا نے نہ صرف فارسی میں خطوط لکھنے کی روایت کو توڑا بلکہ اُردو خطوط کو نئے اور نرالے انداز سے بھی آشنا کیا۔ غالبؔ کی بڑائی کا راز اسی میں مضمر ہے۔

غالبؔ کے زمانے میں خطوط نویسی کا جو معیار تھا اس میں القاب و آداب کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ خط کا ایک خاصا حصہ القاب و آداب پر مشتمل ہوتا تھا۔ لیکن یہ بڑے بڑے اور لمبے لمبے القاب وآداب بے مقصد معلوم ہوتے تھے۔ اور ان کو استعمال کرنے کے لئے خاصی عبارت آرائی کرنی پڑتی تھی۔ غالبؔ نے اس کو چھوڑا۔ اور ایک زیادہ فطری اور زیادہ حقیقی طریقہ اختیار کیا۔ "اُنہوں نے القاب و آداب کا پُرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جس کو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں سب اُڑا دیں ــــ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخوردار، کبھی بھائی، کبھی مہاراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔" (حالی) ــــ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُنہوں نے اپنے خطوط سے یکسر القاب وآداب کو خارج کر دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ وہ القاب کہیں کہیں استعمال ضرور کرتے ہیں لیکن جہاں ان کو استعمال کئے بغیر چارہ نہیں ہوتا ــــ غالبؔ نے ان القاب وآداب کو مرتبے کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔ بلکہ یہی خیال القاب وآداب کے استعمال کرنے کا باعث بنا ہے۔ جب وہ اپنے سے بڑے کو خط لکھتے ہیں تو القاب و آداب ضرور استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً نوابانِ

رام پور کے خطوط کو اُنھوں نے ہمیشہ "حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت" سے شروع کیا ہے اور نواب میر غلام بابا خاں کو "جمیل المناقب عمیم الاحسان" لکھ کر مخاطب کیا ہے۔ لیکن ویسے ان کا عام انداز یہی ہے کہ بغیر کسی القاب کے خط شروع کر دیتے ہیں۔ بہرحال اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ نے روایتی القاب و آداب کے استعمال سے احتراز کیا اور جو القاب و آداب استعمال کئے ان میں کچھ جدّتیں پیدا کیں۔ اور اسی وجہ سے ان کے القاب و آداب بذاتِ خود بھی دلچسپ بن گئے۔

القاب و آداب کو زیادہ اہمیت نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ غالبؔ خط لکھنے کو بات کرنے کا مترادف سمجھتے تھے۔ چنانچہ کئی جگہ اُنھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "پیر و مرشد یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا"۔۔۔۔ ایک اور جگہ اسی خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ "مرزا صاحب، میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھالی ہے۔ اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمھارے جی میں آئی ہے"۔۔۔۔ اور یہ بات کرنے کا انداز انھوں نے اپنے خطوط میں شعوری طور پر پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط میں بات کرنے کی ایک فضا ملتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ ان کے سامنے موجود ہے۔ اور غالبؔ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ باتیں کرنے کی فضا غالبؔ کے خطوط کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

جدّت اور اُپج گویا غالبؔ کی گُھٹّی میں پڑی تھی۔ اس کا اظہار ان کے خطوط میں جگہ جگہ ہوتا ہے۔ خصوصاً خطوط کو شروع کرنے میں اُنہوں نے بڑی جدتوں سے کام لیا ہے۔ ہر خط کے آغاز میں ایک ڈرامائی کیفیت نظر آتی ہے بلکہ جہاں القاب و آداب نہیں ہوتا اور وہ براہِ راست مکتوب الیہ کو مخاطب نہیں کرتے وہاں یہ خصوصیت کچھ اور بھی نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً یوسف مرزا کے نام ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔

"— کوئی ہے ذرا یوسف مرزا کو بُلائیو۔ لو صاحب وہ آئے — میاں میں نے خط تم کو بھیجا ہے مگر تمہارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے"— اسی طرح میر مہدی کو ایک خط میں یہ لکھنا چاہتے ہیں کہ میرن صاحب آئے اور اُن سے یہ باتیں ہوئیں۔ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔ اے میرن صاحب اُلسلام علیکم۔ حضرت آداب، کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں — مگر میں انہیں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں — نہیں میرن صاحب اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے کیا خفا ہوں گے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں، کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اُٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو

نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں ——— میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھئے گا۔ میاں بیٹھو ہوش کی خبر لو ——— تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ۔ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہ لکھا۔ لاحول ولا قوۃ ———" اور اس تمہید کے بعد جو باتیں لکھنی چاہتے ہیں لکھتے ہیں ——— اس خط کی اصل خوبی اس کے ڈرامائی انداز میں ہے۔ اس ڈرامائی انداز سے غالبؔ کے خطوط بھرے پڑے ہیں۔

غالبؔ کے مزاج میں بڑی شوخی اور شگفتگی تھی۔ بات میں بات پیدا کرنا وہ خوب جانتے تھے۔ بلکہ بغیر شوخی و شگفتگی کے وہ بات کر ہی نہیں سکتے تھے۔ مولانا حالیؔ نے لکھا ہے کہ "مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوتے ہیں اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ" ——— یہ شوخی اور شگفتگی کی خصوصیات ان کے خطوط میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں ——— لیکن ہر جگہ اس شوخی اور شگفتگی سے کوئی نہ کوئی نکتہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس طرح ان کی یہ شوخی اور شگفتگی ان کے خطوط میں لطیفہ سنجی کی خصوصیت پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن غالبؔ کی بڑائی اس میں ہے کہ اس لطیفہ سنجی میں بھی وہ حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہیں، اور ان خطوط میں لطیفہ سنجی سے جو مزاح پیدا ہوتا ہے اس میں بڑی لطافت ہوتی ہے ——— ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے ان کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے، اس طرح مخاطب کرتے ہیں :-

"کیوں بھئی اگر ہم کول آئے بھی تو تم کو کیوں کر دیکھیں گے۔
کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں"۔

ایک اور دوست کو خط میں رمضان کے بارے میں لکھا ہے:۔

"دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں، مگر روزے
کو بہلاتا رہتا ہوں، کبھی پانی پی لیا، کبھی حقّہ پی لیا۔ کبھی کوئی
ٹکڑا روٹی کا کھالیا، یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔
میں تو روزہ بہلاتا ہوں۔ اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو
روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے
اور روزہ بہلانا اور بات ہے"۔

میرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک تعزیتی خط اس انداز میں لکھتے ہیں:۔

"مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر
ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب
میں ایک مرشدِ کامل نے نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور
نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ مزے اُڑاؤ۔ مگر
یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس
نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ
نہ مرے کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا
شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ، اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش
ہو تو چنّا جان نہ سہی منّا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصوّر
کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا
اور ایک حور ملی اقامت جاودانی ہے۔ اور اسی ایک نیک بخت

کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصوّر سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ
مُنہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ وہی
زمرّدیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بددور وہی
ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔"

ایک اور خط میں اسی موضوع پر یوں قلم اُٹھاتے ہیں:۔

"عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرح نصیب ہو۔ لیلیٰ اس
کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری۔ بلکہ
تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ
تمہارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچّے بھی غضب ہوتے ہیں
جس پر مرتے ہیں اُس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں
عمر بھر میں ایک کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں
کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی۔ کہ زخم دوست کھائے ہوئے
ہیں، مغفرت کرے۔"

ان خطوط میں جو شوخی اور شگفتگی ہے وہ غالبؔ کا حصّہ ہے۔ یہ شوخی
اور شگفتگی مزاح کو پیدا کرتی ہے اور لطافت اس مزاح کی سب سے اہم
خصوصیت ہے۔ غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ نازک سے نازک موقع پر بھی
وہ مزاح کو پیدا کرتے ہیں اور اس لطافت کو برقرار رکھتے ہیں۔ تعزیت
کے ایسے نازک موضوع پر خط لکھتے ہوئے بھی اُنھوں نے اپنے اس مخصوص
رنگ کو قائم کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خطوط دلوں میں گھر کر لیتے
ہیں اور ان کا لطیف انداز ظرافت روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے۔

غالبؔ کے فکر و خیال کی پرواز بہت اونچی تھی۔ وادیٔ خیال کو

کو مستانہ وار طے کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن وہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھتے بھی تھے ــ اس کی گہرائیوں تک پہنچنا اور اصل حقیقت کو معلوم کرنا ان کی شخصیت کا جزو تھا۔ لیکن یہ مشاہدۂ حق کی گفتگو وہ بادہ و ساغر کے بغیر نہیں کر سکتے تھے ــــ یہ خصوصیت ان کے خطوط میں بھی نمایاں ہے۔ ان میں جگہ جگہ تخیل کی بڑی بلند پروازی نظر آتی ہے۔ اور تخیل کی اس بلند پروازی کے سہارے وہ زندگی کے بنیادی حقائق تک پہنچتے ہیں۔ لیکن ان حقائق کو بادہ و ساغر کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ ایسے مقامات پر ان کے خطوط میں بڑا شاعرانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس خط کو دیکھئے جس میں اُنھوں نے اپنی زندگی کے مد و جزر کو پیش کیا ہے اور خانہ داری کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے ــــ لکھتے ہیں :۔

"سنو! عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل ــ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ہے جو خود فرماتا ہے لمن الملک الیوم، اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے للہ الواحد القہار ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی۔ اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا۔ اور مجھے اس زنداں

میں ڈال دیا۔ فکر نظم ونثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں
جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔
پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا
دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا
دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار،
مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو
گئی۔ بے حیا ہوں۔ سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑا
معہ دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مرادآباد ہوتا ہوا رام پور
پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا۔ اب عہد کیا
کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔
حکم رہائی دیکھئے کہ کب صادر ہو؟ — ایک ضعیف سا احتمال
ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی
کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی
بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔"

یا پھر یہ خط جس میں اپنے آخری وقت کی حالت کا بیان اور زندگی
کی بے ثباتی کا تذکرہ ہے :۔

"ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف،
کاہلی، سستی، گرانجانی، رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ
ہے۔ بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں۔
خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپُرسیدہ بخش دیا تو خیر اگر بازپرس
ہوئی تو سفر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔"

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالبؔ کے تخیّل کی پرواز بہت بُلند تھی۔ اور اس تخیل کی پرواز کے ذریعے ان کے اندازِ بیان میں تمثیل نگاری کی خصوصیت بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ جیسے کہ ان خطوط میں موجود ہے اور یہ کہ وہ زندگی کا شعور رکھتے تھے۔ زندگی کے بُنیادی حقائق پر ان کی نظر رہتی تھی۔ لیکن وہ اس کو بڑے دلکش انداز میں پیش کرتے تھے۔ غالبؔ کی زندگی کی تصویر اس بیان سے جس طرح اُبھر کر سامنے آتی ہے، اس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ غالبؔ کو اس میں کمال حاصل تھا۔ ان کے خطوط میں اکثر جگہ اس خصوصیت کے اثرات جھلکتے ہیں۔ اور اسی کا اثر ہے کہ ان کے خطوط میں ایک رفعت ملتی ہے۔ ایک گہرائی کا احساس ہوتا ہے، اور ایک رچی ہوئی کیفیت نظر آتی ہے۔

اُردو نثر میں غالبؔ کے خطوط کو ایک ممتاز مرتبہ حاصل ہے۔ ان خطوط نے اُردو نثر کو ایک نیا انداز دیا ہے، اس کو نئی راہیں دکھائی ہیں، اور ان راہوں پر اس کو گامزن بھی کیا ہے۔

غالبؔ کے زمانے میں اُردو نثر کا رواج عام نہیں تھا۔ عام طور پر لکھنے کی زبان فارسی تھی۔ اس لئے فارسی نثر کے اثرات ہر طرف چھائے ہوتے تھے۔ اور جب کبھی کوئی اُردو نثر لکھتا بھی تھا تو وہ فارسی نثر کی نقل ہوتی تھی۔ مسجع، مقفیٰ اور پر تکلف عبارت کا رواج عام تھا۔ اگرچہ فورٹ ولیم کالج نے اُردو میں سادہ اور آسان نثر کے اچھے نمونے پیش کیے تھے۔ لیکن ابھی تک فارسی کا اثر اتنا گہرا تھا کہ آسان اور سادہ نثر اپنے اثرات کو عام نہیں کر سکی تھی۔ فورٹ ولیم کالج نے میر امّن، شیر علی افسوسؔ اور حیدر بخش

حیدری وغیرہ کو پیدا کیا لیکن ان کے اثرات ابھی تک محدود تھے۔ بلکہ بعضوں نے تو اس آسان نثر کا مضحکہ اُڑانا شروع کر دیا تھا۔ اور ان پر پھبتیاں کسنا شروع کر دی تھیں ـــــ رجب علی بیگ سرور کی 'فسانۂ عجائب' اس کی ایک مثال ہے ـــ غرض یہ کہ غالبؔ سے قبل اُردو نثر میں، قدامت اور جدت، تصنع اور سادگی، تکلف اور سلاست میں ایک کشمکش کا سلسلہ جاری تھا۔ غالبؔ نے اپنے خطوط لکھ کر سادگی اور سلاست کی تحریک کو سہارا دیا۔ اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اُردو نثر میں اس تحریک نے ترقی کی، اور یہ رجحان عام ہوا۔

خطوطِ غالبؔ اُردو نثر کے بہت اچھے نمونے پیش کرتے ہیں۔ اس نثر میں سادگی اور سلاست کے باوجود وہ پُرکاری بھی ہے جو غالبؔ کی شخصیت کا حصہ تھی۔ غالبؔ فارسی زبان کا بڑا رچا ہوا مذاق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کے اثرات ان کی اُردو نثر میں بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن فارسی کے یہ اثرات غالبؔ کی اُردو نثر کو بوجھل نہیں بناتے بلکہ ایک رنگین فضا کو پیدا کرتے ہیں ـــــ اس فضا میں ایک بانکپن اور طرحداری ملتی ہے۔ غالبؔ فارسی کی نئی نئی ترکیبیں تراشتے ہیں، لیکن یہ ترکیبیں نامانوس نہیں ہوتیں۔ ان ترکیبوں میں ایک شان وشکوہ ہوتا ہے۔ غالبؔ کی نثر میں یہ شان وشکوہ، یہ بانکپن اور طرحداری موجود ہے، لیکن یہ شعوری نہیں ہے۔ فطری معلوم ہوتا ہے۔ ان کی نثر میں کہیں کہیں عبارت آرائی کی خصوصیت ملتی ضرور ہے، کیونکہ وہ کہیں کہیں مرصع نثر بھی لکھتے ہیں، لیکن یہ خصوصیت موضوع سے ہم آہنگی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ جہاں وہ شدت کے ساتھ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں، وہاں اس صورت

حال کا وجود ہوتا ہے۔ لیکن غالبؔ کے خطوط میں ایسے مواقع کم ہی آتے ہیں۔ البتہ ان کی تخیل کی بلند پروازی ان کی نثر میں ایک شاعرانہ انداز کو ضرور پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ ان کی نثر میں ایسے حصّے ملتے ہیں جن میں چونکا دینے والی کیفیت ہوتی ہے جو اپنی رنگینی اور رعنائی کے باعث دلوں میں اُتر جاتے ہیں۔ غالبؔ کی اُردو نثر میں ایسا اسلوب نہیں ملتا۔ جو محنت سے پیدا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک فطری روانی نظر آتی ہے —— ایک فطری بہاؤ کا احساس ہوتا ہے، لیکن اس روانی اور بہاؤ میں پُرشور کیفیت نہیں پائی جاتی۔ بلکہ ایک نغمگی اور غنائی کیفیت کا احساس ہوتا ہے —— اور یہ سب چیزیں مل کر غالبؔ کی اُردو نثر کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کرتی ہیں۔ یہ اسلوب ان کا اپنا ہے —— ان سے قبل تو خیر اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ لیکن ان کے بعد بھی کوئی اسے اپنا نہ سکا —— یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی جگہ منفرد ہے۔

اُردو ادب میں غالبؔ کے خطوط کی ایک نمایاں حیثیت ہے۔ ان سے غالبؔ کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ماحول کے تمام پہلوؤں کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ جس میں غالبؔ نے پرورش پائی اور جس نے ان کے اسلوب کو پیدا کیا۔ یہ اسلوب بھی ان خطوں میں اپنے شباب پر ہے۔

عبادت بریلوی

اورینٹل کالج، لاہور
١٦/ اکتوبر ١٩٦٠ء

(۳۱)

ضرب الامثال

از

نواب فیض علی خاں

بلوم ہارٹ نے برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات اردو میں ممتاز الامثال کے قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کے بیان سے پوری طرح اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس نے تو صرف اتنی معلومات فراہم کی ہے کہ یہ کتاب ضرب الامثال کے بارے میں ہے۔ اس کے مؤلف جھجر کے نواب اسد الدولہ ممتاز الملک، ہزبر جنگ نواب فیض علی خاں تھے۔ ان کا تخلص ممتاز تھا۔ یہ جھجر کے آخری نواب عبدالرحمٰن خاں کے دادا[1] تھے جن کو انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں بغاوت کا الزام لگا کر پھانسی

[1] بلوم ہارٹ سے سہو ہوا ہے۔ نواب عبدالرحمٰن کے دادا فیض محمد خاں تھے اور نواب فیض علی خاں فیض محمد خاں کے بیٹے تھے۔

پر لٹکا دیا تھا۔ یہ کتاب نواب فیض علی خاں نے تین جلدوں میں لکھی تھی۔ تیسری جلد نامکمل رہ گئی۔ ان تینوں جلدوں میں کل ۷۹ ۲۹ کہانیاں ہیں۔ ہر جلد میں کہانیوں کی فہرست بھی بنا کر شامل کی گئی ہے اور جن صفحات پر کہانیاں درج کی گئی ہیں ان کے نمبر بھی دے دیئے گئے ہیں۔ میوزیم[1] کی فہرست میں پہلی جلد کا نمبر ۳۲۲۴، دوسری کا ۳۲۲۵ اور تیسری کا ۳۲۲۶ ہے۔ پہلی جلد میں ۵۳۹، دوسری میں ۵۵۰ اور تیسری میں ۲۸۶ اوراق ہیں۔ سائز بڑا ہے اور یہ تینوں جلدیں اعلیٰ درجے کے کاغذ پر خط نستعلیق میں نہایت خوش خط لکھی ہوئی ہیں۔

میں نے اپنے لندن کے دوران قیام میں بلوم ہارٹ کے اس بیان کو پڑھ کر اس قلمی نسخے کو نکلوایا اور بغور دیکھا تو مجھے یہ کتاب ضرب الامثال کی ایک اچھی خاصی انسائیکلو پیڈیا معلوم ہوئی۔ اس میں مجھے اردو نثر اور نظم کے بھی بہت اچھے نمونے نظر آئے اور اس میں ضرب الامثال کے بارے میں جو کہانیاں لکھی گئی ہیں، ان میں بھی دلچسپی کا بڑا سامان دکھائی دیا۔ چنانچہ اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو دنیا کو اس دلچسپ اور اہم کتاب سے روشناس کرایا جائے۔ اس سے قبل اردو کی اس اہم کتاب کو نہ تو کسی نے دیکھا اور نہ غور سے اس کا مطالعہ کر کے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے، مجھے یہ خیال آیا کہ اس کتاب کا مطالعہ اردو زبان اور ادب سے لگاؤ رکھنے

---

[1] بلوم ہارٹ : فہرست مخطوطات (اردو) برٹش میوزیم
لندن : ص ۴۲

والوں کے لئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اسی خیال سے میں نے محض
تعارُف کے طور پر، فی الحال اس ضخیم کتاب کا صرف ایک انتخاب شائع
کرنا مناسب سمجھا۔ مکمل کتاب انشاء اللہ آئندہ شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی
کی طرف سے شائع کی جائے گی۔

یہ عجیب و غریب کتاب کسی زمانے میں جھجھر کی ریاست کے نوابوں
کے کتب خانے میں تھی۔ جب ۱۸۵۷ء میں دلی اور اس کے آس پاس
کے علاقوں میں غدر پڑا تو جھجھر کی ریاست بھی اس ہنگامے سے متاثر ہوئی۔
اگرچہ اس ریاست کو انگریزوں نے قائم کیا تھا اور وہ ہمیشہ اس کے نوابوں
کی پشت پناہی کرتے رہے تھے، لیکن جب آزادی کی جنگ شروع ہوئی
تو اس ریاست کے آخری نواب عبدالرحمٰن خاں بھی اس میں شامل ہو گئے
اور انہوں نے بھی انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا، لیکن ناکام رہے۔
جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو انہوں نے ریاست ضبط کر لی اور نواب
عبدالرحمٰن خاں کو دلی میں پھانسی پر چڑھا دیا۔ اس ہنگامے میں جھجھر کی
ریاست تباہ ہو گئی، اور اس کے ساتھ ہی جھجھر کے نوابوں کا کتب خانہ
بھی تباہ و برباد ہو گیا۔ بعض بچی کھچی کتابیں دلّی لائی گئیں۔ ان میں یہ عجیب
و غریب کتاب بھی تھی۔ اس کتاب کی تینوں جلدیں کسی باذوق شخص
کے ہاتھ لگیں، اور وہ ان کو اپنے ساتھ لندن لے گیا۔ برٹش میوزیم
نے اس کتاب کی تینوں جلدیں جوزف کنگ سے ۹ جنوری ۱۸۸۶ء کو
خریدیں۔ چنانچہ اس پر یہ عبارت ملتی ہے۔ BT. OF JOSEPH
KING 9 JAN. 1886 اس وقت سے اس اہم کتاب کے یہ قلمی
نسخے برٹش میوزیم کے شعبۂ مشرقی کے کتب خانے کی زینت ہیں۔

اس قلمی کتاب کی پہلی جلد کے پہلے صفحے پر غالباً اسی شخص نے اپنے ہاتھ سے انگریزی میں یہ تفصیل لکھی ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:-

Mumtaz ul Amsal —— Urdu —— by Nawab Faiz Ali Khan, the grandfather of the Nawab who was hanged at Delhi in 1857.

This is the collection of stories from which the various Urdu proverbs have been derived.——The Urdu is excellent. This copy was probably the property of the Jujjar Nawab Abdul Rahman Khan, who, as above stated, was hanged; his Library having been brought into Delhi after its capture.

The third Volume is incomplete.— —— (1)

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، اور اس عبارت سے بھی ظاہر ہے، یہ کتاب جھجر کے نواب فیض علی خاں کی تالیف ہے۔ یہ نواب فیض علی خاں جھجر کے دوسرے نواب فیض محمد خاں کے بیٹے اور پہلے نواب نجابت علی خاں کے پوتے تھے۔ یہ اپنے والد نواب فیض محمد خاں کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے۔ یہ وہی فیض محمد خاں تھے جنہوں نے نواب شمس الدین خاں کے ساتھ مل کر مسٹر فریزر کو قتل کروایا تھا[2] نواب فیض علی خاں کی زندگی کا زیادہ زمانہ ملکی اور مالی معاملات و مسائل کو سلجھانے میں صرف ہوا[3]

---

[1] اس عبارت کے کچھ الفاظ مٹ گئے ہیں اس لئے پڑھے نہیں جاتے۔
[2] کیفیت احوال جھجر وغیرہ: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔
[3] ایضاً

لیکن انہیں علمی معاملات سے بھی دلچسپی تھی، اور وہ فرصت کے اوقات میں تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے[1] اُن کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ کتاب ممتاز الامثال ہے۔ نواب فیض علی خاں کا انتقال ۱۸۴۵ء میں ہوا[2] ان کے انتقال کے بعد نواب عبدالرحمٰن خاں تخت نشین ہوئے، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ان کے بیٹے تھے۔ یہی عبدالرحمٰن خاں تھے جو ۵۷ء کی جنگ آزادی میں مجاہدوں کے ساتھ مل گئے تھے اور انگریزوں نے دلّی میں انہیں پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔

نواب فیض علی خاں کے آباؤ اجداد کی تفصیل برٹش میوزیم کے ایک اور قلمی نسخے کیفیت احوال جھجر میں ملتی ہے۔ اس میں لکھنے والے نے مختلف واقعات کو اخبار اور روزنامچے کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اور اس طرح اس ریاست اور اس کے نوابوں کی تصویر بڑی چابک دستی سے کھینچی ہے۔ اس تصویر میں نواب فیض علی خاں اور ان کے بزرگوں کی شخصیتوں کے خدوخال نمایاں نظر آتے ہیں۔

اس کا مؤلف لکھتا ہے :-

”نواب نجابت علی خاں قدیم سے رسالہ دار اور متابعت میں حاکمانِ وقت کی رہتے آئے ہیں۔ شروع عملداری سرکار دولت مدار کے نواب نجابت علی خاں اہائی سرکار کی رفاقت میں حاضر ہوئے، اور تعاقب مہاراجہ جسونت راؤ ہولکر میں، ہمراہ

---

[1] کیفیت احوال جھجر وغیرہ : قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔

[2] ایضاً

رکاب نواب مستطاب لاٹ لیک صاحب بہادر کے بیاس ندی تک گئے تھے۔ بعد معاودت اور سلوک مہاراجہ موصوف کے لاٹ صاحب ممدوح نے پرگنات سابق کہ میان دوآب میں تھے، لے لئے۔ اور آٹھ لاکھ روپے کی جمع کے پرگنات نواب نجابت علی کی جایئداد میں عنایت فرمائے۔

بعد چندے نواب نجابت علی خاں مرگئے، اور ان کے بیٹے نواب فیض محمد خاں گدی نشین ہوئے۔ نواب نجابت علی خاں کے عہد میں نواب فیض طلب خاں نائب اور مختار کل دخل اور خرچ نواب نجابت علی خاں کے تھے۔ بعد وفات نواب نجابت علی خاں کے درمیان نواب فیض محمد خاں اور نواب فیض طلب خاں کے قضایہ ہوا۔ اور نواب فیض محمد خاں نے پرگنات جھجھر اور بادلی نواب فیض طلب خاں سے چھین لئے۔ نواب فیض طلب خاں سرکار میں نالشی ہوئے۔ اور سند مہری نواب نجابت علی خاں کی پیش کی۔ نواب فیض محمد خاں نے جواب دیا کہ میرے باپ کی مہر آپ کے پاس رہتی تھی، اپنے ہاتھ سے مہر کرلی ہوگی۔ میں یہ دو پرگنے نہیں دوں گا۔ چنانچہ عذر نواب فیض محمد خاں کا منظور ہوا۔

بعد چندے نواب فیض محمد خاں اور نواب شمس الدین خاں نے شریک ہو کر مسٹر فریزر صاحب بہادر کو قتل کروایا۔ چنانچہ شمس الدین خان نے پھانسی پائی[1] اور نواب فیض محمد خاں اس سزا سے محفوظ

---

[1] اس واقعے کی تفصیل مالک رام نے "ذکر غالب" میں اور مولانا غلام رسول مہر نے "غالب" میں بڑے سلیقے سے پیش کی ہے۔

رہے۔ الااسی خوف اور دبدبے سے مرگئے۔ اور اپنی حیات میں
ایک وصیت نامہ اپنے خاندان کے واسطے لکھ گئے کہ ہماری
ریاست میں کوئی کنیزک زادہ مالک ریاست کا نہ ہو۔ اور
وہ وصیت نامہ دس برس اب سے پہلے نواب حسن علی خاں،
فیض محمد خاں کے بھائی نے نواب مستطاب لارڈ اکلنڈ صاحب
کے حضور میں بہ مقام شملہ پیش کیا تھا۔ اس غرض سے کہ بموجب
اس وصیت نامے کے سرکار کو ہماری ریاست میں دست
اندازی کا اختیار حاصل ہے۔

بعد نواب فیض محمد خاں کے نواب فیض علی خاں، ان کا بیٹا
مالک ریاست کا ہوا۔ فیض علی خاں کا کوئی بیٹا اصل قبیلوں
سے، یعنی پٹھانی کے پیٹ سے پیدا نہ ہوا۔ الا ایک لونڈی
نواب فیض محمد خاں کی جواہرا نام بہت خوبصورت تھی۔ اور اس
کا نکاح محمدا نامی غلام سے کر دیا تھا۔ شاید کہ فیض علی خاں بھی
عمر طفولیت میں اس لونڈی پر متوجہ ہو گئے ہوں۔ اس لونڈی
کے ایک بیٹا عبدالرحمٰن خاں پیدا ہوا۔ اگرچہ وہ بیٹا محمدا غلام
کا تھا۔ الا چونکہ فیض علی خاں بھی اس پر متوجہ تھے، اس کو پرورش
کیا۔ اور مہربانی کرتے رہے کہ اب وہ اٹھارہ برس کا ہوا اور دو
بیٹے اور کنیزکوں سے پیدا ہوئے کہ ایک چھ برس اور دوسرا
پانچ برس کا ہے۔

عرصہ زیادہ ایک مہینے کا ہوا کہ نواب فیض علی خاں قضائے

الٰہی سے مر گئے[1] اور سوائے جایئداد چالیس لاکھ روپے کی نقد اور اشرفی بدیں تفصیل قلعہ کانوند میں جھجھر میں اور تقریباً ایک سو من ظروف چاندی کے، اور بہت سا اسباب ریاست کا متروکہ چھوڑا۔ بعد فوت نواب فیض علی خاں کے حسن علی خاں، نجابت علی خاں کے بیٹے اور علی محمد خاں نواب فیض محمد خاں کے چھوٹے بیٹے نے، عرائض اپنے اپنے دعوے کے صاحب اجنٹ کے حضور میں گزرانے کہ بموجب وصیت نامہ نواب فیض محمد خاں کے عبدالرحمٰن خاں کو اور دونوں کینزک زادوں فیض علی خاں کو ریاست نہیں پہنچتی، ہم کو پہنچتی ہے۔ اور بعضے اشخاص بہ طمع زر کے عبدالرحمان خاں سے متفق ہو کر اس کو مالک ریاست کرنا چاہتے ہیں"[2]

نواب فیض علی خاں کے حالات کی یہ تفصیل دلچسپ اور مفید ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے ایک اہم شخص تھے اور اس زمانے میں انہیں اپنی ریاست کے حکمرانوں میں ایک اہم مرتبہ حاصل تھا۔ مؤلف کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ ان کا زیادہ وقت انتظامی کاموں میں صرف ہوا۔

---

[1] کیفیت احوال جھجھر کے مؤلف نے یہ روداد اکتوبر ۱۸۳۵ء میں لکھی ہے۔ اس لئے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ نواب فیض علی خاں کا انتقال ستمبر ۱۸۳۵ء میں ہوا۔

[2] کیفیت احوال جھجھر وغیرہ: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ورق ۳۷

لیکن بعض دوسرے ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ قابل اور تعلیم یافتہ تھے اور ان کا وقت علمی کاموں میں بھی صرف ہوتا تھا۔ وہ علمی مباحث میں حصہ لیتے تھے۔ ان کے آس پاس بیٹھنے والے ان سے بعض علمی معاملات میں مشورہ کرتے تھے، اور انہیں تصنیف و تالیف کے کام کی طرف توجہ دلاتے تھے۔

فیض علی خاں نے ممتاز الامثال کی تالیف کے بارے میں جو کچھ دیباچے میں لکھا ہے، اس سے ان کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

بُعد اس کے سبب اجتماع ضرب الامثال کا یہ ہے کہ اکثر حاضرین اور ہم نشین متفق ہو کر تذکرہ ضرب الامثال کا درمیان لاتے تھے۔ لیکن اصل مطلب اور وجہ وضع کسی مثل کی نہ پاتے تھے۔ التجا طرف اس نیاز مند درگاہ بے نیاز اسد الدولہ ممتاز الملک نواب فیض علی خاں بہادر ہزبر جنگ المتخلص بہ ممتاز کے لاتے، کہ ظاہر کرنا امثال کا کر کے، یہ خلش اور خلجان ہماری خاطر سے اٹھایئے۔ اپنے تئیں بہ سبب کم فرصتی کے، کہ امورات مالی و ملکی اور مطالب ضروری درپیش رہتے۔ اتفاق بیان مطالب اصل ضرب الامثال کا نہ ہوتا۔ لیکن ارادہ مسلّم رہتا تھا کہ اس طرح کی طرز مرصع تحریر کیجیے کہ عام پسند اور خاص پسند ہو۔ ایک روز کمر واسطے لکھنے ضرب الامثال اور مطلب اصلی امثال کی چست باندھی۔ اور یہ وضع لکھنے کی بیچ خاطر کے گزری کہ عبارت اس کی مطلب نویسی دنیاوی میں بکار آوے۔

اور معنی اس کے سے حقیقت عقبیٰ کی ظاہر ہووے، جیسے کہ
کہا ہے۔

ظرافت میں ہے معرفت کا اثر
حقیقت کو سمجھے جو رکھے نظر

اسی واسطے اس طرز میں لکھتا ہوں تو پڑھنے والوں کو فائدہ
تمام اور سننے والوں کو نفع تام حاصل ہو۔ نام اس کتاب کا
ممتاز الامثال رکھا۔"[1]

ممتاز الامثال نواب فیض علی خاں کی واحد تالیف ہے جس کا اب تک علم ہو سکا ہے لیکن یہ ایک تالیف اپنے موضوع کی وسعت، مواد کی اہمیت، اسلوب کی ندرت اور انداز بیان کی جدت کے باعث کئی تالیفات پر بھاری نظر آتی ہے۔ اس کا موضوع، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ضرب الامثال ہے۔ فیض علی خاں نے بہت بڑی تعداد میں ضرب الامثال کو جمع کیا ہے اور اس موضوع پر نہایت دلچسپ کہانیاں لکھ کر ان کے معانی و مطالب کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی اس کتاب میں علمی رنگ بھی موجود ہے اور تخلیقی آہنگ بھی اور ان دونوں پہلوؤں کی دھوپ چھاؤں نے اس کتاب میں بڑی دلکشی اور جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ ان کا اسلوب کہیں کہیں مُرصّع ضرور ہے اور اس میں کہیں کہیں فرسودگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ پہلو اس زمانے کے مزاج اور معیاروں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کتاب میں جگہ جگہ بڑی جدت اور اپج کا احساس ہوتا ہے، اور اس اعتبار سے اسلوب کے بعض اچھے نمونے بھی نظر آتے

[1] نواب فیض علی خاں: ممتاز الامثال قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ورق ۳

ہیں۔ بعض کہانیاں نظم میں بھی لکھی گئی ہیں اور ان نظموں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا اچھا خاصا شاعر تھا اور جدید انداز کی نظمیں لکھنے کی صلاحیت بھی اس کے اندر بدرجہ اتم موجود تھی۔

اس سے قبل ممتاز الامثال کے دیباچے سے جو اقتباس پیش کیا گیا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب احباب اور ہم نشینوں کی فرمائش پر لکھی گئی۔ لیکن یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ مؤلف کو اس موضوع سے گہری دلچسپی تھی۔ احباب کی فرمائش کی وجہ بھی یہی ہوئی۔ چنانچہ مؤلف نے اس کو بڑے شوق اور ولولے کے ساتھ لکھنا شروع کیا، اور کئی ہزار صفحے لکھے۔ اس کو تین جلدوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ پھر بھی یہ کتاب نامکمل رہی۔

ممتاز الامثال کے سنہ تالیف کا صحیح علم نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ ستمبر ۱۸۴۵ء سے بہت پہلے لکھی گئی۔ کیفیت احوال جھجھر کے مؤلف نے اکتوبر ۱۸۴۵ء میں یہ لکھا ہے کہ نواب فیض علی خاں کو مرے ہوئے ایک مہینہ ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ کتاب مرنے سے بہت پہلے لکھی ہوگی۔

ممتاز الامثال کی تینوں جلدوں میں پہلی جلد غالباً سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس میں کہانیاں بھی دوسری دو جلدوں میں لکھی جانے والی کہانیوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ طویل اور پہلودار ہیں، اور انداز بیان میں بھی زیادہ شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ دوسری جلد تک پہنچتے پہنچتے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ مؤلف میں تھکن کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں اور اس کو کہانیوں کی طوالت کا احساس بھی ہونے لگا ہے۔ اس لئے اس نے بقیہ کہانیوں کو شعوری طور پر مختصر کرنے کی کوشش کی ہے۔

دوسری اور تیسری جلد کے شروع میں لکھتے ہیں :-
بُعد حمد خدائے عز و جل جلالہٗ ،۔منظومہ

خداوند بخشندہ و دستگیر
کریم خطا بخش و پوزش پذیر
سر بادشاہان گردن فراز
بہ درگاہ او بر زمین نیاز

اور نعت سید المرسلین خاتم النبییّن شفیع المذنبین احمد مجتبےٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلّم اجمعین ؎

شفیعٌ مطاعٌ نبیٌ کریم قسیمٌ جسیمٌ نسیمٌ وسیم

یہ نیاز مند درگاہ بے نیاز اسد الدولہ ممتاز الملک نواب فیض علی خاں ہزبر جنگ متخلص بہ ممتاز اس طرح بیان کرتا ہے کہ نسخہ ممتاز الامثال کثیر الحجم ضرب الامثال بہ عبارت عالیہ نقش پذیر قرطاس کے ہوئے۔ حجم اور ضخامت کتاب کی زیادہ انداز سے ظہور میں آئی اور ضرب الامثال بے شمار اور گفتگوئے محاورات ہر دیار اور کلمات نیک و بد بسیار باقی رہے اگر طولانی عبارت مطلوب ہوتی چند جلد مرتب ہوتے۔ اس واسطے تکلف، تصنع تسجّع سے گزر کر داستان ضرب الامثال اور اقوال بہ عبارت مختصر لکھے۔ اور جلد دوسری تیار ہوئی۔ ابیات ؎

جلد اول جلد ثانی ختم از فضل خدا
گشت روز عید رمضان ز ابتدا تا انتہا
ختم بالخیر و ظفر کن یا الہ العالمیں
کارہائے جملہ مارا بہر ختم المرسلیں، [۱]

---

[۱] نواب فیض علی خاں : ممتاز الامثال : قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ورق ۲۴۷

"حمد وافر ایزد متعال اور ثنا سے بے منتہا قادر ذوالجلال کو کہ جس
نے کاف کن سے ہژدہ ہزار عالم کو کتم عدم سے پیدا کیا۔ بیت ؎

کروں ایسے قادر کی حمد و ثنا   کہ جس نے ہے عالم کو پیدا کیا

اور نعت متکاثر افضل البشر ختم الرسل کی کہ جس کے واسطے اللہ جل شانہٗ
نے زمین آسمان کو پیدا کیا ہے۔ فرد ؎

محمد عربی کابروئے ہر دو سراست
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سراو

بعد اس کے اسدالدولہ ممتاز الملک نواب فیض علی خاں بہادر ہزبر
جنگ المتخلص بہ ممتاز اس طرح کہتا ہے کہ دو جلد ممتاز الامثال کے مرتب
اور مدون ہوئے۔ ایک سو تیس جز دونوں جلد کے تیار ہوئے۔ اور اکثر
ضرب الامثال باقی رہے۔ لکھنا ضرب الامثال باقی ماندہ کا ضرور ہوا۔
اس واسطے جلد تیسری شروع کی۔ جو ضرب الامثال سوائے لکھے ہوئے
ان دو جلد کے اصغا ہوئے تیسری جلد میں لکھے جاویں۔ باللہ التوفیق
وھو المستعان قطعہ۔

بماند سالہا ایں نظم و ترتیب
زما ہر ذرہ خاک افتد بجائے
غرض نقشے است کز ما یاد ماند
کہ ہستی را نمی بینم بقائے"۔ [1]

لیکن ان مختصر کہانیوں سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے
والے کی گرفت ضرب الامثال اور محاورات پر بڑی مضبوط ہے اور وہ

---

[1] نواب فیض علی خاں: ممتاز الامثال: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔

ان کی مزاج دانی کا پورا شعور رکھتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان کہانیوں میں جگہ جگہ پند ونصائح کے جو پہلو اُبھرتے ہیں، ان سے کہانیوں کی وحدت کو ٹھیس لگتی ہے اور کسی حد تک دلچسپی کا پہلو مجروح ہوجاتا ہے۔ لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے لکھنے والے کی شخصیت پر مذہب اور اخلاق کا رنگ بہت گہرا ہے اور وہ کسی حال میں بھی ان سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔ اس صورت حال نے فنّی اعتبار سے ان کہانیوں کو کمزور کیا ہے لیکن ساتھ ہی ایک علمی انداز پیدا کر کے ان کو وزنی بھی ضرور بنا دیا ہے۔ اور یہ بھی اس کتاب کی ایک خوبی ہے۔

غرض نواب فیض علی خاں ممتاز کی یہ کتاب ممتاز الامثال ان کا ایک اہم علمی اور تخلیقی کارنامہ ہے۔ ضرب الامثال کے موضوع پر اب تک جو کتابیں اُردو میں لکھی گئی ہیں ان میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ اردو نثر کی ایک اہم کتاب ہے اور زبان اور ادب کی روایت میں ایک مقام حاصل کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

عبادت بریلوی

یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

۱۶ راگست ۱۹۶۷ء

(۳۲)

دیوانِ مُبتلا

از

عُبیداللہ خان مُبتلا

برٹش میوزیم کے شُعبۂ مشرقی کے کتب خانے میں "دیوانِ مبتلا" کا ایک اہم قلمی نسخہ ہے۔ یہ نسخہ عہد" احمد شاہ ابدالی" میں کسی کاتب نے تیار کیا۔ اس پر کاتب کا نام اور کتابت کی صحیح تاریخ درج نہیں ہے۔ آخر میں صرف یہ عبارت ملتی ہے۔

" تمت تمام شد دیوان ریختہ عبیداللہ خان تخلص مبتلا
پسر میر جملہ بتاریخ نوزدھم شہر شعبان المعظم درعہد احمد شاہ

ابدالی صورت اتمام یافت"[1]

اس عبارت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ شعبان کے مہینے میں اس وقت لکھا گیا جب احمد شاہ ابدالی دلی میں موجود تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے جب ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۷ء میں دلی پر حملہ کیا تو تقریباً پانچ مہینے اس شہر میں مقیم رہا۔ غلام حسین خاں نے سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ ابدالی ۷ جمادی الاولی ۱۱۷۰ھ کو دہلی کے قلعے پر قابض ہوا اور شوال تک[2] دہلی یا نواح دہلی میں موجود رہا اور عماد الملک وزیر اس کے لئے مال غنیمت اور خزانہ فراہم کرتا رہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابدالی نے رجب، شعبان، رمضان اور شوال کے مہینے دہلی میں گذارے۔ اور اس زمانے کو اس کاتب نے عہد احمد شاہ ابدالی تصوّر کیا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دیوانِ مبتلا کا یہ نسخہ ۱۹ شعبان ۱۱۷۰ھ = ۹ مئی ۱۷۵۷ء کو مکمل ہوا۔ اس کے ساتھ دیوان یکرو بھی شامل ہے جس کو اسی کاتب نے اسی سال اسی مہینے میں ۱۲۔ شعبان کو مکمل کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاتب یہ دونوں دیوان ایک ہی وقت میں لکھتا رہا۔ دیوان یکرو ۱۲۔ شعبان کو اور دیوان مبتلا ۱۹۔ شعبان کو تکمیل سے ہم کنار ہوا۔

دہلی کے دوران قیام میں یہ نسخہ کسی طرح کرنل ہملٹن کو ملا۔ وہ اس

---

[1] دیوان مبتلا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔

[2] غلام حسین خاں: سیر المتاخرین جلد سوم صفحہ ۸۹۸-۸۹۹

کو اپنے ساتھ لندن لے گئے اور آخر دم تک ان کے پاس رہا تاآنکہ ان کی وفات کے بعد برٹش میوزیم نے اس نسخے کو ان کی بیوہ سے اپریل ۱۸۶۸ء میں خریدا۔ چنانچہ اسی پر انگریزی کی یہ عبارت ملتی ہے۔

PURCHASED OF THE WIDOW OF COL. GEO. W. HAMILTON APRIL 1868.

اور اب یہ نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے کی زینت ہے۔

بلوم ہارٹ نے برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات (اُردو) میں یہ قیاس ظاہر کیا ہے کہ یہ نسخہ ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۷ء اور ۱۱۷۴ھ مطابق ۱۷۶۱ء کے درمیان لکھا گیا۔ کیونکہ ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی نے دلی پر قبضہ کیا اور آخری بار پانی پت کی لڑائی کے بعد ۱۱۷۴ھ مطابق ۱۷۶۱ء میں اپنے ملک کو واپس گیا[1] لیکن سیر المتاخرین کے بیان کی روشنی میں یہ قیاس صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اس دیوان کے مؤلف عبید اللہ خاں مبتلا ہیں۔ اُردو اور فارسی شاعروں کے کسی تذکرے میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہے کہ یہ مبتلا اپنے زمانے میں شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور نہیں ہوئے۔ اس زمانے کے شاعرانہ ماحول اور معروف شاعرانہ شخصیتوں سے ان کا کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے زمانے کے اُمراء و رؤسا میں سے تھے، اور اس اعتبار سے ان کا زیادہ وقت انتظامی کاموں میں گذرتا ہوگا۔ وہ محض تفنن طبع کے طور پر شاعری کرتے ہوں گے اور

---

[1] بلوم ہارٹ: فہرست مخطوطات برٹش میوزیم لندن صفحہ ۲۶

اُنھوں نے اُردو شاعری کو اپنا خاص میدان نہیں بنایا ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

عبیداللہ خان مبتلا کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون تھے؟ ان کے زمانے میں ان کی حیثیت کیا تھی؟ اور اُنھوں نے علم و ادب کی دُنیا میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ لے دے کے صرف یہ ایک دیوان ہے جو ان کی یادگار ہے۔ اس میں بھی کوئی ایسا مواد موجود نہیں جس سے ان کے حالات پر روشنی پڑے۔ دیوان کے آخر میں جو عبارت کاتب نے لکھی ہے اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام عبیداللہ خاں تھا مبتلا تخلص کرتے تھے۔ میر جملہ کے بیٹے تھے۔ اُنھوں نے اپنا دیوان جمع کیا تھا۔ اس دیوان کا یہ نسخہ احمد شاہ ابدالی کے قیام دہلی کے زمانے میں تیار کیا گیا۔

بلوم ہارٹ نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ صرف انہیں باتوں کو دھرا دیا ہے۔ لیکن جو قیاس آرائی کی ہے اس سے کچھ خلط مبحث سا ہو گیا ہے۔ بیل کے حوالے سے اس نے یہ لکھ دیا ہے کہ غالباً مبتلا کے والد میر جملہ بہار کے صوبے دار تھے۔ ان کا انتقال عہد محمد شاہ کے تیرہویں سال جلوس یعنی ۱۱۴۴ھ مطابق ۱۷۳۱ء میں ہوا۔

بیل نے اپنی ڈکشنری [۲] میں میر جملہ نام کی تین شخصیتوں کا ذکر

---

[۱] بلوم ہارٹ : فہرست مخطوطات (اُردو) برٹش میوزیم لندن، صفحہ ۲۶

[۲] BIALS: BIOGRAPHICAL DICTIONARY, INDIA EDITION PAGE 251:

کیا ہے۔ میر جملہ اوّل جس کی وفات ۱۶۳۷ء میں ہوئی۔ میر جملہ دوم جس کا سال وفات ۱۶۶۳ء ہے۔ میر جملہ سوم جس کا انتقال ۱۷۳۱ء میں ہوا۔ آخر الذکر کا خطاب عبداللہ تھا۔ فرخ سیر سے اس کو قربت حاصل تھی اور وہ اس کا خاص منظورِ نظر تھا۔ کچھ عرصے تک وہ بہار کا صوبہ دار رہا۔ محمد شاہ نے اس کو تخت نشین ہونے کے پہلے ہی سال میں صدر الصدور مقرر کیا تھا۔ اس کی حکومت کے تیرھویں سال (۱۷۳۱ء) میں اس نے وفات پائی [1]

ولیم اِروِن نے اپنی کتاب THE LATER MUGHALS میں آخر الذکر میر جملہ کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔ اور یہ معلومات بہم پہنچائی ہے کہ اس میر جملہ کا نام عبیداللہ اور اس کے والد کا نام میر محمدؔ وفا تھا۔ وہ ۱۰۸۱ھ مطابق ۷۱-۱۶۷۰ء میں سمرقند کے مقام پر پیدا ہوا اور ابتدائی عمر میں ہندوستان آیا۔ یہ عالمگیر کا زمانہ تھا، پہلے اسے جہانگیر نگر ڈھاکہ کا قاضی مقرر کیا گیا۔ پھر اسی عہدے پر وہ عظیم آباد میں بھی فائز رہا۔ شہزادہ عظیم الشان سے اس کے تعلقات تھے۔ فرخ سیر سے بھی اس کو بڑی قربت حاصل تھی۔ اس کے خطابات شریعت اللہ خاں، عباد اللہ خاں، مظفر جنگ، معتمد الملک، معظم خاں، خان خاناں وغیرہ تھے۔ اروِن نے اخوان الخواقین کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ شخص بہت بڑا عالم تھا لیکن معاملہ فہمی اس کے مزاج میں نہیں تھی اور وہ چیزوں کو دیکھ کر سمجھ نہیں سکتا تھا۔ [2]

---

[1] بلوم ہارٹ: فہرست مخطوطات (اُردو) برٹش میوزیم لندن، صفحہ ۲۵۱
[2] ایضاً: صفحہ ۲۵۱

عبید اللہ خاں مبتلا اسی میر جملہ کے بیٹے ہو سکتے ہیں۔ لیکن کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ اروِن نے اس میر جملہ کا نام عبید اللہ خان بھی لکھا ہے۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ممکن خود ہے اس شخص نے اُردو شاعری سے دلچسپی لی ہو۔ عالم تو وہ تھا ہی۔ ادب و شعر سے بھی اس کو لگاؤ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس وقت ولی کے اثر سے اُردو شاعری کا جو ماحول دلی میں پیدا ہوا تھا، اس کی وجہ سے، ہو سکتا ہے کہ اس کو بھی اس انداز کی شاعری کا شوق پیدا ہوا ہو۔ اور اس نے یہ دیوان مرتب کیا ہو۔ دیوان کے کاتب سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جو کچھ اس نے دیوان کے آخر میں لکھا ہے، اس سے اس کی باقاعدگی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ لاپرواہی ٹپکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی غلط فہمی کی بناء پر اس نے اس دیوان کے مصنّف کو پسر میر جملہ لکھا دیا ہو۔ اس میں جملہ کے بیٹوں کا ذکر کسی اور کتاب میں نہیں ملتا۔ بہر حال یہ سب باتیں تحقیق طلب ہیں۔

دیوانِ مبتلا میں جو غزلیں ملتی ہیں ان میں ولی کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ اور اس کی جھلکیاں نہ صرف زبان اور اندازِ بیان بلکہ بحروں کے انتخاب اور تجربے کے مجموعی رنگ و آہنگ میں بھی دِکھائی دیتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مبتلا نے ولی کی شاعری کو سامنے رکھ کر شاعری کی ہے اور پوری طرح اس کا تتبع کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ولی کے اثرات کو جس طرح شمالی ہندوستان کے اَدبی ماحول نے قبول کر کے اپنی ایک مخصوص فضا قائم کی ہے، یہ دیوان اس کی صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔

اور اس اعتبار سے اس کا مطالعہ، اُردو شاعری سے دلبستگی رکھنے والوں کے لئے مُفید اور دلچسپ ہے۔
اسی خیال سے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔

عبادت بریلوی

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۲۵۔ اگست ۱۹۶۷ء

نقلیاتِ ہندی

اورینٹل کالج کے نامور اُستاد اور اُردو کے مشہور و معروف نقّاد اور محقق پروفیسر سیّد وقار عظیم صاحب نے ڈاکٹر گل کرسٹ کی نقلیات کا پہلا حصّہ مئی ۱۹۶۶ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیا تھا۔ یہ مختصر سی کتاب تھی۔ نقلیات کا متن صفحہ ۱۴ سے شروع ہو کر صفحہ ۷۵ پر ختم ہو جاتا تھا۔ اِبتدائی چالیس صفحات میں وقار صاحب مرحوم نے ۳۱ صفحات کا مقدمہ لکھا تھا اور ۹ صفحات میں گلکرسٹ کے اختتامیہ کا اُردو ترجمہ کر کے اس کتاب میں شامل کر دیا تھا۔

نقلیات کے اس پہلے حصّے کا ایک نسخہ انہیں پنجاب یونیورسٹی

لائبریری میں ملا تھا لیکن چونکہ اس نسخے میں سرورق موجود نہیں تھا۔اس لئے اس کا اندازہ لگانا ان کے لئے مشکل ہوگیا کہ نقلیات کے اس نسخے کی اہمیت کیا ہے۔ اس کا مرتب کون ہے؟ اور یہ کب اور کہاں شائع ہوا؟ انہوں نے اس کا ذکر اپنے مقدمے میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں $\frac{22\times28}{8}$ تقطیع پر، چھپی ہوئی فورٹ ولیم کالج کی ایک کتاب ہے جس کا نام نقلیات ہے۔ لائبریری کے کارڈوں میں اسے گلکرسٹ کی تالیف بتایا گیا ہے۔لیکن چونکہ کتاب پر کوئی سرورق نہیں۔اس لئے پہلی نظر میں یہ فیصلہ دشوار ہے کہ کتاب واقعی کس کی مرتب کی ہوئی ہے۔اس کے متعلق کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے کے لئے ان معلومات پر قطعی نظر ڈالنی ضروری ہے جو گلکرسٹ کی تصانیف "نقلیات" نام کی کتاب کے متعلق مہیا کی گئی ہیں"[1]

چنانچہ انہوں نے عتیق صدیقی کی کتاب "گلکرسٹ اور اس کا عہد" کے حوالے سے نقلیات کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نقلیات کی پہلی جلد ۶۸ صفحات پر مشتمل تھی اور اس کو میر بہادر علی حسینی نے مرتّب کیا تھا۔کالج کے کچھ اور منشی بھی اس کام میں ان کے شریک تھے۔ آگے چل کر وقار صاحب نے لکھا ہے۔

"نقلوں کا زیرِ نظر مجموعۂ نقلیات، نقلوں کا وہی مجموعہ

---

[1] پروفیسر وقار عظیم۔مقدمہ نقلیات ص ۳۔

ہے جس کے متعلق عتیق صاحب نے لکھا ہے کہ یہ کتاب رومن، ناگری اور فارسی رسم الخط میں چھاپی گئی تھی۔ اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کتاب چھپی کس سنہ میں؟ گلکرسٹ کے یہ الفاظ کہ کتاب کی دوسری جلد فروری ۱۸۰۳ء میں چھپے گی، ظاہر کرتے ہیں کہ نقلیات کی پہلی جلد فروری ۱۸۰۳ء سے پہلے چھپی۔ لیکن گلکرسٹ نے اپنے اختتامیہ کے آخیر میں اپنی تحریر کی کوئی تاریخ درج نہیں کی، اور کتاب کے سرورق کی غیر موجودگی میں اس کی طباعت و اشاعت کا صحیح مہینہ اور سال متعین نہیں کیا جا سکتا۔ عتیق صاحب لکھتے ہیں کہ اس کی دو جلدیں تھیں۔ پہلی جلد ۱۸۰۲ء میں اور دوسری جلد ۱۸۰۶ء میں شائع ہوئی"۔[1]

لندن کے پانچ سالہ دورانِ قیام میں مجھے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی نقلیات کی دونوں جلدیں مل گئیں۔ یہ دونوں جلدیں یک جا ہیں، اور دونوں پر سرورق بھی موجود ہیں۔ پہلی جلد میں ۶۴ صفحات ہیں۔ چار صفحات غلط نامے کے ہیں۔ گویا یہ جلد کل ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۸۰ نقلیں ہیں۔ اس پہلی جلد کے شروع میں ورق ہے جس پر مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے۔

THE

HINDEE STORY TELLER,

OR

ENTERTAINING EXPOSITOR

OF THE

Roman, Persian, and Nagree Characters,

SIMPLE AND COMPOUND

IN THEIR APPLICATION TO THE

HINDOOSTANEE LANGUAGE
AS A WRITTEN AND LITERARY VEHICLE.
BY THE AUTHOR OF THE
HINDOOSTANEE DICTIONARY, GRAMMAR, &c. &c.

CALCUTTA:
PRINTED AT THE HINDOOSTANEE PRESS
1802.

اس کے بعد فہرست مضامین ہے اور پھر ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا انگریزی میں لکھا ہوا پیش لفظ اس کے بعد نقلیات ہیں پہلے ناگری رسم الخط میں۔ اس کے بعد رومن رسم الخط میں اور آخر میں اُردو نقلیات ہیں جس کو مولف نے فارسی رسم الخط کہا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ رومن اور ناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی نقلیات کا آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے۔

دوسری جلد کی سرورق کی عبارت وہی ہے جو پہلی جلد کی ہے اور جس کو اوپر پیش کیا گیا ہے اس میں صرف لکھ کر اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ یہ دوسری جلد ہے اور آخر میں جہاں ہندوستانی پریس کلکتہ درج ہے، اس کے نیچے ۱۸۰۲ چھاپا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے اس کتاب کو ولیم آگسٹس بروک کے نام معنون کیا ہے، جو اس زمانے میں کلکتہ میں سینئر جج کے عہدے پر فائز تھے۔ اس دوسری جلد میں بھی پہلے ڈاکٹر گلکرسٹ کا انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد نقلیات ہندی ناگری رسم الخط میں ہیں۔ دوسری جلد میں جو نقلیات ہیں ان کو رومن رسم الخط میں نہیں

چھاپا گیا۔آخر میں اُردو رسم الخط میں نقلیات ہیں جس کے سرورق پر صرف یہ عبارت ملتی ہے۔

نقلیات ہندی

دوسری جلد

ہندوستانی چھاپہ خانے میں سن ۱۸۰۳ عیسوی

مطابق ۱۲۱۸، ہجری کے چھاپی گئی[1]

دوسری جلد کی نقلیات کو ناگری اور اُردو رسم الخط کے ساتھ رومن رسم الخط میں نہ چھاپنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ جلد ان غیر ملکی طالب علموں کے لیے تھی جو اُردو اور ناگری رسم الخط سے اچھی طرح آشنا ہو چکے تھے اور اب انہیں رومن رسم الخط کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔اس دوسری جلد میں ۳۰۰ نقلیات ہیں اور اردو رسم الخط میں شائع ہونے والی یہ نقلیات ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہیں۔اس کے بعد ۲۶ صفحات میں پہلی اور دوسری جلد میں شائع ہونے والی نقلیات کی فہرست ہے۔آخر میں ۸ صفحات کا غلط نامہ ہے۔

نقلیات کا یہ نُسخہ ایسے ٹائپ میں چھاپا گیا جو خط نستعلیق سے بہت قریب ہے۔اور اس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس ٹائپ کو بنانے میں خاصی محنت کی گئی ہے۔یہ نسخہ، جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا، کلکتہ کے ہندوستانی پریس میں محدود تعداد میں چھاپا گیا، اور اب نادر و نایاب ہے، اس پر کنگز کالج لندن اور اسکول

---

[1] نقلیات ہندی مطبوعہ ہندوستانی پریس کلکتہ ص ا۔

آف اورینٹل سٹڈیز کی مہریں ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ پہلے کنگز کالج لندن میں تھا لیکن پھر اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن میں محفوظ کر دیا گیا۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے یہ نقلیات انگریزوں کو زبان سکھانے اور ان کو ہندوستانی مسلمانوں کے اس معاشرتی اور تہذیبی پس منظر سے آشنا کرنے کے لئے شائع کی تھیں جس کا آئینہ یہ زبان ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بہ حیثیت ایک زباں داں کے یہ ڈاکٹر گلکرسٹ کا ایک اور اہم کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں پیشِ لفظ اور اختتامیہ وغیرہ گلکرسٹ نے انگریزی میں لکھے ہیں اور نقلیات کا متن فورٹ ولیم کالج کے منشیوں سے تیار کروایا ہے۔ اس کام میں میر بہادر علی حسینی، سیّد حیدر بخش حیدری، اور بعض دوسرے منشیوں نے ان کا ہاتھ بٹایا ہے ہو سکتا ہے۔ کالج میں ہیڈ منشی ہونے کی وجہ سے ان نقلیات پر نظر کرنے کا کام میر بہادر علی حسینی نے کیا ہو۔

بہر حال یہ نقلیات نہایت دلچسپ ہیں۔ موضوع اور اندازِ بیاں دونوں اعتبار سے یہ اس سادہ اور آسان نثر کا اعلیٰ نمونہ ہیں جس کا ترجمہ فورٹ ولیم کالج میں کیا گیا، اور جس کے محرک ہندوستان اُردو زبان کے پروفیسر ڈاکٹر جان گلکرسٹ تھے۔ گلکرسٹ نے ان کو اُردو سیکھنے اور پڑھنے والے انگریزوں کے لئے ریڈنگ میٹریل کے طور پر کالج کے منشیوں سے تیار کروایا اور محدود تعداد

میں چھاپا لیکن اُردو نثر کی روایت میں ان کی اَدبی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

اور ان کی اسی اَدبی اہمیت کے پیشِ نظر اب ان نقلیات کی دونوں جلدوں کو اورینٹل کالج کی طرف سے مکمل صورت میں شائع کیا جاتا ہے۔

عبادت بریلوی

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۱۶ر جنوری ۱۹۶۹ء

جشن نامہ

یہ مسرت کی بات ہے کہ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج نے اپنی زندگی کے سو سال پورے کر لئے۔ گذشتہ ایک صدی میں اس نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے، بے شمار تبدیلیوں سے اس کو دوچار ہونا پڑا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کے قدم ہمیشہ تیزی سے آگے کی طرف بڑھتے رہے اور وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔ آج سے سو سال قبل جب اورینٹل کالج کا ڈول ڈالا گیا تھا، اس وقت کسی کے تصوّر میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس کالج میں یونیورسٹی کے چار باقاعدہ پوسٹ گریجویٹ

شعبے ہوں گے جس میں ایم۔اے اور پی ایچ ڈی تک تعلیم ہوگی اور ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں طالب علم اس ادارے سے فارغ التحصیل ہو کر قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیں گے۔ لیکن آج یہ حقیقت ہے کہ نہ صرف برعظیم ہندو پاکستان بلکہ امریکہ، یورپ اور مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے تمام ممالک میں اس کالج کی تدریس و تحقیق دونوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ دنیا کے بڑے بڑے محقق اور عالم اپنی علمی و ادبی تحقیقات میں اس کالج کے اساتذہ کی تحقیقات کے حوالے دے کر، اس کالج کو خراج تحسین پیش کرتے رہتے ہیں۔

گذشتہ ایک صدی میں اعلیٰ درجے کی تدریس کے ساتھ ساتھ اورینٹل کالج میں بلند پایہ علمی اور ادبی تحقیق کی جو روایت قائم ہوئی ہے، وہ بڑی اہمیّت رکھتی ہے۔ ساری دنیا اس کی قائل ہے۔ سب ہی نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ اورینٹل کالج کے جن اساتذہ نے اس عظیم روایت کو پروان چڑھایا، ان میں ڈاکٹر لائٹنر، پروفیسر سر آرل اسٹین، پروفیسر اسٹریٹن، سر ٹامس آرنلڈ، مولانا محمد حسین آزاد پروفیسر وولنر، علامہ اقبالؒ، حافظ محمود خاں شیرانی، پروفیسر مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر اقبال کے نام خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے مخصوص میدانوں میں عظیم کارنامے انجام دیئے اور ادبی تحقیق کی عظیم روایت قائم کی۔ جدید دور میں بھی اس روایت کو برقرار رکھا گیا اور گذشتہ پچیس سال میں جو اساتذہ اس کالج کے مختلف شعبوں کے ساتھ منسلک رہے

انہوں نے تحقیق کی اس روایت کو آگے بڑھایا لیکن ساتھ ہی جدید تنقید کی روایت بھی قائم کی اور اس کو بھی پروان چڑھایا۔

اس سلسلے میں اورینٹل کالج کے جن اساتذہ نے نمایاں کام کیا ان میں حافظ محمود خاں شیرانی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر اور پروفیسر وقار عظیم کے نام سرفہرست ہیں۔ ان بزرگوں نے اورینٹل کالج کو قدیم و جدید کا ایک سنگم بنایا اور تحقیق کے ساتھ ساتھ جدید تنقید میں ایسے کارنامے انجام دیئے جس کا اثر ہماری ادبی اور تنقیدی روایت نے بھی قبول کیا۔

جشن صد سالہ کے موقع پر، اورینٹل کالج کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر مقالات کا یہ خاص مجموعہ جو اس وقت پیش کیا جا رہا ہے، اس میں ایسے مضامین کو یکجا کر کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں تحقیق و تنقید کے ان دونوں رجحانات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ کیونکہ اورینٹل کالج کو اس کی صد سالہ تقریب کے موقع پر خراج تحسین پیش کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔

میں ان تمام اساتذہ اور اہل علم حضرات کا ممنون ہوں جنہوں نے اس خاص مجموعے کے لئے اپنے گراں قدر مقالات سے ہمیں نوازا۔ ڈاکٹر میاں محمد بشیر حسین لیکچرار فارسی، میرے خصوصی شکریے اور تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نہایت محنت اور سلیقے سے طباعت و اشاعت کی ذمہ داریوں کو پورا کیا۔ میں ملک کے ممتاز علم دوست مخیر جناب سید بابر علی شاہ صاحب مینجنگ ڈائریکٹر

پیکیجز لمیٹڈ کا بھی شکر گزار ہوں، جنہوں نے اورینٹل کالج کے جشنِ صد سالہ کی تقریبات کے سلسلے میں اپنے فراخدلانہ تعاون سے ہماری ہمت افزائی کی اور کالج کے خصوصی شمارے اور جشن نامے کے لئے کاغذ کا عطیہ عنایت فرمایا۔

عبادت بریلوی
پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی
پرنسپل
یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

۷ / دسمبر ۱۹۷۲ء

اورینٹل کالج ایک ادارہ ہی نہیں، ایک تحریک بھی تھا۔ اس تحریک کا آغاز ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کے قیام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر انجمن پنجاب کے بانی تھے۔ انہوں نے اس انجمن کے زیر اہتمام ایک تدریسی ادارے کی داغ بیل ڈالی تھی، جس کا نام پہلے ۱۸۶۹ء میں یونیورسٹی کالج رکھا گیا۔ پھر ۱۸۷۲ء میں اس نے اورینٹل اسکول، اور آگے چل کر اورینٹل کالج کی صورت اختیار کر لی۔

اس طرح دیکھا جائے تو موجودہ اورینٹل کالج نے ایک ادارے اور ایک تحریک کی حیثیت سے ۱۹۷۲ء میں اپنی زندگی کے سو سال پورے

کر لئے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اورینٹل کالج سے دلچسپی لینے والوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ۱۹۷۰ء یا ۱۹۷۲ء میں اس کالج کا جشن صد سالہ منایا جائے۔

پنجاب یونیورسٹی کی انتظامیہ نے بھی اس پر غور کیا اور متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اورینٹل کالج کا جشنِ صد سالہ منایا جائے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اس جشن کو اس کی عظیم روایت کے شایان شان ہونا چاہیئے۔ اس کا ایک منصوبہ بنانے اور اس کو عملی شکل دینے کے لئے پرنسپل، اورینٹل کالج کو پورا اختیار دیا گیا۔

یہ فیصلہ ۱۹۶۵-۶۶ء میں کیا گیا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر محمد باقر فارسی کے پروفیسر اور کالج کے پرنسپل تھے۔ انہوں نے جشنِ صد سالہ منانے کا ایک منصوبہ بنایا، اور سب سے پہلے اشاعتی پروگرام کی طرف توجہ کی، کیونکہ اورینٹل کالج کی روایت میں اس کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ ۱۹۷۰ء تک انہوں نے اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہونے والے عربی، فارسی اور اُردو سے متعلق مضامین کی تین جلدیں اور اورینٹل کالج کے اساتذہ کے تحقیقی کام کی دو جلدیں شائع کر دیں۔ ان کے ساتھ پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی کی مرتب کی ہوئی غالب کی نادر و نایاب تصنیف "باغ دو در" کو بھی شائع کر دیا۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے جشن صد سالہ کے سلسلے میں ایک جلسے کا پروگرام بھی بنایا تھا، لیکن اسی سال وہ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔ اس لئے اس جلسے کے منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

ڈاکٹر محمد باقر کے ریٹائر ہونے کے بعد سب سے زیادہ سینئر یونیورسٹی پروفیسر ہونے کی حیثیت سے اورینٹل کالج کا پرنسپل اس خاکسار کو مقرر

کیا گیا۔ اس طرح جشن صد سالہ منانے اور اس سلسلے میں جو کام باقی رہ گیا تھا، اس کو مکمل کرنے کی ذمہ داری بھی مجھ پر آپڑی۔

میں نے پرنسپل کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اپنے احباب سے مشورہ کیا، اور اس موقع پر اشاعتی پروگرام کے ساتھ ساتھ ماہرین علوم مشرقی کی ایک بین الاقوامی کانگریس منعقد کرنے کا منصوبہ بھی بنا لیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں دنیا کے مختلف ملکوں کی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ جواب میں بیشتر یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں نے اورینٹل کالج کی سو سالہ علمی اور تحقیقی خدمات کو سراہا، اپنے گراں قدر پیغامات ارسال کئے، اور یہ وعدہ بھی کیا کہ ان کے پروفیسر اس موقع پر ان کی نمائندگی کریں گے۔ اس طرح امریکہ، کینیڈا، انگلستان، آئرلینڈ، جرمنی، فرانس، بلجیم، ہالینڈ، اٹلی، سوئٹزرلینڈ، چیکوسلوویکیہ، ڈنمارک، سوویت یونین، عوامی جمہوریہ چین، سعودی عرب، ترکی، ایران، افغانستان، عراق، اردن، شام، مصر، جاپان اور آسٹریلیا کسی نہ کسی حیثیت میں اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات میں شریک ہونے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

یہ بہت بڑی کامیابی تھی، اور مجھے اورینٹل کالج کے ایک ادنی خادم کی حیثیت سے اس کامیابی پر بڑی مسرت ہوئی۔ چنانچہ میں نے دسمبر ۱۹۷۲ء کے دوسرے ہفتے میں ماہرین علوم مشرقی کی اس بین الاقوامی کانگرس کو منعقد کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ لیکن اسی زمانے میں شہر لاہور میں کچھ ہنگامے ہو گئے۔ اس لئے اس وقت کانگریس کو ملتوی کر کے مارچ ۱۹۷۳ء میں اس کانگریس کے لئے پورے ایک ہفتے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ یہ جلسے ۱۲ مارچ ۱۹۷۳ء سے ۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء تک ہوتے رہے۔

ان جلسوں میں دنیا کے مختلف ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی، اور اپنے گراں قدر مقالے پڑھے۔ یہ کانگریس توقع سے زیادہ کامیاب رہی اور ساری دنیا کے علمی حلقوں میں اس کو تحسین کی نظروں سے دیکھا گیا۔

اورینٹل کالج کے جشن صدسالہ کے اس موقع پر منعقد ہونے والی اس بین الاقوامی کانگریس کی تفصیلات اس رپورتاژ کی صورت میں قلم بند کی جاتی ہیں تاکہ اس کی ایک واضح تصویر سامنے آسکے، اور ہمیشہ کے لئے ایک مستقل ریکارڈ رہے۔

مجھے یقین ہے کہ اورینٹل کالج سے تعلق رکھنے والوں، علوم مشرقی کے ماہروں، استادوں، محققوں، نقادوں، ادیبوں اور شاعروں، سب کے لئے یہ رپورتاژ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

عبادت بریلوی

یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

۲۵ جنوری ۷۴ء ۱۹

۳۶

اورینٹل کالج میگزین

جشنِ صدسالہ کی تقریبات

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اورینٹل کالج کا جشن صدسالہ بخیروخوبی انجام پایا اور اس موقع پر ماہرین علوم مشرقی کی جو کانگرس ترتیب دی گئی تھی، وہ توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہی۔ دُنیا کے تقریباً تمام اہم ممالک کی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کے نمائندے اس میں شریک ہوئے اور اس طرح دُنیا کے ہر ملک نے اورینٹل کالج اور اس کی ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جتنے مندوبین اس کانگرس کے مختلف اجلاسوں میں شرکت کرنے کے لئے آتے ان کے اخراجات یا تو ان کی حکومتوں نے ادا کیے، یا ان کی یونیورسٹیوں نے انہیں گرانٹ دی۔ اورینٹل کالج اس تعاون کے لیے ان ممالک،

یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کا شکر گزار ہے جنہوں نے اس طرح اورینٹل کالج کے ساتھ تعاون کیا۔ جو ادارے ان تقریبات میں کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے، انہوں نے اس موقع کے لئے خصوصی پیغامات ارسال کیے اور جو مندوبین اس موقع پر تشریف لاتے اُنہوں نے اپنے خاص موضوعات پر نہایت عالمانہ مقالے پڑھے۔ ان سب کا شکریہ ادا کرنا بھی ہمارا خوشگوار فرض ہے۔

اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کی یہ تقریبات اور اس موقع پر ہونے والی بین الاقوامی علوم مشرق کی کانگرس اور تقریبات کا سلسلہ ۱۳ مارچ ۱۹۷۳ء سے ۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء تک جاری رہا۔ دن دن بھر نو بجے صبح سے لے کر پانچ بجے شام تک اس کے مختلف اجلاس ہوتے رہے جن میں مہمان علمانے اپنے گراں قدر مقالے پڑھے۔ ان مقالات کو بڑی توجہ سے سنا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں یہ اجلاس ہوتے اور صبح سے شام تک کیفیت یہ تھی کہ یہ ہال سامعین سے بھرا رہتا تھا۔ اور خاموشی کا یہ عالم تھا کہ سوائے معزز مقالہ نگار کے بیان کے کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہوا۔ غیبی مدد کے بغیر اس طرح کے کام انجام نہیں پاتے۔ اس خاکسار نے انگلستان کے دوران قیام میں ماہرین علوم مشرقی کی کئی کانفرنسوں میں شرکت کی، جو سب اپنی اپنی جگہ اہم تھیں۔ لیکن سامعین کی اتنی بڑی تعداد کہیں نظر نہیں آئی اور وہ مخصوص ماحول بھی نہیں دیکھا جو اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات کے سلسلے میں ہونے والی اس کانگرس کے اجلاسوں میں تھا۔

ان تقریبات کے موقع پر جو کچھ ہوا اس کی تفصیل اب اس روداد کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس موقع پر جو پروگرام ترتیب دیا گیا، وہ خطبات جو اہم شخصیتوں نے دیئے اور وہ مقالے جو مختلف اجلاسوں میں پڑھے گئے، وہ سب اس میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ ایک رپورتاژ بھی اس میں شامل ہے جو ان تقریبات کی تفصیلات کو مکمل طور پر پیش کرتا ہے۔ وہ تصویریں جو اس موقع پر کھینچی گئیں، وہ بھی اس روداد کے ساتھ شامل کی جا رہی ہیں تاکہ ان تقریبات کی ایک مکمل تصویر سامنے آجائے۔

میں سب سے پہلے صدر پاکستان (اب وزیراعظم، اسلامی جمہوریۂ پاکستان) جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اورنٹیل کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات میں دلچسپی لی۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے گراں قدر پیغام سے اس خاکسار کو نوازا اور اس طرح اورنٹیل کالج کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ وفاقی حکومت پاکستان، حکومت پنجاب اور پنجاب یونیورسٹی نے بھی کالج کے جشن صد سالہ کی تقریبات منانے میں اورنٹیل کالج کے ساتھ مکمل تعاون کیا جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

جناب مولانا کوثر نیازی صاحب، وزیر اطلاعات و نشریات و حج و اوقاف کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا خوشگوار فرض ہے جو نیشنل اسمبلی کے اجلاس کے باوجود خاص طور پر اسلام آباد سے لاہور تشریف لائے اور اُردو کے اجلاس میں ایک گراں قدر خطبہ بھی ارشاد فرمایا۔ فیض صاحب کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جو میری درخواست

پر اورینٹل کالج کے دوسرے اجلاس کی صدارت کے لئے اسلام آباد سے لاہور تشریف لائے اور صدارتی تقریر فرمائی۔ ڈاکٹر محمد اجمل صاحب، وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی (اب سکریٹری، تعلیمات حکومت پاکستان)، عزت مآب ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمان اور پروفیسر خواجہ صلاح الدین کا بھی شکر گزار ہوں جن کی رہنمائی اور تعاون کے بغیر یہ تقریبات کامیاب نہیں ہوسکتی تھیں۔ سفیر کبیر شہنشاہ آریا مہر، جناب آقای منوچہر ظلی کا بھی میں خاص طور پر شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے ازراہِ نوازش اس خاکسار کی دعوت کو قبول فرمایا اور خاص طور پر فارسی زبان و ادب کے اجلاس کے افتتاح کے لئے اسلام آباد سے لاہور تشریف لائے اور نہایت گراں قدر خطبہ ارشاد فرمایا۔

جشن صد سالہ اور اس موقع پر ہونے والی کانگریس کی اس روداد کی ترتیب و طباعت میں میرے تمام رُفقاء نے میرے ساتھ تعاون کیا۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر رانا احسان الہیٰ جناب سید وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر میاں بشیر حسین، ڈاکٹر سیّد ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، سیّد سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر عبید اللہ خان، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر آفتاب اصغر اور سہیل احمد خان صاحب خصوصیت کے ساتھ شکریے کے مستحق ہیں، جن کو میں نے بعض تحریروں کے ترجمہ کرنے اور پروف دیکھنے کی زحمت بھی دی۔

عبادت بریلوی

۲۵ جنوری ۱۹۷۳ء

۳۷
جشن نامہ

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اورینٹل کالج کا جشن صد سالہ بخیر و خوبی انجام پایا اور اس موقع پر ماہرین علوم مشرقی کی جو کانگرس ترتیب دی گئی تھی، وہ توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہی۔ دنیا کے تقریباً تمام اہم ممالک کی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کے نمائندے اس میں شریک ہوئے اور اس طرح دنیا کے ہر ملک نے اورینٹل کالج اور اس کی ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جتنے مندوبین

اس کانگرس کے مختلف اجلاسوں میں شرکت کرنے کے لئے آئے
ان کے اخراجات یا توان کی حکومتوں نے ادا کئے، یا ان کی یونیورسٹیوں
نے انہیں گرانٹ دی۔ اورنٹیل کالج اس تعاون کے لئے ان ممالک،
یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کا شکر گزار ہے جنہوں نے اس طرح
اورنٹیل کالج کے ساتھ تعاون کیا۔ جو ادارے ان تقریبات میں کسی
مجبوری کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے، انہوں نے اس موقع کے
لئے خصوصی پیغامات ارسال کیے اور جو مندوبین اس موقع پر تشریف
لائے انہوں نے اپنے خاص موضوعات پر نہایت عالمانہ مقالے
پڑھے۔ ان سب کا شکریہ ادا کرنا بھی ہمارا خوشگوار فرض ہے۔

اورنٹیل کالج کے جشن صد سالہ کی یہ تقریبات اور اس موقع پر
ہونے والی بین الاقوامی علوم مشرقی کی کانگرس اور تقریبات کا
سلسلہ ۱۳ مارچ ۱۹۷۳ء سے ۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء تک جاری رہا۔
دن دن بھر نو بجے صبح سے لے کر پانچ بجے شام تک اس کے مختلف
اجلاس ہوتے رہے جن میں مہمان علما نے اپنے گراں قدر مقالے پڑھے۔
ان مقالات کو بڑی توجہ سے سنا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ
ہال میں یہ اجلاس ہوتے اور صبح سے شام تک کیفیت یہ تھی کہ
یہ ہال سامعین سے بھرا رہتا تھا۔ اور خاموشی کا یہ عالم تھا کہ سوائے
معزز مقالہ نگار کے بیان کے کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔
یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہوا۔ غیبی مدد کے بغیر
اس طرح کے کام انجام نہیں پاتے۔ اس خاکسار نے انگلستان
کے دوران قیام میں ماہرین علوم مشرقی کی کئی کانفرنسوں میں شرکت

کی، جو سب اپنی اپنی جگہ اہم تھیں۔ لیکن سامعین کی اتنی بڑی تعداد کہیں نظر نہیں آئی اور وہ مخصوص ماحول بھی نہیں دیکھا جو اورینٹل کالج کے جشن صدسالہ کی تقریبات کے سلسلے میں ہونے والی اس کانگرس کے اجلاسوں میں تھا۔

ان تقریبات کے موقع پر جو کچھ ہوا اس کی تفصیل اب اس روداد کی صورت میں پیش کی جارہی ہے۔ اس موقع پر جو پروگرام ترتیب دیا گیا، وہ خطبات جو اہم شخصیتوں نے دیئے اور وہ مقالے جو مختلف اجلاسوں میں پڑھے گئے، وہ سب اس میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ ایک رپورتاژ بھی اس میں شامل ہے جو ان تقریبات کی تفصیلات کو مکمل طور پر پیش کرتا ہے۔ وہ تصویریں جو اس موقع پر کھینچی، وہ بھی اس روداد کے ساتھ شامل کی جارہی ہیں تاکہ ان تقریبات کی ایک مکمل تصویر سامنے آجائے۔

میں سب سے پہلے صدر پاکستان (اب وزیر اعظم، اسلامی جمہوریۂ پاکستان) جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اورینٹل کالج کے جشن صدسالہ کی تقریبات میں دلچسپی لی۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے گراں قدر پیغام سے اس خاکسار کو نوازا اور اس طرح اورینٹل کالج کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

وفاقی حکومت پاکستان، حکومت پنجاب اور پنجاب یونیورسٹی نے بھی کالج کے جشن صدسالہ کی تقریبات منانے میں اورینٹل کالج کے ساتھ مکمل تعاون کیا جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

جناب مولانا کوثر نیازی صاحب، وزیر اطلاعات و نشریات

وحج و اوقاف کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا خوشگوار فرض ہے جو نیشنل اسمبلی کے اجلاس کے باوجود خاص طور پر اسلام آباد سے لاہور تشریف لائے اور اردو کے اجلاس میں ایک گراں قدر خطبہ بھی ارشاد فرمایا۔ فیض صاحب کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جو میری درخواست پر اورئنٹل کالج کے دوسرے اجلاس کی صدارت کے لئے اسلام آباد سے لاہور تشریف لائے اور صدارتی تقریر فرمائی۔ ڈاکٹر محمد اجمل صاحب، وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی (اب سیکرٹری، تعلیمات حکومت پاکستان)، عزت مآب ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمان اور پروفیسر خواجہ صلاح الدین کا بھی شکر گزار ہوں جن کی رہنمائی اور تعاون کے بغیر یہ تقریبات کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔ سفیر کبیر شہنشاہ آریا مہر، جناب آقای منوچہر طلی کا بھی میں خاص طور پر شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے ازراہِ نوازش اس خاکسار کی دعوت کو قبول فرمایا اور خاص طور پر فارسی زبان و ادب کے اجلاس کے افتتاح کے لئے اسلام آباد سے لاہور تشریف لائے اور نہایت گراں قدر خطبہ ارشاد فرمایا۔

جشن صدسالہ اور اس موقع پر ہونے والی کانگریس کی اس روداد کی ترتیب و طباعت میں میرے تمام رفقا نے میرے ساتھ تعاون کیا۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر رانا احسان الٰہی، جناب سید وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر میاں بشیر حسین، ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، سید سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر عبید اللہ خان، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر آفتاب اصغر اور سہیل احمد

خان صاحب خصوصیت کے ساتھ شکریے کے مستحق ہیں، جن
کو میں نے بعض تحریروں کے ترجمہ کرنے اور پروف دیکھنے کی
زحمت بھی دی۔

عبادت بریلوی

۲۵ رجنوری ۱۹۷۵ء

(۱)

ذرا مُنصفو! داد کی ہے یہ جا
کہ دریا سخن کا دیا ہے بہا

زلبس عمر کی اس کہانی میں صرف
تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف

جوانی میں جب ہوگیا ہوں میں پیر
تب ایسے ہوتے ہیں سخن بے نظیر

نہیں مثنوی ہے یہ ایک پھلجڑی
مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی

نئی طرز ہے اور نئی ہے زبان
نہیں مثنوی، ہے یہ سحرالبیان

رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام
کہ ہے یادگارِ جہاں یہ کلام

میر حسن کی مثنوی سحرالبیان واقعی سحرالبیان ہے۔ اس میں مثنوی نگاری کے فن کی تقریباً تمام خصوصیات اپنے معراج کمال پر نظر آتی ہیں۔ اور اس صورت حال نے اس کو اردو کی بہترین مثنوی اور ایک اعلیٰ درجے کی بیانیہ نظم بنا دیا ہے۔ اس میں ایک عام، فرسودہ اور مافوق الفطرت کہانی کو جس طرح نظم کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے، کرداروں کی جس طرح زندگی سے بھرپور تصویریں کھینچی گئی ہیں، اس زمانے کے مخصوص معاشرتی ماحول اور تہذیبی فضا کے جس طرح حقیقت سے لبریز مرقعے تیار کیے گئے ہیں، انسانیت اور انسانی اقدار کو جس طرح جگہ جگہ اُبھار کر پیش کیا گیا ہے، اور جذبے اور تخیّل کے رنگوں کی حسین آمیزش سے فن کی جو گل کاریاں کی گئی ہیں، ان کے مجموعی تاثر سے آشنا ہونے کے بعد اس مثنوی کے بارے میں میر حسن کے خیالات حرف بحرف صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں تعلّی کا شائبہ تک

نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے پڑھنے والے کو ان کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے واقعی اس مثنوی میں سخن کا دریا بہا دیا ہے۔ اس کہانی میں اُنھوں نے ایک عمر صرف کر دی ہے تب کہیں جا کر ان کے قلم سے یہ موتی سے حرف نکل سکے ہیں۔ انہوں نے اس پر بے اندازہ محنت کی ہے اور اس بے اندازہ محنت ہی نے ان کی اس مثنوی کو مثنویوں میں بے نظیر بنا دیا ہے۔ یہ مثنوی مثنوی نہیں، مسلسل موتی کی ایک لڑی بلکہ ایک پھلجڑی ہے۔ اس کی شہرت کا آفتاب کبھی گہنا نہیں سکتا۔ اس کی چمک دمک کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔ یہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گی اور اس کی یہ دولت اُردو شاعری کے اُفق پر میر حسن کے نام کا ستارہ بھی ہمیشہ ہمیشہ تابندہ رہے گا۔

سحر البیان کا بنیادی موضوع وہ کہانی ہے جس میں بے نظیر اور بدر منیر کی عشقیہ معاملات کی تفصیل و جُزئیات کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس کہانی میں، جہاں تک کہانی کا تعلق ہے، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ بالکل سیدھی سادی سی کہانی ہے، جس میں نہ تو ہنگامہ آرائی ہے نہ ہیجان انگیزی، نہ پیچیدہ اور پر پیچ کیفیت ہے نہ رمزیت اور تہہ داری ہے۔ صرف چند سیدھے سادے واقعات ہیں جن کو نظم کے سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے اور یہ واقعات بھی عام واقعات نہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ان میں خاصی فرسودگی کا احساس ہوتا ہے اور کسی قسم کی جدت نظر نہیں آتی۔ اس قسم کے واقعات سے ترتیب دی ہوئی کہانیاں اس زمانے میں اور اس سے قبل بھی اس معاشرے

میں بہت عام تھیں۔ اس لیے میرحسن نے اس کہانی کو اپنی مثنوی کا موضوع بنا کر کوئی نئی بات نہیں کی لیکن ان کا کمال یہی ہے کہ اس کے باوجود انہوں نے کہانی کو دلچسپ بنایا اور اس میں مجموعی طور پر ایک ایسی فضا پیدا کی کہ اس کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور ہر بار پڑھنے کے بعد ایک نیا لطف آتا ہے۔

(۲)

کہانی صرف اتنی سی ہے کہ کسی شہر میں کوئی بادشاہ تھا۔ اس کی حکومت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ نہ جانے کتنے بادشاہ اس کو خراج دیتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں شہنشاہ گیتی پناہ تھا۔ اس کے حشمت و جاہ اور مال و منال کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ہر طرف ہن برستا تھا۔ دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں۔ رعیت آسودہ حال تھی۔ سلطنت میں اَمن اور عافیت کا دور دورہ تھا۔ ہُنرمندوں کے جمگھٹے تھے۔ اہلِ حرفہ کا اژدھام تھا۔ عیش و عشرت کی گرم بازاری تھی۔ ظاہر ہے کہ جس بادشاہ کو یہ سب کچھ نصیب ہو اس کو کسی بات کا غم نہیں ہو سکتا۔ اس بادشاہ کو بھی سوائے اولاد کے غم کے اور کوئی غم نہیں تھا۔ اس کے دل میں یہ حسرت داغ بن کر رہ گئی تھی کہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اس کا گھر بے چراغ ہے۔ یہ احساس بادشاہ کو اُداس رکھتا تھا اور ہر وقت اس کو یہی فکر دامن گیر رہتی تھی کہ اس کے بعد اس کا کوئی وارث نہیں ہوگا۔

ایک دن جب یہ احساس زیادہ شدید ہوا اور پریشانی حد سے زیادہ بڑھی تو اس نے وزیروں کو بلا کر دل کا احوال بیان کیا، اور اس

بات کی وضاحت کی کہ زندگی میں اب اس کے لئے کوئی کشش باقی
نہیں۔ اس لئے ترکِ دُنیا کا خیال ہے اور فقر و درویشی کی آرزو
ہے۔ وزیروں نے اس کا حال سنا اور کہا کہ ایک بادشاہ کے لیے
ایسا کرنا مُناسب نہیں۔ اس کا کام تو رعیت کی دیکھ بھال ہے اور
اس اعتبار سے اس کی ذات ایک امانت ہے۔ البتہ اولاد کا جو
غم ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہے۔ لیکن اس کے لئے ہم منجموں کو بلاتے
ہیں اور ان سے قسمت کا حال معلوم کرتے ہیں۔ چنانچہ منجموں کو
طلب کیا گیا اور بادشاہ کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ اُنھوں
نے یہ خوش خبری سُنائی کہ بادشاہ کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ اس
کے یہاں جلد ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوگا لیکن بارہ سال تک اس
کی حفاظت کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ اس عرصے میں اسے بعض خطرات
سے دوچار ہونا پڑے گا۔ منجموں کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی
اور سال بھر کے اندر بادشاہ کے یہاں ایک نہایت ہی حسین و
جمیل بیٹا پیدا ہوا۔ بادشاہ کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ گویا اس
کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار آگئی۔ جشن منایا گیا۔ شادیانے بجائے
گئے۔ ایک باغ تیار کیا گیا اور اس میں ایک خاص محل شہزادے
کے لئے تعمیر کیا گیا۔ صرف اس خیال سے کہ وہ بارہ سال تک اس
محل کے اندر تہہ خانے میں رہے۔ چنانچہ اس محل میں وہ شہزادہ، بارہ
برس کی عمر تک رہا۔ اس عرصے میں اس نے تمام ہُنر سیکھے اور ہر
فن میں کمال حاصل کیا۔

جب اس نے اپنی زندگی کی بارہ منزلیں طے کرلیں تو ایک

رات جب کہ نہایت خوب صورت چاندنی چاروں طرف چھٹکی ہوئی تھی، اس کے دِل میں چھت پر سونے کی خواہش پیدا ہوئی۔ خواصوں نے بادشاہ سے اجازت طلب کی۔ بادشاہ نے یہ سمجھ کر کہ بارہ برس تو پورے ہو ہی چکے ہیں، اور اب کسی خطرے کا امکان نہیں ہے، اس کو چھت پر چاندنی میں سونے کی اجازت دے دی۔ اس کو یہ خیال نہ رہا کہ ابھی بارہ برس پورے ہونے میں چند گھڑیاں باقی ہیں۔ بہر حال شہزادہ رات کو چھت پر سویا۔ اتفاق سے اسی رات کو ادھر سے پرستان کی پری ماہ رُخ کا گزر ہوا۔ اس نے پُر فضا منظر میں جب حسین و جمیل شہزادے کو سوتا ہوا دیکھا تو دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گئی۔ طبیعت پر قابو نہیں رہا اور اس کو محل سے اُڑا کر پرستان میں لے آئی۔ صبح کو جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ محل میں کہرام مچ گیا۔ ساری سلطنت پر اُداسی اور سوگواری کے بادل چھا گئے۔ تلاش و جستجو کا سلسلہ شروع ہوا۔ شہروں کا تو کہنا ہی کیا، صحرا اور جنگل تک لوگوں نے چھان مارے لیکن شہزادے کا کہیں سُراغ نہ ملا۔ ملتا بھی کیسے؟ شہزادہ تو پرستان میں پہنچ چکا تھا اور ماہ رُخ پری اس کو اپنے شیشے میں اُتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔

شہزادہ اس عالم میں پریشان تھا۔ پریشانی کی بات تھی بھی۔ کیونکہ آنکھ کھُلی تو اس نے اپنے آپ کو اپنے محل کے بجائے پرستان کے اجنبی ماحول میں پایا، جہاں آدم نہ آدم زاد، سوائے خدا کی ذات۔ چاروں طرف دیو اور پریوں کے سوا کچھ اور نظر ہی نہ آتا تھا۔ شہزادہ یہ دیکھ کر بہت گھبرایا اور اس نے گریہ و زاری شروع کی۔ ماہ رُخ پری

نے اس کا دل ہاتھوں میں لیا۔ بہت سمجھایا بُجھایا لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے لاکھ کہا کہ یہ گھر تیرا ہی ہے، تو یہاں مہمان ہے، یہاں تجھے ہر طرح کی راحت اور آرام نصیب ہے۔ لیکن شہزادے کو اس کی باتوں سے ذرا بھی تسلی نہیں ہوئی۔ بلکہ روز بروز اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ پری نے اس کو لُبھانے کی جتنی کوششیں بھی کیں وہ سب کی سب بے کار ثابت ہوئیں۔ بالآخر اس نے یہ سوچا کہ شہزادے کا دِل سیر و تفریح سے بہلانا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے اسے ایک جادو کا گھوڑا دیا جس میں بیٹھ کر وہ جہاں بھی چاہے جا سکتا تھا لیکن ساتھ ہی یہ عہد بھی لیا کہ وہ کبھی کسی اور سے دل نہیں لگائے گا اور معینہ وقت پر بہر صورت اس کی واپسی پرستان میں ہوگی۔ شہزادے نے پری کی یہ تمام باتیں مانیں اور اس گھوڑے پر سیر کے لئے جانا شروع کیا۔ چند روز میں دُور دُور تک گھومنا اور مُلکوں مُلکوں کی سیر کرنا اس کا معمول بن گیا۔

اتفاق سے ایک دن اس کا گزر ایک نہایت ہی سُہانے باغ میں ہوا۔ اس باغ میں اس نے ایک سفید عمارت دیکھی۔ منظر نہایت حسین اور دِل آویز تھا۔ ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر اُس کے دِل میں اس خواہش نے انگڑائی لی کہ ذرا گھوڑے سے اُتر کر اس باغ کی سیر کرنا چاہیئے۔ چنانچہ گھوڑے کو اس باغ میں اُتارا اور وہاں کے پُر فضا منظر سے لُطف اندوز ہونے لگا۔ یہ باغ دراصل شہزادی بدرِ منیر کے محل کا باغ تھا اور اس وقت وہ بھی اپنی ہم جولیوں کے ساتھ تفریح کے لئے باہر نکلی تھی۔ شہزادے نے اس کو دیکھا، اس کی نظر شہزادے

پر پڑی اور وہ دونوں دیکھتے دیکھتے ایک دوسرے کے عشق میں پابہ زنجیر ہو گئے۔ شہزادی کو غش آ گیا۔ خواصیں بڑی مشکل سے اس کو ہوش میں لائیں۔ دونوں کی مُلاقات ہوئی لیکن شہزادہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے جلد ہی رُخصت ہوا۔ اس واقعے کے بعد روزانہ اس باغ میں آنا، شہزادی بدرِ منیر سے مِلنا، محبت کی باتیں کرنا اور محبوب کے وصل سے لُطف اندوز ہونا اس کا معمول ہو گیا۔

ایک دن وہ دونوں محوِ اختلاط تھے کہ ایک دیو ادھر سے گزرا۔ اس نے شہزادے کو اس عالم میں دیکھا اور ماہ رُخ پری کو اس کی خبر کی۔ پری یہ سُن کر آگ بگولہ ہو گئی، رشک کی آگ سے جلنے لگی اور شہزادے کو اس نے ایک اندھے اور گہرے کنوئیں میں قید کر دیا۔ جب شہزادہ کئی روز تک بدرِ منیر کے پاس نہیں گیا تو اس کی (یعنی بدرِ منیر) حالت خراب ہونے لگی۔ کھانا پینا ترک کر دیا اور دُنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ایک رات اس نے خواب میں شہزادے کو پریشان دیکھا اور اس کا ذکر اپنی ہم جولیوں سے کیا۔ اس کی ایک سہیلی وزیر کی بیٹی نجم النساء تھی۔ نہایت شوخ وشنگ لیکن حد درجہ مخلص اور وفا شعار۔ جب اس نے شہزادی کا یہ حال دیکھا تو وہ جوگن کا بھیس بدل کر شہزادے کی تلاش میں نکلی اور شہروں شہروں ماری ماری پھری۔ صحراؤں اور بیابانوں کی خاک چھانی۔ ایک رات، کہ نہایت ہی حسین چاندنی رات تھی، اس نے ایک جنگل میں بسیرا کیا۔ جوگنوں کی طرح بیٹھ کر تنہا بین بجا رہی تھی کہ اتفاق سے اسی وقت ادھر سے جنوں کے بادشاہ کے بیٹے فیروز شاہ کا گزر ہوا۔ اس نے جوگن کو جو اس حال میں دیکھا اور اس کی بین کا نغمہ سُنا تو دل وجان سے اس پر فریفتہ

ہو گیا۔ اظہارِ عشق کی تو اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس لئے نجم النساء کے سامنے اس نے رونا شروع کیا اور اس طرح نجم النساء پر حقیقت واضح ہوئی کہ شہزادہ اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے۔ نجم النساء نے اس کو بتایا کہ وہ شہزادہ بے نظیر کی تلاش میں ہے۔ اگر وہ اس کام میں اس کی مدد کرنے کو تیار ہو تو اس کی مراد بھی بَر آئے گی۔ فیروز شاہ جوگن کو پرستان میں لے گیا۔ جنوں کے بادشاہ کے سامنے اس کو پیش کیا۔ نجم النساء نے اس کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ بادشاہ اس سے بہت متاثر ہوا۔ سارے پرستان میں دھوم مچ گئی۔

اِدھر فیروز شاہ نے شہزادے کی تلاش وجستجو کا کام جاری رکھا۔ دیو کی مدد سے اسے اس بات کا علم ہوا کہ ماہ رُخ پری نے شہزادے کو ایک اندھے کنوئیں میں قید کر رکھا ہے۔ یہ خبر ملتے ہی وہ نجم النساء کو ساتھ لے کر اس مقام پر پہنچا۔ کنوئیں پر جو بھاری پتھر رکھا ہوا تھا، اس کو دیو کی مدد سے ہٹایا اور شہزادے کو باہر نکال لایا۔ ماہ رُخ پری رسوائی کے خیال سے کچھ نہ کہہ سکی۔ نجم النساء نے شہزادے کا حال احوال پوچھا اور وہ سب شہزادی بدر منیر کے محل کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر بدر منیر کے باپ کو شادی کے لئے رقعہ لکھا گیا۔ بادشاہ نے اس رشتے کو منظور کر لیا۔ دونوں کی شادی بڑی دھوم دھام اور تزک واحتشام سے ہوئی۔ اس کے بعد نجم النساء نے بھی اپنا وعدہ وفا کیا اور فیروز شاہ سے شادی کر لی۔ پھر سب مل کر شہزادہ بے نظیر کے وطن کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر میں داخل

ہونا تھا کہ یہ خبر آندھی کی طرح پھیل گئی کہ شہزادہ بے نظیر واپس آگیا ہے۔ رعیت خوش ہوئی، خلقت نے شادیانے بجائے اور ماں باپ کو تو گویا ان کی کھوئی ہوئی دُنیا مل گئی۔ بیٹے اور بہو کو گلے لگایا۔ شادی کی رسم ایک بار پھر منائی گئی۔ خوب جشن ہوئے اور شادیانے بجائے گئے۔ اس طرح ایک دفعہ پھر قدرت نے بچھڑے ہوؤں کو ملایا اور وہ سب اطمینان اور چین سے زندگی کے دن گزارنے لگے۔

(۳)

یہ کہانی، ظاہر ہے کہ ایک عام سی کہانی ہے۔ یہ تمام تر میر حسن کے ذہن کی پیداوار اور ان کے تخیل کی تخلیق نہیں ہے۔ اس قسم کی کہانیاں اس معاشرے میں عام تھیں اور لوگ ان کہانیوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ مختلف مثنویوں اور کہانیوں میں ایسی کہانیوں کا عام رواج تھا۔ اس لئے میر حسن نے اس عام کہانی کو اپنی اس مثنوی کا موضوع بنا کر کوئی خاص جدّت نہیں کی۔ لیکن ان کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے اس فرسودہ کہانی میں بھی دلچسپی پیدا کی اور دلچسپی بھی ایسی جو شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ میر حسن نے اس کہانی کے عام واقعات کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ اس میں مجموعی طور پر بڑی حد تک وہ خصوصیت پیدا ہو گئی ہے جو عام طور پر کسی کہانی کے پلاٹ میں ہوتی ہے۔ اس پلاٹ کا سارا حسن ان مختلف واقعات کے بیان میں ہے جن سے میر حسن نے اپنی کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ یہ واقعات آپس میں مربوط ہیں۔ ان میں ایک منطقی تسلسل ہے۔ ان کی نظم و ترتیب کچھ ایسی ہے کہ مجموعی طور

پران میں دل کشی کا احساس ہوتا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ وہ توازن ہے جس کا دامن میر حسن نے کسی حال میں بھی نہیں چھوڑا ہے۔ اسی لئے اس کہانی میں کسی جگہ بھی اَجنبیت کا اِحساس نہیں ہوتا اور نامانوس فضا نظر نہیں آتی۔ ساری کہانی اور اس کے تمام واقعات چند اخلاقی اور جذباتی اقدار کے گرد گھومتے ہیں۔ گویا یہی کہانی کا بنیادی محور ہیں۔ اسی لئے کہانی میں انسانیت اور انسان دوستی کے تصوّرات ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کہانی کا خاصا حصہ مافوق الفطرت باتوں کو بھی کچھ ایسا انسانی رنگ و آہنگ دیا ہے کہ وہ واقعیت سے قریب معلوم ہوتے ہیں اور ان میں بھی انسانی اِقدار کا بول بالا نظر آتا ہے۔ اس کہانی کے مختلف واقعات میں ایک واضح نقطہ نظر بھی موجود ہے اور اس نقطہ نظر کی بنیاد بھی اسی انسانیت اور انسان دوستی پر استوار ہے۔ میر حسن کے سماجی شعور نے بھی اس کہانی میں بڑی جان پیدا کی ہے۔ جن واقعات پر یہ کہانی مشتمل ہے، ان سب میں اس زمانے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی تصویریں اپنا جلوہ دِکھاتی ہیں۔ تفصیل و جزئیات نے کہانی میں ایک حسیاتی شان پیدا کی ہے لیکن پہلودار کیفیت کا خاتمہ نہیں کیا ہے۔ جگہ جگہ اس کہانی میں خاصی نہیں ملتی ہیں اور انہیں نہوں کی بدولت کہانی میں تجسس کا عنصر بہر صورت برقرار رہتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ تمام باتیں کرداروں کی مرہونِ منت ہیں۔ میر حسن نے کرداروں کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ کہانی کی پوری عمارت کرداروں ہی کے سہارے تعمیر کی ہے۔ کرداروں کی تفصیل

اس کہانی میں پہلے بیان ہوتی ہے اور پھر واقعات انہیں کرداروں کی حرکات و سکنات کے نشیب و فراز کا روپ اختیار کرتے ہیں۔

اس مثنوی میں صرف چند اہم واقعات ہیں اور انہیں واقعات کے مجموعی امتزاج سے کہانی کا بنیادی ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے بادشاہ سامنے آتا ہے جو اس اعتبار سے مجبور اور معذور ہے کہ اس کے پاس دولت اور جاہ و حشمت سب کچھ موجود ہے لیکن اولاد نہیں جس سے اس کا نام آگے چل سکے اور اس کی سلطنت اور حکومت برقرار رہے۔ اس خیال سے وہ آزردہ ہوتا ہے اور ترک دنیا میں پناہ ڈھونڈتا ہے لیکن اس کے مشیر آڑے آتے ہیں اور نجومیوں کو بلا کر اس کو یہ خوش خبری سُناتے ہیں کہ اس کے یہاں اولاد ضرور ہوگی، چنانچہ جلد ہی ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ لیکن وہ پیشین گوئی کے مُطابق بارہ برس کی عمر میں زبردست خطرے سے دوچار ہوتا ہے۔ ایک پری اس پر عاشق ہو کر اس کو اُڑا لے جاتی ہے۔ وہ پرستان میں پہنچتا اور پری کی خاطر و مدارات کے باوجود زندگی سے بیزار رہتا ہے۔ بالآخر وہ پری اس کو ایک ایسا گھوڑا دیتی ہے جس پر وہ آسمانوں میں سیر کر سکتا ہے۔ چنانچہ دُور دُور سیر کے لئے جاتا ہے۔ ایک دن کسی محل کے باغ میں اس کی نظر شہزادی بدر منیر پر پڑتی ہے اور وہ اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ چند روز اسی طرح گزرتے ہیں لیکن دیو کے ذریعے سے پری کو شہزادے کے اس عشق کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ اس کو قید کر دیتی ہے۔ اِدھر شہزادی کا اس کے ہجر میں بُرا حال ہوتا ہے۔ اس کی سہیلی نجم النساء اس کے حال زار کو دیکھ کر شہزادے کی

تلاش میں نکلتی ہے۔ راستے میں اس کو جنوں کے بادشاہ کا بیٹا فیروز شاہ ملتا ہے اور اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس کی مدد سے وہ شہزادے کا سُراغ لگاتی ہے۔ نجم النساء فیروز شاہ سے شادی کر کے اپنے وعدے کو پُورا کرتی ہے اور پھر بے نظیر اور بدر منیر کا ملاپ ہوتا ہے اور بالآخر شادی ہو جاتی ہے۔

یہ تمام واقعات ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح مربوط اور ہم آہنگ ہیں۔ ان میں سے کوئی واقعہ بے کار اور بے مقصد نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان واقعات میں سے اگر کسی ایک واقعے کو بھی نکال کر الگ کر لیا جائے تو کہانی میں تسلسل باقی نہیں رہتا اور اس کی ارتقائی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ میر حسن نے صرف ضروری واقعات کو اپنے پیش نظر رکھا ہے اور ان کو یک جا کر کے کہانی میں مجموعی طور پر ایک وحدت پیدا کی ہے۔ ان واقعات میں کہیں کوئی کھانچا نظر نہیں آتا۔ برخلاف اس کے شروع سے آخر تک ایک ہم آہنگی کی کیفیت نظر آتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بعض واقعات طویل اور بعض مختصر ہیں لیکن ان میں کہیں بھی ان میل اور بے جوڑ ہونے والی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ واقعات تو ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں اور ان میں ایک متوازن کیفیت نظر آتی ہے۔ اسی تناسب اور توازن نے ان کو آپس میں مربوط بھی کیا ہے اور ان میں مجموعی طور پر ایک منطقی تسلسل کی وہ خصوصیت بھی پیدا کر دی ہے جو مثنوی کے فن کی جان ہے۔

یہ واقعات انسانی زندگی کے بعض بنیادی حقائق کے گرد گھومتے ہیں۔ اس لئے ان میں ہر جگہ واقعیت کا احساس ہوتا ہے اور یہ زندگی

سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ بادشاہ کے پاس سب کچھ موجود ہے لیکن اس کے باوجود وہ مجبور محض ہے۔ اس مجبوری کو وہ شدّت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور زندگی سے علیحدگی اختیار کر لینے کے خیالات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ اس کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار آجاتی ہے اور کشتِ اُمید لہلہا اُٹھتی ہے۔ اس کا دِلی مقصد پورا ہوتا ہے اور اسی کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ لیکن پھر اس پر غم کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں۔ وہ شاخ ہی باقی نہیں رہتی جس پر اس کی مسرّتوں کا آشیانہ تعمیر ہوا تھا۔ اس کا نورِ نظر اور لختِ جگر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ماہ رخ پری جو شہزادے پر عاشق ہو کر اس کو وہاں سے اُڑا لے جاتی ہے اس کی زندگی میں بھی محرومیاں ہیں۔ وہ محرومیوں کے اس خلا کو بے نظیر کی محبت سے پُر کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن انجام کار اس کا حال بھی عام انسانوں کا سا ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ چاہتی ہے وہ نہیں ہوتا۔ اس کی آرزوؤں کی تمام عمارتیں منہدم ہو جاتی ہیں۔ ایک عام عورت کی طرح رشک اور نفرت کے جذبات کا اظہار اس کی طرف سے ضرور ہوتا ہے لیکن انسانی فطرت کے سامنے اس کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ بے نظیر بدر منیر کی محبت کو کسی حال میں بھی خیرباد کہنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ قید و بند کی مُصیبتوں کو اُٹھانا گوارا کرتا ہے لیکن عشق کی جو شمع اس کے دل میں فروزاں ہے اس کو بُجھانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس کے عشق میں نوجوان اور صحت مند انسانوں کے عشق کی طرح صداقت اور استواری ہے۔ وہ اس عشق میں والہانہ جذب و شوق کا اظہار کرتا

ہے۔اس کی محبوبہ بدر منیر اس جذب و شوق کے اظہار میں اس سے پیچھے نہیں۔یہ عنفوان شباب کی نفسیات کا تقاضا ہے۔ وہ اس کے فراق میں تڑپتی ہے اور اس کے بغیر زندگی سے بیزار ہو جاتی ہے۔ اس کا جذب و شوق اس منزل پر پہنچ گیا ہے، جہاں وہ دونوں ایک جان دو قالب ہو گئے ہیں۔ اس کا محبوب جن پریشانیوں میں مبتلا ہے اس کا علم سب سے پہلے اس کو ہوتا ہے اور اس سلسلے میں اس کی مخصوص وجدانی کیفیت اس علم کو بہم پہنچانے کا ذریعہ اور وسیلہ بنتی ہے۔نجم النسا، ایک شوخ اور شریر سی لڑکی ہے لیکن اپنی دوستی میں پختہ ہے وہ بدر منیر کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا کر بے نظیر کی تلاش میں نکلتی ہے۔ جوگن بن کر جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھانتی ہے اور بالآخر فیروز شاہ کی مدد سے اس کو تلاش کر لیتی ہے۔لیکن اس کام میں اس کو اپنا سب کچھ لُٹا دینا پڑتا ہے۔یہاں تک کہ وہ اپنی پوری زندگی کو ایک غیر انسان یعنی جن کے سپرد کر دیتی ہے۔ظاہر ہے کہ ایک اِنسان کا جن کے ساتھ شادی کرنا انسانی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔یہ اور بات ہے کہ خود جنوں کے بادشاہ کا بیٹا فیروز شاہ بے شُمار انسانی خصوصیات کا مالک ہے۔ وہ نجم النسا کے سامنے اظہارِ عشق تک کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ وہ تو صرف روتا ہے اور رونے کے اس عمل سے اس کی جذباتی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ کبھی بھی اپنی مافوق الفطرت صلاحیتوں سے کام نہیں لیتا۔برخلاف اس کے شروع سے آخر تک ایک عام اور معمولی انسان کی طرح اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے۔ نجم النسا، عجیب و غریب منزلیں طے کر کے بے نظیر اور بدر منیر کو ایک

دوسرے سے ملاقی ہے اور اس طرح مثنوی کا خاتمہ بخیر و خوبی ہوتا ہے۔ زندگی کے بے شمار المیوں کے بعد اس میں طربیہ پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور یہ بھی انسانی زندگی کی ایک عام حقیقت ہے۔

غرض میر حسن نے اس مثنوی میں انسانی زندگی کے بُنیادی معاملات کو ہر جگہ نُمایاں کیا ہے اور اس طرح انسانی فطرت کی اہمیت واضح کی ہے۔ اس زندگی میں حسن اور جذبے کی جو اہمیت ہے، محبّت اور اخلاص مندی کی جو قدر و قیمت ہے، ایثار اور قربانی کی جو حیثیت ہے، اس کو اُنھوں نے مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ اِنسانی زندگی کو سمجھتے ہیں اور اس کی بُنیادی اقدار کا صحیح احساس و شعور رکھتے ہیں۔ سحر البیان میں اُنھوں نے جو مختلف واقعات پیش کیے ہیں ان میں اُنہیں انسانی اقدار کو اُبھارا ہے اور اس طرح جگہ جگہ اپنے نقطۂ نظر اور نظریہ حیات کی وضاحت کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا اظہار اس مثنوی میں براہِ راست نہیں ہوا ہے۔ شاید اس زمانے میں اس کا اِظہار براہِ راست ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اس وقت اس کی کوئی جان دار روایت موجود نہیں تھی۔ لیکن میر حسن نے بالواسطہ طور پر جگہ جگہ ان انسانی اقدار کو نمایاں کیا ہے، اور یہ صورت حال اس مثنوی کی کہانی اور اس کے پلاٹ کی بہت بڑی خوبی بن گئی ہے۔

(۴)

اس سلسلے میں سب سے پہلے جس چیز پر نظر پڑتی ہے وہ انسانی زندگی کے ساتھ محبّت ہے۔ وہ بادشاہ جو اَولاد سے محروم ہے جب اَولاد کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو گویا انسانی زندگی سے محبّت کا اِظہار

کرتا ہے۔ ایک لمحے کو اس کے یہاں ترکِ دُنیا کے خیالات ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جب اس کو احساس دلایا جاتا ہے کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے انسانیت کے منافی ہے تو وہ اس خیال کو ترک کر کے زندگی سے ایک بار پھر دل لگاتا ہے۔ حالات بھی اس کی مدد کرتے ہیں اور اس کی آرزو پوری ہوتی ہے۔ پری جب شہزادہ بے نظیر کے عشق میں گرفتار ہوتی ہے اور بے قابو ہو کر اس کو پرستان میں لے جاتی ہے تو پری ہونے کے باوجود وہ ایک انسانی جذبے کا اظہار کرتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی یہ حرکت انسانی نہیں ہے۔ شہزادہ بے نظیر جب گھوڑے پر سوار ہو کر دُنیا کی سیر کرتا پھرتا ہے اور شہزادی بدر منیر کو دیکھ کر اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے تو گویا زندگی سے اپنے لگاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ نجم النساء جب جوگن بن کر شہزادے کی تلاش میں نکلتی ہے تو اس کا یہ اقدام بھی انسانی زندگی کی بعض اہم اقدار، یعنی محبت، دوستی، اخلاص اور قربانی سے اس کی والہانہ وابستگی کو ظاہر کرتا ہے۔ فیروز شاہ جب نجم النساء کے عشق میں مُبتلا ہو کر اس کے سامنے اظہارِ عشق کرتا ہے تو اس کے اس عمل سے انسانی زندگی کی محبت صاف ظاہر ہوتی ہے۔ بے نظیر اور بدر منیر اور فیروز شاہ اور نجم النساء کی شادیاں بھی انسانی زندگی کی بعض بُنیادی اقدار کی وضاحت کرتی ہیں۔ غرض اس طرح ساری مثنوی میں ایک انسانی فضا کا احساس ہوتا ہے اور اس فضا سے میر حسن کے انسانی زاویۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔

میر حسن نے جہاں کہیں اس مثنوی میں فطرت کے حسن کے ساتھ انسان کے حسن اور اس کے جذب و شوق کی کیفیت کو واضح کیا ہے وہاں

ان کی انسانیت پرستی اور انسان دوستی کے نقطۂ نظر کی وضاحت بہرصورت ہوتی ہے، اور اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے انہیں کتنی دلچسپی تھی۔ مثلاً اس مثنوی میں مناظرِ فطرت اور خصوصیت کے ساتھ ان مناظر کے لطیف پہلوؤں کا بیان بڑی شد و مد سے ہوا ہے۔ میر حسن نے کہانی کے ہر واقعے کو پیش کرتے ہوئے پہلے مناظرِ فطرت کی مصوری کی ہے اور ان کی اس مصوری نے کہانی کے مختلف واقعات کے لئے پسِ منظر کا کام کیا ہے۔ اس پسِ منظر میں ان واقعات کے خد و خال نسبتاً زیادہ نمایاں ہوتے ہیں اور ان میں زیادہ دلکشی اور دل آویزی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور — عبادت بریلوی

۱۹۷۴ء

لندن کے پانچ سالہ دورانِ قیام میں مجھے فارسی اور اُردو کے جو نادر و نایاب قلمی نسخے ملے، ان میں "مرقع مخلص" کا یہ قلمی نسخہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ صرف کسی کتاب کا قلمی نسخہ ہی نہیں بلکہ آنند رام مخلص، ان کے بزرگوں، اُستادوں اور دوستوں کی تحریروں کا ایک البم ہے جس کو مخلص نے بڑی محنت اور سلیقے سے یکجا کیا ہے، اور ان پر خود اپنے قلم سے ایسے حواشی بھی لکھے ہیں جو تاریخی، تہذیبی اور اَدبی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

اس قلمی نسخے کا نام "مرقع مخلص" ان اوراق میں نہیں ہے، میں نے تجویز کیا ہے۔ یہ موجودہ حالت میں صرف چند تحریروں کا مجموعہ ہے جن کو مخلص ایک زمانے تک اپنے شوق اور دلچسپی کی وجہ سے جمع کرتے رہے۔

بظاہر یہ مخطوطہ کوئی باقاعدہ کتاب نہیں معلوم ہوتا۔ مخلص کو اپنے زمانے کی تاریخ، معاشرے اور تہذیب سے دل وابستگی تھی۔ وہ ایک اَدبی مزاج رکھتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ بنیادی طور پر وہ ایک اَدبی انسان تھے۔ اسی مزاج نے ان کے دل میں اپنے معاصرین کی تحریروں کو جمع کرنے کا شوق پیدا کیا، اور وہ ایک زمانے تک ان اہم تحریروں کو جمع کرتے رہے۔ چنانچہ ان کے پاس معاصرین کی ان تحریروں کا ایک اچھا خاصا مجموعہ تیار ہو گیا۔ اور اب دُنیا میں یہ واحد قلمی نسخہ ہے جس میں خود آنند رام مخلص، ان کے والد ہردے رام، ان کے دادا رائے گجپت رائے، چچا دیا رام اور دوسرے بزرگوں پرس رام وغیرہ اور عہد محمد شاہی کی اہم تاریخی اور اَدبی شخصیتوں مثلاً اعتماد الدولہ امیر الامراء قمر الدین خانؒ میرزا بیدل، سراج الدین علی خان آرزو، شیخ علی حزین، قزلباش خان اُمید، موسوی خان فطرت کی تحریروں اور ان کے خط کے نمونے محفوظ ہیں۔

مخلص کو اس عہد کی ان شخصیتوں سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ ان سب کے پرستار تھے۔ اس لئے ان اہم شخصیتوں کی جو تحریریں بھی اُنہیں دستیاب ہوتیں وہ ان کو محفوظ کر لیتے۔ ان پر اپنے قلم سے یہ لکھتے کہ یہ تحریر ان کے پاس کس طرح آئی اور یہ کہ اس کی اہمیت کیا ہے۔ اس طرح مخلص کے پاس اعتماد الدولہ امیر الامراء کے احکامات، مخلص کے والد اور دادا کے بعض خطوط و شذرات اور سراج الدین علی خان آرزو، شیخ علی حزین،

قزلباش خان اُمید وغیرہ کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلیں، خطوط اور بعض دوسری تحریریں یک جا ہوگئیں، اور اس طرح ان نادر و نایاب تحریروں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا جو آج اپنی اہمیت کے اعتبار سے ایک ایسا عجیب و غریب مرقع ہے جس کو علمی دُنیا میں ایک نئی دریافت تصوّر کرنا چاہیئے۔

مخلص کی تالیفات میں ایک مجموعے "مرقع تصویر[1]" کا نام ملتا ہے۔ لیکن یہ مرقع جو ہمیں برٹش میوزیم لندن سے ملا ہے، اس کے شروع کے اوراق میوزیم کے نسخے میں نہیں ہیں جن میں مجموعے کا نام ملتا۔

اس کے علاوہ یہ نسخہ مخلص کے معاصرین کی اپنے ہاتھ کی تحریروں کا مرقع ہے، تصویروں کا مرقع نہیں، یعنی ہماری آج کل کی اصطلاح میں آٹوگراف بک یا آٹوگراف البم ہے اور اس سے مخلص کے اَدبی ذوق اور جدّت پسندی کا ثبوت ملتا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں وہ چیز مرتب کر دی جس کا خیال عصر حاضر میں بھی کم ہی آتا ہے۔ مخلص کی تالیفات کی فہرست میں 'مرقع تصویر' کے ساتھ مخلص کی تالیف 'پری خانہ' کا نام بھی آتا ہے جسے 'مرقع تصویر' کا دیباچہ تصوّر کیا گیا ہے[2] ایشیا

---

[1] و [2] آنند رام مخلص، سفرنامۂ مخلص، بتصحیح و مقدمہ ڈاکٹر سید اظہر علی، ہندوستان پریس، رامپور، ۱۹۴۶ء، ص، ۵۸، نیز ڈاکٹر سید عبداللہ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۱۱۴ تا ص ۱۱۶، نیز ایوانوف، فہرست کرزن کلیکشن، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال لائبریری، شمارہ کتاب ۱۵۶

ٹک سوسائٹی آف بنگال کے فہرست نگار نے 'پری خانہ' اور 'مرقع تصویر' کے جو کوائف بیان کیئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخلص کا یہ مرقع جو ہم پیش کر رہے ہیں اس کے مندرجات بالکل مختلف نوعیت کے ہیں۔ یہ چیز انہیں نہیں ملی۔ وہ مخلص کے اس مرقع سے واقف بھی نہیں ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم نے واضح ثبوت پیش کیا ہے کہ زیر نظر 'مرقع'، مخلص کا ایک مستقل جداگانہ مجموعہ ہے۔

مرقع مخلص' کا یہ نادر و نایاب قلمی نسخہ گردش زمانہ کا شکار ہو کر نہ جانے کہاں کہاں گھومتا رہا۔ کسی کو اس کا علم تک نہ ہو سکا۔ پھر نہ جانے کس طرح یہ نسخہ برٹش میوزیم لندن کے شعبۂ مشرقی کے کتب خانے میں پہنچ گیا اور اب اسی کتب خانے کی زینت ہے، لیکن اس کا علم کسی کو نہیں۔

میں نے جس وقت ۱۹۶۶ء میں اس نادر قلمی نسخے کو دیکھا اس وقت اس کا ذکر برٹش میوزیم کی کسی فہرست مخطوطات میں نہیں تھا۔ اس زمانے میں فارسی مخطوطات کی کیٹلاگ کے ساتھ میوزیم میں فارسی اور اردو مخطوطات کی ایک ٹائپ کی ہوئی فہرست تھی۔ اس میں اس نسخے کا بھی ذکر تھا، لیکن اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں تھی۔ صرف اتنا لکھا تھا کہ یہ آنند رام مخلص کی جمع کی ہوئی چند تحریروں کا مجموعہ ہے۔ بظاہر اس تحریر سے یہ کوئی اہم نسخہ معلوم نہیں ہوتا تھا، لیکن جب میں نے اس کو نکلوا کر دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک بیش بہا خزانہ میرے ہاتھ آگیا ہے، کیونکہ اس میں ایسے لوگوں کی نادر و نایاب تحریریں یک جا تھیں جو اپنے زمانے کے مشہور

ومعروف لوگ تھے اور دُنیائے ادب وشعر میں جن کا مرتبہ مسلم تھا۔ ان کی تحریریں سوائے اس مجموعے کے دُنیا میں کہیں اور محفوظ نہیں۔

اس قلمی نسخے کی اہمیت کے پیشِ نظر مجھے لندن ہی میں یہ خیال آیا تھا کہ اس نسخے میں جو نادر و نایاب تحریریں جمع ہیں، ان کا عکس شائع کرنا مُناسب ہوگا تاکہ یہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیں۔ وہ ہر شخص کی دسترس میں ہوں، وہ اُن سے استفادہ کر سکے اور لُطف اندوز ہو سکے۔ چنانچہ میں نے ۱۹۶۸ء میں لندن سے لاہور واپس آکر اس کی طباعت کا منصوبہ بنایا، لیکن بعض مصروفیتوں اور مجبوریوں کے باعث اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت جلد نہ آسکی۔ اب سات آٹھ سال کے بعد اس کو شائع کیا جا رہا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ مخلص کی جمع کی ہوئی عہد محمدؐ شاہی کی اہم شخصیتوں کی یہ تحریریں تاریخ، تہذیب اور ادب و شعر سے دلچسپی رکھنے والوں کو بیش بہا خزانہ معلوم ہوں گی اور وہ اس نئی ادبی دریافت سے نہ صرف لُطف اندوز ہوں گے، بلکہ ان تحریروں میں جو نئی معلومات ہے، ان سے اپنے تحقیقی کاموں میں استفادہ بھی کریں گے۔

(۲)

آنند رام مخلص اپنے عہد کی ایک اہم ادبی شخصیت تھے۔ اُنھوں نے فارسی زبان اور اَدب میں ایک اہم مقام پیدا کیا۔ اُردو شاعری سے بھی اُنہیں دلچسپی تھی، اور وہ اس زبان میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے شاعر، نثر نگار اور انشا پرداز تھے۔ ان کا شمار اپنے

زمانے کے مشہور اُمرا اور رؤسا میں ہوتا تھا اور وہ عہد مغلیہ کے ایک اہم منصب دار کی حیثیت سے خاصی اہمیت رکھتے تھے۔ لیکن ان کی زیادہ دلچسپی ادب و شعر میں تھی۔ ان کا زیادہ وقت ادبی مشاغل میں گزرتا تھا۔ اپنے زمانے کی اہم ادبی شخصیتوں سے اُنہیں قرب حاصل تھا اور وہ سب کے سب مخلص کو ایک اعلیٰ درجے کا شاعر، ادیب اور انشا پرداز سمجھتے تھے۔

فارسی اور اُردو شعرا کے تذکروں میں ان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے کہ بہ حیثیت ایک انسان، ایک دوست، ایک ادیب اور ایک شاعر کے ان کے ہم عصر ان سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ فارسی اَدب کی تاریخوں میں بھی ان کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا گیا ہے اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فارسی ادب کی روایت میں ان کا ایک خاص مرتبہ ہے اور وہ اپنے زمانے کے فارسی ادب کی ایک اہم شخصیت تھے۔

غلام علی آزاد نے خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے:

"مخلص، آنند رام از قوم چھتریاں است کہ ریاست اہل ہند از قدیم الایام بایں گروہ تعلق دارد۔ وطن آباء او سودھرہ از نوابح لاہور است۔ خود در شاہجہان آباد بسر می برد ضابطۂ ہند است کہ در دربار سلاطین از امراء غائب وحاضر کلاء می باشند۔ آنند رام در دربار بادشاہی وکیل اعتماد الدولہ قمرالدین خان وزیر فردوس آرام گاہ و نیز وکیل سیف الدولہ عبدالصمد ناظم صوبۂ لاہور و ملتان بود و رائے رایان خطاب داشت۔

خان آرزو در مجمع النفائس می نویسد: "باعث بودن فقیر، در شاہجہان آباد دہلی اخلاص اوست"۔[1]

مصحفی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مخلص، آنند رام مخلص قوم کھتری متوطن لاہور وکیل زکریا خان ملازم نواب اعتماد الدولہ وزیر، مرد فربہ و مالدار بود و در وکیل پورہ عمارت ہائے عالی شان و نظر فریب چون مرقع تصویر داشت۔ در ابتدا شاگرد مرزا بیدل و بعد ازان بہ خان آرزو رجوع آوردہ و مراعات بسیارے نسبت بہ خان مذکور کردہ۔ دیوانش از نظر فقیر گذشت شعر ہای رنگین و آبدار دارد"۔[2]

اور میر تقی میر نے نکات الشعرا میں مخلص کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

رائے آنند رام

مخلص تخلص مشہور، از شاہجہان آباد ست، وکیل نواب وزیر اعتماد الدولہ مغفور و مرحوم۔ شاعر متقرر فارسی۔ در عنفوانِ جوانی مشق سخن بخدمت مرزا بیدل می کرد۔ درین ایام اشعار خود را از نظر خان صاحب سراج

---

[1] آزاد بلگرامی، خزانۂ عامرہ، مطبع نولکشور، کانپور، طبع دوم، ۱۹۰۰ء، ص ۴۲۵۔

[2] مصحفی، عقد ثریا، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۴، ص ۵۳۔

الدین علی خان می گذرانید۔ از مدتے آزار نفث الدم داشت۔ قریب یک سال است کہ در گذشت۔ احوالش در تذکرۂ خان صاحب مذکور مفصل مسطور است۔

دھوم اونے کی کس کے گلزار میں پڑی ہے
ہاتھ ار گجے کا پیالہ نرگس لئے کھڑی ہے[1]

نکات کا سال تالیف ۱۱۶۰ھ ہے۔ اس حساب سے مخلص کا انتقال ۱۱۶۴ھ میں ہوا۔ قدرت کے تذکرہ نتائج الافکار، مطبوعہ بمبئی ص (۶۶۱) میں انتقال کا سال ۱۱۴۰ھ درج ہے جو صریحاً غلط ہے۔ مخلص کے دوسرے معاصر آزاد بلگرامی (خزانہ عامرہ، سابق الذکر) نے یہی سال بتایا ہے۔

احمد علی سندیلوی نے مخزن الغرائب میں مندرجۂ ذیل معلومات فراہم کی ہے:

"رائے آنند رام مخلص تخلص، وے از اعیان چھتریان است۔ بہ صیغۂ وکالت نواب اعتماد الدولہ قمرالدین خان بہادر و نواب خان بہادر نورالدین خاں گوپاموی کہ ناظم صوبۂ ارکات دکن بودہ در حضور محمد شاہ بادشاہ شرف اندوزی داشت۔ بسبب چاقی و فربہی از مجرای بادشاہ باز ماندہ شخصے را بجای خود مقرر کردہ در خانۂ خود بہ عیش و طرب مشغول گردید۔ در شعر تلمذ از مرزا بیدل داشت۔ بعد از ان

---

[1] میر تقی میر، نکات الشعراء، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء ص ۸، ۹

اشعار خود را از نظر خان آرزو گذرانیده۔ خانہ اش در شاہجہان آباد مسکن فضلا و شعرا بودہ۔ این چند شعر از روانی طبع او راست“۔ [1]

سراج الدین علی خان آرزو مجمع النفائس میں لکھتے ہیں:

”رائے رایان آنندرام مخلص از اعیان چھتریاں است کہ رئیس اہل ہند انداز حسن اخلاص و آدمیت و وفایش تا کجا نوشتہ آید۔ باعث بودن فقیر آرزو در شاہجہان آباد دہلی اخلاص اوست۔ از مدت سی و سہ سال تا الیوم سررشتہ کمال محبت و مودت را از دست ندادہ۔ در عنفوان اشعار خود از نظر مرزا عبدالقادر بیدل مرحوم گذرانید۔ از آن زمان با این عاجز محشور و مربوط است۔ الغرض درین جز و زمان از منتخبات روزگار است۔ در فن شعر و انشا کتب متعددہ دارد، اشعارش نہایت مرغوب است چنانکہ بعد مطالعہ احوال آن بر سخن فہم ظاہر می شود“۔ [2]

عشق عظیم آبادی کے تذکرۂ نشتر عشق میں ہے:

مخلص، آنندرام: ولد راجہ ہردے رام قوم چھتر لیست کہ ایالت ہندوستان از آغاز حال حصہ این گروہ شجاعت شعار است ساکن

---

[1] احمد علی، مخزن الغرائب، قلمی، (پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور، شمارہ ۲۵۳۲/۱۴۸۲) ورق ۳۲۸

[2] سراج الدین علی خان آرزو، مجمع النفائس، قلمی، (پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور، شمارہ ۱۴۸۹)، ورق ۳۵۱

سودھرہ من توابع لاہور بود۔ میاں قوم ھنود با خوش نگھان سخن الفت و با پریزادان معنی محبت و اخلاصی داشت۔ در فارسی روش مخصوص بدست آوردہ فکر نظم را بجد اعتدال رسانیدہ چنانچہ نسیم تخلص سید غلام نبی امروہی در حق او گوید:

آن سپہر سخنوری مخلص
فخر عرفی و انوری مخلص

و آوردہ کہ از گروہ ہنود برابر فکر او درین زمان کسی نیست۔ در شاہجہان آباد اقامت داشت و بوکالت نواب اعتماد الدولہ قمرالدین خان دستور محمد شاہی بحضور سلطان حاضر می بود و از حضور بادشاہ بخطاب (رائے) رایان سر تفاخر می افراشت۔ بیشتر فکر کلام خود را از نظر اصلاح عبدالقادر بیدل درست می نمود و من بعد آن بصحبت خان آرزو اکثر بسر می برد چنانچہ بترجمہ آرزو اشارہ ازین معنی رفت۔ وفات مخلص بعارضہ نفث الدم در سنہ یکہزار و یکصد و شصت و چار واقع شد۔ دیوانش باقسام شاعری بدہ ہزار بیت نشان می داد۔ از وست:

میازار ای محبت بازچون من ناتوانے را
غریبے دردمندے بیکسے آزردہ جانے را الخ[1]

اس کے بعد نشتر عشق میں تقریباً ۳ صفحات پر مخلص کے فارسی اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ احوال حیات کا تذکرہ صرف انہی سطور میں ہے

---

[1] آقا حسین علی خان عشق عظیم آبادی، نشتر عشق قلمی، (پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور، شمارہ APF ۱۵ I) حصہ ۲: ورق ۲۳۱

جو اُوپر نقل کردی گئی ہیں۔

انیسویں صدی کے تذکرہ نگار بھی مخلص کی اہم شخصیت اور ادبی حیثیت کے بارے میں اس کے معاصرین کے ساتھ متفق اللفظ ہیں، چنانچہ نتائج الافکار کے مؤلف نے لکھا ہے:

"شاعر شیریں کلام رای رایان آنند رام کہ مخلص تخلص میکند از قوم چھتریان است کہ از قدیم الایام فرقہ ایشان اہل حکومت و ریاست در ہند شدہ آمدہ اند۔ وطن اصلی او سودھرہ از متعلقات لاہور است و وی در شاہجہان آباد میگذرانید۔ دستور ہند است کہ در بارگاہ سلاطین از طرف امرا وکلا می باشند مخلص بہ دربار پادشاہی بہ وکالت اعتماد الدولہ قمر الدین خان وزیر محمد شاہ پادشاہ و سیف الدولہ عبد الصمد خان ناظم صوبۂ لاہور و ملتان مأمور بودہ و بہ خطاب رای رایان سرفرازی داشت۔ طبع موزونش بہ ادابندی مضامین تازہ دمساز است و کلام دردانگیزش بہ فصاحت ہمراز۔ خان آرزو در مجمع النفائس نوشتہ "باعث بودن فقیر در شاہجہان آباد دہلی اخلاص اوست۔ از مدت سی سال تا الیوم سر رشتہ کمال محبت و مودت را از دست نداده۔ در عنفوان جوانی اشعار خود را از نظر میرزا بیدل مرحوم گذرانیده از آن زمان باین عاجز محشور و مربوط است۔ الغرض درین جزو زمان از منتخبان روزگار است انتھی"۔[1]

---

[1] قدرت اللہ گوپاموی، نتائج الافکار، طبع بمبئی، ۱۹۶۷ء، ص ۶۶۱،۶۶۰

لیکن فارسی اور اُردو شعرا کے تذکروں میں مخلص کے متعلق صرف اتنی ہی معلومات موجود ہے۔ فارسی ادب کی تاریخ لکھنے والوں نے مخلص کے بارے میں لکھتے ہوئے انہی تذکروں کو پیشِ نظر رکھا ہے، اس لئے وہ اس پر کچھ اضافہ نہیں کر سکے ہیں۔

مخلص کے حالات کی تفصیل تو خود ان کی تحریروں سے معلوم ہوتی ہے۔ اگر مخلص کے آبا و اجداد، ان کے خاندان ان کی منصبی مصروفیات، ان کی ادبی دلچسپیاں، ان کے احباب اور ان سے ان کے تعلقات اور ان کے خیالات و نظریات، ان سب کی تفصیل معلوم کرنی ہو، تو وہ ان کی تصانیف: چمنستان مخلص، بدائع وقائع، مرآة الاصطلاح، رقعات، انشائے آنند رام اور مخلص کے اس مرقع سے معلوم ہو سکتی ہے۔

(۳)

بہر حال مختلف تذکروں، ادبی تاریخوں اور خود مخلص کی تحریروں سے جو معلومات ان کے متعلق فراہم ہوتی ہے وہ مختصراً یہ ہے کہ آنند رام مخلص اپنے زمانے کی اہم شخصیت تھے۔ ان کا اصل وطن سودھرہ (لاہور) تھا۔ وہ قوم کے کھتری یا چھتری تھے۔ ۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ اپنی تالیف مرآة الاصطلاح، میں اُنہوں نے اپنی عمر پینتالیس سال بتائی ہے۔ یہ کتاب ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء کی تالیف ہے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق اُنہوں نے ابتدا ہی سے فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی اور اس زبان کے شعر و ادب میں وقت کے ساتھ ساتھ اتنی دلچسپی کا اظہار کیا کہ وہ خود اس زبان کے ادیب اور انشا پرداز بن گئے۔

مُرقع مخلص، کے قلمی نسخے میں آنند رام مخلص کے والد راجہ ہردے رام[1] دادا رائے گجپت رائے، چچا دیا رام اور ان کے ایک بزرگ راجہ پرس رام کی جو تحریریں شامل ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا خاندان مشہور و معروف لوگوں کا خاندان تھا۔ ان کے بزرگ اچھی زندگی بسر کرتے تھے اور فارسی زبان، ادب اور دوسرے علوم سے اُنہیں دلچسپی تھی۔ مجموعۂ نغز (جلد دوم ص ۱۷۶)[2] سے پتہ چلتا ہے کہ مخلص کے چچا باپ اور دادا امرا کی سرکاروں اور شاہی درباروں میں وکیل تھے۔ مخلص نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا۔ بہرحال مخلص نے اس خاندان کے ماحول میں آنکھ کھولی اور اس ماحول نے ان کے دل میں علم و ادب کی ایسی شمعیں فروزاں کیں کہ اُنہوں نے اس زمانے کے شعر و ادب میں ایک مقام پیدا کر لیا۔ یہاں تک کہ اُن کے معاصرین میں سے بڑے بڑے عالموں اور انشا پردازوں نے ان کی

---

[1] چارلس ریو نے برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں آنند رام مخلص کے والد کا نام غلطی سے مردے رام لکھ دیا ہے۔ انڈیا آفس کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں اُنہوں نے جہاں مخلص کا ذکر کیا ہے وہاں بھی یہی غلطی ہوئی ہے۔ مرقع مخلص میں لالہ ھردے رام کی کئی تحریریں ہیں۔ ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مخلص کے والد کا نام ھردے رام تھا، مخلص کی تالیف بدائع وقائع (ص ۳۰) سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کتاب میں مخلص نے اپنے والد کا نام "راجہ ھردے رام" لکھا ہے۔

[2] میر قدرت اللہ قاسم، مجموعۂ نغز، مرتبہ پروفیسر محمود شیرانی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۳۳ء۔

اہمیت کو تسلیم کیا اور اُن کے بارے میں اچھی رائے ظاہر کی۔

مخلص کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتی۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں انہیں مختلف کھیلوں سے دلچسپی تھی اور خصوصیت کے ساتھ گنجفہ کے تو وہ بہت ہی دلدادہ تھے۔ اور ان کا یہ شوق اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس سے دوسرے مشاغل متاثر ہونے لگے تھے۔ اسی خیال سے ان کے والد لالہ ھردے رام نے اُنہیں سختی سے منع کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ لالہ ھردے رام علمی اَدبی مزاج رکھتے تھے، اور اُنہیں یہ بات پسند نہیں تھی کہ ان کے بیٹے کا وقت اس قسم کے کھیلوں میں ضائع ہو۔ بہر حال ان کی فہمائش کا خاطر خواہ اثر ہوا، اور مخلص نے گنجفہ وغیرہ کو ترک کر دیا۔ مخلص کی مختلف تحریروں میں اس واقعے کا ذکر ملتا ہے۔ اس لئے اس کی صحت میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

اس واقعے کے بعد مخلص نے زیادہ توجہ شعر و شاعری کی طرف کی۔ ان کے گھر میں بھی شعر و ادب کا ماحول تھا اور باہر بھی شعر و شاعری کے چرچے تھے۔ اس لئے ان کا شعر و ادب کی طرف توجہ کرنا ایسا کچھ عجیب نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ آس پاس اور گرد و پیش کے ماحول ہی کا یہ اثر تھا کہ وہ پوری طرح ایک ادبی مزاج کے انسان بن گئے اور اپنی منصبی مصروفیات کے باوجود ان کا زیادہ وقت شعر و ادب کے مشاغل میں صرف ہونے لگا۔ تذکرے اس پر متفق ہیں کہ اُنہوں نے شروع میں مرزا عبدالقادر بیدل سے اصلاح لی اور بعد میں جب سراج الدین علی خان آرزو دلی آ گئے تو ان سے اصلاح لینے لگے۔ خان آرزو اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم شعر و ادب تھے۔ اس لئے مخلص سے ان کے تعلقات میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ اسی لئے تو

خان آرزو نے مجمع النفائس میں واضح طور پران چند جملوں میں، جو ہم اس سے پہلے بھی نقل کر چکے ہیں، بہت کچھ کہہ دیا ہے:

"باعث بودن فقیر آرزو در شاہجہان آباد دہلی اخلاص اوست۔ از مدت سی و سہ سال تا الیوم سر رشتہ کمال محبت و مودت را از دست نداده۔ در عنفوان شباب اشعار خود را از نظر مرزا عبدالقادر بیدل مرحوم گذرانید۔ از آن زمان با این عاجز محشور و مربوط است"۔[1]

جیسا کہ اس بیان سے ظاہر ہے مخلص خان آرزو کے نہ صرف شاگرد تھے بلکہ ان کے محبت اور مودت کے رشتے میں منسلک تھے۔ خان آرزو کے علاوہ اس زمانے کی دوسری اہم ادبی شخصیتوں کے ساتھ بھی اُنہیں بڑی محبت تھی، اور وہ ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ قزلباش خان اُمید، شیخ علی حزین، شرف الدین پیام وغیرہ کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور ان کے ساتھ وہ اچھا وقت گزارتے تھے اور انہی صحبتوں نے انہیں ادبی شخصیت کا انسان بنا دیا تھا۔ اس کی تفصیل جگہ جگہ مخلص کی مختلف تحریروں میں ملتی ہے اور ان کے اس قلمی نسخے "مرقع مخلص" میں ان کی اور ان کے ہم عصروں کی جو تحریریں شامل ہیں، ان سے تو اس کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔

آنند رام مخلص کی زندگی کا بیشتر حصّہ سرکاری ملازمت میں گزرا۔ وہ مغلوں کے دور آخر میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ زیادہ وقت اُنہوں

---

[1] خان آرزو: مجمع النفائس (قلمی)، سابق الذکر

نے بہ صیغۂ وکالت نواب اعتماد الدولہ قمرالدین خاں اور نواب خان بہادر نورالدین خان کے ساتھ گزارا۔ انھی کی وساطت سے ان کی رسائی محمّد شاہی دربار میں ہوئی تھی اور وہ اپنے زمانے کے اہم اُمرا اور رؤسا میں شمار کئے جاتے تھے۔

مخزن الغرائب کے اقتباس میں یہ ذکر آچکا ہے:

"بہ صیغۂ وکالت نواب اعتماد الدولہ قمرالدین خاں بہادر و نواب خان بہادر نورالدین خاں گوپاموی کہ ناظم صوبہ ارکات دکن بودہ در حضور محمّد شاہ بادشاہ شرف اندوزی داشت"[۱]

خزانۂ عامرہ کے اقتباس میں جو پہلے آچکا ہے اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

ضابطۂ ہنداست کہ در دربار سلاطین از اُمرا، غائب و حاضر وکلا، می باشند۔ آنند رام در دربار پادشاہی وکیل اعتماد الدولہ قمرالدین خان وزیر فردوس آرامگاہ و نیز وکیل سیف الدولہ عبدالصمد ناظم صوبۂ لاہور و ملتان بود و رای رایان خطاب داشت"[۲]

مخلص کی تالیفات 'بدائع'، (ص ۳ و بعد) اور 'مرآۃ الاصطلاح' میں ان کے دادا کا نام رائے گجپت آیا ہے۔ اس ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا بڑے بارسوخ آدمی تھے۔ امیرالامرا صمصام الدولہ کے والد

---

[۱] خان آرزو: مجمع النفائس (قلمی) سابق الذکر

[۲] ایضاً۔

ان کی کوششوں سے امارت کے منصب پر فائز ہوتے تھے اور رائے
گجپت رائے ہی اس کا ذریعہ بنے تھے کہ ان کی شادی روح اللہ خان کی بیٹی
مریم بیگم سے ہوئی۔ یہ پہلے بادشاہ زادہ عظیم الشان کی زوجیت میں تھیں۔
'بدائع وقائع' سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رائے گجپت وکیل کی حیثیت
سے اسد خان وزیر اور امیر بخشی ذوالفقار خان بہادر کی سرکار سے بھی وابستہ
رہے تھے۔ اسی طرح مخلص کے والد کا بھی بڑا رسوخ تھا، چنانچہ مخلص
نے "بدائع وقائع" میں اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ ان کے والد نے صمصام الدولہ
کو شاہی دربار سے پچاس ہزار روپیہ دلوایا اور انہی کی سفارش پر امیر الامرا
صمصام الدولہ احمد آباد کے صوبہ دار بنائے گئے۔[1]

بہرحال مخلص دلی میں اچھی زندگی بسر کرتے تھے۔ حکومت وقت کے
اہم لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اعتماد الدولہ ان پر بہت بھروسہ کرتے
تھے اور وہ ان کے مزاج میں دخیل تھے۔ مرقع مخلص کے اس قلمی نسخے کی
بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزمرہ کی معمولی باتوں تک میں مخلص
کا مشورہ ضروری سمجھا جاتا تھا۔ محمّد شاہ کے دربار میں بھی انہیں باریابی کا
شرف حاصل تھا، لیکن فربہی کے باعث انہوں نے ایک شخص کو دربار میں
جانے کے لئے مقرر کر دیا تھا، خود کم جاتے تھے۔

'سفرنامۂ مخلص' مخلص کے سفر بن گڑھ کی سرگذشت ہے۔ اس
سرگذشت میں بنیادی حیثیت اس جنگ کے چشم دید حالات کی ہے جو محمّد
شاہ بادشاہ دہلی اور نواب سید علی محمّد خاں کے درمیان ہوئی جو بادشاہ کی

---

[1] بدائع وقائع، ص ۳۰، و بعد، حوالہ از سفرنامۂ مخلص، سابق الذکر۔

طرف سے آنولے کے عامل تھے۔ آنولہ روہیلکھنڈ میں بریلی اور نواح کے علاقے کا مستقر حکومت تھا۔ اس موقع پر نواب علی محمد خاں بن گڑھ جاکر وہاں کے قلعے میں پناہ گزین ہوگئے تھے۔ بن گڑھ ہمالیہ کے دامن میں شمال ہند کے کوہستانی علاقے گڑھ مکٹیسر میں واقع ہے۔ محمّد شاہ بادشاہ سیر و شکار کا ارادہ ظاہر کر کے اُمرائے لشکر اور افواج کے ساتھ ۲۳ محرم ۱۱۵۸ھ (مطابق ۲۷ فروری ۱۷۴۵) کو دہلی سے روانہ ہوئے۔ رائے آنند رام مخلص بھی منشی دربار اور وقائع نگار کی حیثیت سے ہم رکاب تھے۔ قلعہ بن گڑھ کا محاصرہ کیا گیا اور چار مہینے تک جنگ جاری رہی جو اسی سال اساڑھ (جون جولائی) کے مہینے میں نواب کی شکست پر ختم ہوئی۔ یہاں جنگ کے حالات کو چھوڑ کر مخلص کی سوانح حیات سے متعلق معلومات میں یہ اضافہ کرنا مقصود ہے کہ مخلص کے دو بیٹے رائے کرپا رام اور رائے فتح سنگھ بھی جو شاہی دربار سے وابستہ تھے شاہی لشکر کے ہمراہ تھے اور اس موقع پر اُنہوں نے نامہ نگاری اور نامہ رسانی کے فرائض انجام دیئے۔ پہلے مخلص کا خیال تھا کہ اس مہم پر ان کے دونوں صاحبزادے ہی جائیں اور وہ خود دہلی میں مقیم رہیں لیکن پھر شفقت پدری سے مجبور ہو کر خود بھی گئے۔ بیٹوں کی جُدائی گوارا نہ کر سکے۔ اس واقعے سے خانگی زندگی میں ان کے اخلاق اور احساسات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس مقام پر ان کے قلم سے جو جُملے نکلے ہیں ان کا یہاں نقل کرنا اہمیت رکھتا ہے، اس لئے کہ اس عبارت سے ان کی شخصیت اور کردار کا ایک اور اہم پہلو روشنی میں آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"راقم حروف اول نزدیک خود معقول کردہ بودم کہ خود در

شہر متوقف باشم و نور چشمان عزیز تر از جان کامگار رای کرپارام و رای فتح سنگھ کہ بفضل الٰہی چنانچہ باید آگاہ و ہشیار واز معاملات دربار معلی واقف و خبردار اند در رکاب سعادت باشند، زیراکہ این سفر اگر ہمین تا گڑھ مکٹیسر است سیر و شکارے بیش نیست، چہ ہر سال اکثرے از اہل دہلی در ماہ کاتک بتقریب غسل دریای گنگ بشوق تمام میروند و در آنجا محوز اقسام ہنگامہ آرائی و نشاط پیرائی میشوند، چنانچہ در باب تیاری ساز و سامان ہمراہی ایشان بہ ارباب کار تنقید کردہ شد۔ شبے بخاطر گذشت اینکہ بجای خود خیال کردہ ام کہ در شہر باید بود قرین مصلحت نیست، چہ یکے خود از جُدائی نور چشمان کہ مانند نور دیدہ ہیچگاہ از پیشِ نظر دور نبودہ اند الم خواہم کشید، دویم چون گاہی از رکاب خداوند نعمت جدا نماندہ ام، درین وقت کہ احتمال زد و خورد ے درمیانست، چہ مناسب کہ متہم بہ خودداری باید گردید، ارادۂ سفر مصمم ساختم و بہ سرانجام اسباب و لوازم یساق پرداختم"۔[1]

یہاں ایک اور دلچسپ بات جو مخلص کے والہانہ علمی اور ادبی شغف پر مزید روشنی ڈالتی ہے وہ یہ ہے کہ اس فوجی مہم اور محاذِ جنگ پر روانگی میں بھی مخلص کے سامان سفر میں ان کا کتب خانہ ان کے ساتھ تھا جس کے لئے اُنھوں نے دو سو چالیس روپے کو ایک خچر خاص طور پر خریدا

---

[1] سفرنامۂ مخلص، سابق الذکر، ص ۵ و ۶۔

تھا اور کتابوں کے صندوقچے اس پر لاد کر ساتھ لے گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سوای باربرداری کہ داشتم سہ شتر بہ سی صد و سی روپیہ ویک جوڑی گاو گجراتی برای رتھ بہ چہار صد و پنجاہ روپیہ ویک استر بہ دو صد و چہل روپیہ جہت صندوقچہ ھای کتاب خانہ خرید نمودم وتا ھمگی ساز و سامان ترتیب نیافت یک دم نیاسودم"[1]

یہاں ضمناً یہ اشارہ ضروری ہے کہ مندرجہ بالا پہلے اقتباس میں 'خداوند نعمت' سے اعتماد الدولہ قمرالدین خاں مراد ہیں جن کے والد محمد امین کی سرکار سے مخلص کے والد راجہ ھردے رام وکیل دربار کی حیثیت سے وابستہ تھے (دیکھئے حاشیہ ڈاکٹر اظہر علی، سفرنامۂ مخلص، ص ۶)

جو باتیں ہم مخلص کی دوسری تصانیف کے سلسلے میں اس کے اسلوب نگارش اور مضامین تحریر کی خصوصیات سے متعلق لکھ چکے ہیں، یعنی مقامی زندگی کے جزئیات اور فارسی زبان میں استعمال ھند، وہ اس سفرنامے میں بھی پوری طرح نمایاں ہیں۔

مخلص کی تصانیف نظم و نثر حسب ذیل بتائی گئی ہیں[2]:

(۱) گلدستۂ اسرار (۲) بدائع وقائع (۳) مرآت اصطلاحات/مرآۃ

---

[1] سفرنامۂ مخلص، سابق الذکر، ص ۶

[2] سفرنامۂ مخلص، سابق الذکر، ص ۳۹، نیز ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، سابق الذکر۔

الاصطلاح (۴) سفرنامۂ مخلص (۵) رقعات مخلص (۶) چمنستان (۷) ہنگامۂ عشق (۸) کارنامۂ عشق (۹) پری خانہ (۱۰) مرقع تصویر (۱۱) دیوانِ فارسی (۱۲) رُباعیات فارسی (۱۳) بیاض منتخب اشعار پر مشتمل (۱۴) روزنامچہ احوال۔

گلدستۂ اسرار: مخلص نے اس مجموعے میں وہ خطوط جمع کئے تھے جو نادرشاہ کی طرف سے ہندوستان کے امور کے متعلق صوبہ دار کابل کے نام آتے تھے۔

صوبہ دار یہ خطوط مخلص کو بھیج دیتا تھا۔ مخلص محمدؐ شاہ بادشاہ کے وزیراعظم کی وساطت سے اُنہیں بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیتے تھے پھر یہ خطوط شاہی احکام کے ساتھ مخلص کے پاس تعمیل کے لئے بھیج دیئے جاتے تھے۔ مخلص ان کی نقلیں اپنے پاس رکھ کر اصل خطوط متعلقہ محکموں کو بھیج دیا کرتے تھے۔ یہ مجموعہ مرتب ہو گیا، تو مخلص نے اس کا ایک دیباچہ بھی لکھا اور ان خطوں سے فارسی اصطلاحات جمع کر کے اپنی فرہنگ مرآۃ الاصطلاح میں شامل کر لیں۔

غرض مخلص دلی میں شاہانہ انداز سے رہتے تھے۔ ان کا مکان اپنی آرائش و زیبائش کے لئے مشہور تھا۔ اس میں وہ عیش و طرب کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کے آس پاس عالموں، فاضلوں اور شاعروں کا مجمع رہتا تھا اور ان کی حیثیت اس وقت کے ادبی ماحول میں ایک شمع انجمن کی تھی۔ مخلص کا انتقال ۱۱۶۴ھ میں ہوا۔

مخلص صحیح معنوں میں ایک ادبی شخصیت کے انسان تھے۔ ان کا زیادہ وقت تصنیف و تالیف اور ادبی تخلیق کے کاموں میں گزرتا تھا۔ اس

لئے اُنھوں نے متعدد ایسی تصانیف چھوڑی ہیں جو نہ صرف اَدبی اور شعری لحاظ سے بلکہ تاریخی، معاشرتی، تہذیبی اور لسانی اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہیں۔

اپنی ادبی زندگی کا آغاز مخلص نے شاعری سے کیا تھا۔ ساری زندگی تخلیق شعر کا یہ سلسلہ جاری رہا چنانچہ ایک ضخیم دیوان تیار ہوگیا۔ اس دیوان کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ میں بھی اس کا ایک نسخہ تھا۔ ابھی تک مخلص کا یہ دیوان شائع نہیں ہوا دیوان کے علاوہ رُباعیات کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے جو خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے (مجموعہ شیرانی) میں محفوظ ہے۔ یوں تو مخلص کی نثری تصانیف (۱) مرآۃ الاصطلاح (۲) بدائع وقائع (۳) رقعات (۴) ہنگامۂ عشق (۵) پری خانہ (۶) سفرنامہ (۷) چمنستان (۸) روزنامچہ احوال سب اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں، اور ان میں ُمراۃ الاصطلاح، اور ُبدائع وقائع، کو کئی اعتبار سے منفرد حیثیت حاصل ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ابھی تک مخلص کی بیشتر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں، اور جو شائع ہوئی ہیں ان کو صحیح طور پر مختلف نسخوں سے مقابلہ کرکے مرتب نہیں کیا گیا ہے۔ ان پر باقاعدہ تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ سب کی سب ہماری تاریخ، تہذیب، معاشرت اور شعروادب کی مختلف خصوصیات کا آئینہ ہیں۔ اب تک ُسفرنامۂ مخلص، کو جدید اُصولوں کے مطابق مرتب کرکے شائع کیا گیا ہے۔

ُمرآۃ الاصطلاح‘ ۱۱۵۸ھ کی تصنیف ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی موجود ہے۔ یہ دراصل فارسی کی ایک لُغت ہے

جس کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ محاورات اور امثال وغیرہ کا بھی اس میں ذکر ہے۔ مطالب کو واضح کرنے کے لئے مخلص نے مختلف شعراء کی اَسناد بھی پیش کی ہیں، اور خاص طور پر اپنے ہم عصروں کو اس سلسلے میں اہمیت دی ہے۔ چنانچہ سراج الدین علی خان آرزو، سعید اشرف فصاحت، علی خان راضی، شرف الدین پیام، شیخ علی حزین، مرزا صائب، مرزا نجات، اور رضی دانش وغیرہ کے اشعار کے حوالے اس میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔ یہ کتاب اس اعتبار سے بھی دلچسپ ہے کہ اس میں خود مخلص اور ان کے ہم عصروں کے حالات، مخلص سے ان کے تعلقات، اس زمانے کے سیاسی، تاریخی اور تہذیبی حالات اور اس عہد کے متعلق مُفید معلومات کا بھی گراں قدر ذخیرہ موجود ہے۔

'بدائع وقائع' بھی مخلص کی اہم تصنیف ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہے۔ باڈلین، آکسفورڈ، علی گڑھ اور بانکی پور میں بھی اس کے بعض حصّوں کے قلمی نسخے ملتے ہیں۔ ابھی تک یہ کتاب باقاعدہ طور پر مرتب نہیں کی گئی۔ اس کے بعض حصّوں کا ترجمہ انگریزی میں شائع ہو چکا ہے۔ مگر کامل کتاب کسی کے پیشِ نظر نہ تھی۔ اس لئے کتاب کا پورا حال اب تک سامنے نہیں آیا۔ الیٹ اور اسٹوری نے ترجمے کے لئے جو نسخہ استعمال کیا اس کا نام تذکرہ آنند رام مخلص لکھا ہے مگر خود مصنف نے کتاب کا نام 'بدائع وقائع'

رکھا تھا۔[1] مخلص نے اس کتاب کے مختصر سے دیباچے میں حمد کے بعد لکھا ہے کہ میں ایام بیماری میں ایک دن گوشۂ تنہائی میں بیٹھا تھا کہ مجھ کو خیال آیا کہ اساتذۂ سلف جنہوں نے علمِ تاریخ کی بُنیاد رکھی اُنھوں نے دوسرے لوگوں کے سوانح تو لکھے مگر اپنے احوال کو قلم بند نہ کیا" اگر فقیر بعض حالات خود بقلم آرم، خالی از لُطفے نہ خواھد بود کہ بلکہ بہ تفریح خاطر عاطر ارباب وجد و حال کہ سر خوشان نشان کمال اند خواھد افزود"۔ اس لئے یہ چند اوراق لکھ کر ان کا نام 'بدائع وقائع' رکھا۔ موضوع کے اعتبار سے یہ نہایت دلچسپ کتاب ہے کیونکہ اس میں محمد شاہ اور اس کے عہد کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور ادبی پہلوؤں کی ایسی تفصیلات ملتی ہیں جو کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکتیں۔

'مراۃ الاصطلاح'، اور 'بدائع وقائع' کے ساتھ ساتھ 'رقعات'، 'پری خانۂ چمنستان'، 'ہنگامۂ عشق' اور 'کارنامۂ عشق' بھی خاصی دلچسپ ہیں۔ 'رقعات' کا قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں ہے۔ اس میں وہ خطوط ہیں جو مخلص نے مختلف لوگوں کو لکھے۔ ان سے مخلص کے دوستوں اور ان سے ان کے تعلقات کا علم ہوتا ہے۔ 'پری خانہ' کا قلمی نسخہ کرزن کلیکشن، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال لائبریری میں ہے۔ یہ مخلص کے 'مرقع تصویر' کا دیباچہ ہے۔ یہ نسخہ ۱۱۴۴ھ میں مرتب ہوا۔[2] 'مرقع تصویر' کے مندرجات کے بارے میں

---

[1] پروفیسر مولوی محمد شفیع، اقتباس از بدائع وقائع اورینٹل کالج میگزین شمارہ مسلسل ۱۰، لاہور، ۱۹۴۰ء نیز ڈاکٹر سید عبداللہ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳۲۲، ص ۳۲۴۔

[2] ایوانوف، فہرست کرزن کلیکشن، سابق الذکر۔

ایتھے، ایوانوف اور دوسرے فضلاء کو کچھ الجھن رہی ہے لیکن یہ مسئلہ مخلص کے ہم عصر بندرابن خوشگو کے بیان سے حل ہو جاتا ہے۔ اس بیان کی حیثیت عینی معاصر شہادت کی ہے۔ خوشگو نے اپنے مشہور تذکرے 'سفینۂ خوشگو' میں لکھا ہے:

"دیباچۂ مرقعے نوشتہ کہ بخوبی آن ہیچ دیباچہ بہ نظر نیامدہ این سہ بیت از فکرھای خود برسر تصویرے نوشتہ بود فقیر را وقت سیر مرقع بسیار خوش آمد الخ"

شفیق اورنگ آبادی نے اپنے 'تذکرۂ گل رعنا' میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

بانکی پور کے فہرست نگار نے 'تذکرۂ گل رعنا' کے حوالے سے لکھا ہے کہ جس مرقع کا یہ دیباچہ ہے اس میں دلفریب تصویریں بھی تھیں اور ایران کے مشہور خطاطوں کے نوشتے بھی تھے۔[1] 'چمنستان'، عجائب و غرائب کی کتاب ہے جن کو مخلص نے بڑی محنت اور سلیقے سے یکجا کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۱۵۹ھ میں مرتب ہوئی۔ 'ہنگامۂ عشق' کنور سین کرناٹکی اور رانی چندر پربھا کا افسانۂ عشق ہے۔ مخلص نے یہ افسانہ ۱۱۵۲ھ میں لکھا، جب ان کا قیام شاہجہان آباد دہلی میں تھا۔ 'کارنامۂ عشق' شاہزادہ گوہر اور ملکہ مملوکات کے حسن و عشق کی داستان ہے۔ مخلص نے اس کو ۱۱۴۴ھ میں لکھا۔ یہ دونوں کہانیاں

---

[1] مولوی عبدالمقتدر، فہرست مخطوطات فارسی، خدابخش لائبریری، بانکی پور، ۸: ۱۳۲

ابھی تک نایاب ہیں۔ تذکرے میں مخلص نے نادر شاہ کے حملے کا حال لکھا ہے اور اس میں وہ واقعات درج ہیں جو ہندوستان میں ۱۱۵۰ھ پیش آئے۔ ایلیٹ نے اس کے بعض حصّوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ ہمارا قیاس ہے کہ یہ واقعات مخلص کی کتاب 'گلدستۂ اسرار' کے دیباچے سے لئے گئے ہیں۔ 'مرقع مخلص' میں جو ہم پیش کر رہے ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہا گیا، مخلص کے مختلف ہم عصروں کی وہ تحریریں ہیں اور ان کے خطوں کے وہ نمونے ہیں جن کو مخلص جمع کرتے رہے۔ یہ کتاب آج تک گوشہ گمنامی میں رہی اور کسی کو اس کا علم نہ ہو سکا۔

مخلص کے 'مرقع تصویر' کے بارے میں لکھتے ہوئے کرزن کلیکشن، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے فہرست نگار ایوانوف نے اس کتاب کی تاریخ تالیف ۱۱۴۷ھ بتائی ہے اور اس کے دیباچے 'پری خانہ' میں جو دو تاریخی مادے 'زہے مرقع تصویرھا'، اور 'بے بہا مرقع از تصویر'، درج ہیں ان کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن مخلص کے اس مجموعے کی مختلف تحریروں میں جس کا ہم 'مرقع مخلص' کے نام سے دنیائے ادب میں پہلی مرتبہ تعارف کرا رہے ہیں جو تاریخیں درج ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں :

۱۱۴۱ھ (ورق شمارہ ۲۸ ب، متن)۔

۱۱۴۲ھ (ورق شمارہ ۳۳ ب، بائیں طرف کا حاشیہ)۔

۱۱۴۹ھ (ورق شمارہ ۵۴ ا، دائیں طرف کا حاشیہ)۔

نیز ورق شمارہ ۵۵ ا، دائیں طرف کا حاشیہ)۔

[۱۱۵۲ھ] (= ۲۳ سال جلوس محمد شاہ، ورق شمارہ ۵۰ ا، حاشیہ زیریں)۔

۱۱۵۳ھ (ورق شمارہ ۳۰ ب، بائیں طرف کا حاشیہ)۔
۱۱۵۴ھ (ورق شمارہ ۵۱ ا، بہ ذیل متن،
نیز ورق شمارہ ۵۲ ا، دائیں طرف کا حاشیہ)۔
۱۱۵۴ھ (ورق شمارہ ۱۳ ب، دائیں طرف کا حاشیہ،
نیز ورق شمارہ ۲۳ ا، بائیں طرف کا حاشیہ،
نیز ورق شمارہ ۲۴ ب، دائیں طرف کا حاشیہ)۔
۱۱۵۶ھ (ورق شمارہ ۳۸ ا، بالائے صفحہ)۔
[۱۱۵۹ھ] (=۳۰ سال جلوس محمّد شاہ، ورق شمارہ ۱۴ ا، متن)۔
۱۱۶۳ھ (ورق شمارہ ۱۷ ب، دائیں طرف کا حاشیہ)۔

ان تاریخوں سے ظاہر ہے کہ اس مجموعے کی تحریریں مخلص اپنے آخری ایام حیات تک جمع کرتے رہے۔ ان کا انتقال ۱۱۶۴ھ میں ہوا ہے، لیکن زندگی نے انہیں اتنی مہلت نہ دی کہ اس مجموعے کا دیباچہ لکھتے اور اپنے "مرقع تصویر" کی طرح، جو اُنہوں نے ۱۱۴۷ھ میں مکمل کر لیا تھا اہم شخصیتوں کی تحریروں کے اس نادر البم کا نام رکھتے، جو ہو سکتا ہے 'مُرقع تحریر' ہوتا۔ یہ تحریریں اُنہوں نے ۱۱۳۳ھ سے پہلے جمع کرنی شروع کی ہوں گی، اس لئے کہ ان میں مرزا بیدل کی تحریر (ورق ۱۴۵ ا) بھی ہے جو ان کی حیات میں ان سے مخلص کو ملی تھی۔ مرزا بیدل کی وفات ۱۱۳۳ھ میں ہوئی۔

جہاں تک اس 'موقع' کا تعلق مخلص کی خانگی زندگی سے ہے اس میں ان کے والد ھردے رام، چچا دیا رام، دادا رائے گجیت رائے، کے نام اور ان کی تحریریں ملتی ہیں اور مخلص کے بیٹوں کے نام بھی ملتے ہیں

جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔[1]

یہ کتاب جو 'مرقع مخلص' کے نام سے اورینٹل کالج کی طرف سے شائع کی جا رہی ہے کئی اعتبار سے اہمیّت رکھتی ہے اور مخلص کی دوسری تصانیف سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں تو اہل علم کی تحریریں ہیں، اور مخلص نے ان پر جو حواشی اور شذرات لکھے ہیں، اُنھوں نے اس کو مستقل کتاب کی حیثیت دے دی ہے۔ ان حواشی اور شذرات میں مخلص نے بالواسطہ طور پر اپنے بارے میں اور اپنے بزرگوں، دوستوں اور ہم عصروں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سے ان کی شخصیت اور ماحول پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے معاصرین میں کون کون لوگ اہمیّت رکھتے تھے اور ادب و شعر میں ان کا مرتبہ کیا تھا، مخلص سے ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی، اور یہ کہ وہ ان کی کتنی عزت اور انہیں اور ان کے نام کو کتنی اہمیّت دیتے تھے۔

اس نسخے میں مخلص کے نامور ہم عصروں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں ایک جگہ ہیں۔ دُنیا میں یہ واحد البم ہے جس میں ان عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں جمع کی گئی ہیں۔ یہ کام مخلص کی ایسی ادبی شخصیت کا انسان ہی کر سکتا تھا۔ اگر مخلص کے ہاتھوں یہ کام انجام نہ پاتا تو ادبی دنیا ان لوگوں کی تحریروں کو ترستی اور خواب میں بھی اس کو ان کے خطوں کا دیدار نہ ہوتا۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس مرقع سے اس زمانے کے

---

[1] ملاحظہ ہو مرقع کے اوراق کی عکسی نقل کی فہرست، اوراق ۵ ا، ۶ ا، ۶ ب، ۱۱ ب، ۴۵ ب

دفتری نظام اور کام کی ایک تصویر بھی سامنے آتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں حکام کے سامنے نوٹ کس طرح پیش کئے جاتے تھے اور وہ اس پر کس طرح احکامات صادر کرتے تھے۔ مخلص نے یہ نوٹ خود اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں، ان پر اعتماد الدولہ سے احکامات صادر کروائے ہیں۔ روزانہ کی معمولی معمولی باتوں کی اطلاع ان شذرات کی صورت میں مخلص کی طرف سے اعتماد الدولہ کی خدمت میں دی جاتی تھی اور وہ ان میں سے بیشتر پر لکھتے تھے معلوم شد اور بعض پر کسی قدر تفصیل سے احکامات صادر کرتے تھے۔ اس اعتبار سے یہ نسخہ اس زمانے کے دفتری نظام کار کا بھی ایک مرقع ہے۔

یہ نسخہ اس زمانے کے بعض حالات اور خصوصاً آدب معاشرت کا بھی آئینہ ہے۔ اس میں جمع کی ہوئی مختلف تحریروں سے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ لوگ اس زمانے میں کس طرح رہتے تھے۔ زندگی بسر کرنے کے معیار کیا تھے۔ ملنے جُلنے کے آداب کی کیا صورت تھی۔ ان کی دلچسپیاں کیا تھیں، اور ان دلچسپیوں میں انسانی رشتوں اور معاشرتی رابطوں کا کتنا ہاتھ تھا۔

غرض اس نسخے میں مجھے بے شمار خوبیاں نظر آئیں۔ اس لئے میں نے یہ مُناسب سمجھا کہ 'مرقع مخلص' کے نام سے پہلے اس نسخے کا عکس چھاپ دیا جائے تاکہ مخلص کی جمع کی ہوئی یہ نادر، نایاب تحریریں محفوظ ہو جائیں اور ہر شخص ان کو دیکھ کر لُطف اندوز ہو سکے۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور
۲۵ مارچ ۱۹۷۵ء

عبادت بریلوی

رہ نوردانِ شوق

بیسویں صدی کا زمانۂ اسلامیان ہند کی تاریخ میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے اس کے ابتدائی تیس چالیس سالوں میں سیاست، ثقافت اور ادب و شعر کی دنیا میں ایسی ایسی شخصیتیں جلوہ گر ہوئیں جن میں سے ہر ایک، ہماری تاریخ میں ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان شخصیتوں نے اپنے اپنے کارناموں سے تاریخ سازی کا اہم کام انجام دیا۔ ان کے بغیر اگر اپنی قومی، سیاسی، ثقافتی اور ادبی تاریخ کو دیکھا جائے تو وہ سونی سونی سی نظر آئے گی۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ان میں ہر ایک اپنی اپنی جگہ ایک انجمن ہے۔

میں اس اعتبار سے ایک خوش قسمت انسان ہوں کہ مجھے ان میں

سے بعض شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان بزرگوں کی صحبتوں میں مجھے جو تجربات ہوئے، اور ان کی عظیم شخصیتوں نے جو نقوش میرے دل و دماغ پر چھوڑے وہ اتنے گہرے اور ہمہ گیر ہیں کہ انہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، اور پھر ان تجربات و تاثرات کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہے کہ ان کا دوسروں تک پہنچانا ضروری ہے کیونکہ ان سے نہ صرف ان عظیم شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ ہماری تاریخ کے جس دور میں انہوں نے زندگی بسر کی، اس کے نشیب و فراز بلکہ مد و جزر کی ایک تصویر بھی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

اسی خیال سے اس وقت بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، جناب جگر مُرادآبادی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی اہم اور تاریخ ساز شخصیتوں کے یہ خاکے "رہ نوردانِ شوق" کے نام سے کتابی صورت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ بزرگ صحیح معنوں میں رہ نوردانِ شوق تھے کیونکہ انہوں نے کبھی بھی منزل کو قبول نہیں کیا۔ اپنے اپنے مخصوص میدانوں میں وہ تو راہِ شوق کے ایسے مسافر تھے جو رہ نوردی ہی کو اپنی منزل سمجھتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ان اہم اور عظیم شخصیتوں کے یہ خاکے، اپنی تہذیبی، معاشرتی اور ادبی اہمیت کے پیشِ نظر، دلچسپی سے پڑھے جائیں گے!

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

۲۵، دسمبر ۱۹۷۸ء

عبادت بریلوی

آوارگانِ عشق

مجاز، میراجی، ناصر کاظمی، محمد حسن عسکری اور صوفی صاحب کی شخصیتوں کے یہ خاکے مختلف اوقات میں ان دوستوں کی وفات حسرت آیات پر تعزیتی مضامین کے طور پر لکھے گئے تھے۔ جس تاریخی ترتیب سے یہ لکھے گئے اور مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے اب اسی ترتیب سے ان کو کتابی صورت میں یکجا کر کے شائع کیا جا رہا ہے، اس کتاب کا نام اس کے موضوع کی مناسبت سے "آوارگانِ عشق" رکھا گیا ہے۔

میرے اِن احباب میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ شعر و ادب کا ایک ستون تھا، اور انہوں نے اپنے اپنے مخصوص میدانوں میں جو گراں قدر

کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ ادب و شعر کی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ لیکن شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ یہ لوگ انسانی خصوصیات سے بھی مالا مال تھے، اور ان کی یہی انسانی خصوصیات انہیں اس عہد کی اہم شخصیات بناتی ہیں۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ان دوستوں سے قُرب حاصل رہا، اور زندگی میں انہیں بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ ان کی صحبتوں میں جو تجربات مجھے ہوئے اور جو یادیں باقی رہ گئیں انہیں ان خاکوں کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان دوستوں کی اہمیت اور انفرادیت کے پیشِ نظر، ان کی شخصیتوں کے ان خاکوں کو، میر صاحب کی علامتی زبان میں "آوارگانِ عشق" کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ جب بھی ان کی یاد آتی ہے، اور یہ یاد اکثر آتی ہے، تو میر صاحب کا یہ شعر میرے حواس پر منڈلانے اور میری روح پر چھانے لگتا ہے ؎

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مُشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

اورینٹل کالج لاہور
۲۵ مارچ ۱۹۷۹ء

عبادت بریلوی

میر تقی میر

اُردو شاعری میں میر تقی میر کی شخصیت اتنی دل کش اور ان کی شاعری کچھ اس درجہ دلآویز ہے کہ ان کے ساتھ ہر حال میں ایک رابطہ رکھنے کو جی چاہتا ہے۔

میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے سے یہ رابطہ رکھا، اور گذشتہ چالیس سال کچھ اس طرح گزرے کہ میں ہمیشہ کسی نہ کسی طرح میر سے قریب رہا۔ ان کے کلیات کو ہمیشہ اپنے سرہانے رکھا، روزانہ اس کا مطالعہ کیا اور کسی نہ کسی تقریب سے ان کی شخصیت اور شاعری

کے بارے میں باتیں کیں، مضامین لکھے، جلسے ترتیب دے، اور تقریباً تیس سال تک میں اپنے طالب علموں کو میں پڑھاتا بھی رہا ــــ اس تمام عرصے میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب میر کی شخصیت اور شاعری نے مجھ پر ایک سرخوشی کی کیفیت نہ طاری کی ہو۔

آج بھی، کہ میں زندگی کے بے شمار نشیب و فراز دیکھ چکا ہوں، اور عمرِ عزیز کی اس منزل پر پہنچ جانے کے باوجود جب جذبات سرد ہونے لگتے ہیں، میں میر کی شخصیت اور شاعری سے متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ اس حقیقت کا شعور رکھتے ہوئے بھی کہ میر بنیادی طور احساس اور جذبے کی شدّت کا شاعر ہے، میرے حواس پر اس کی شخصیت اور شاعری سرخوشی بن کر چھاتی ہے، اور میں اس میں گم ہو جاتا ہوں، ڈوب جاتا ہوں، کھو جاتا ہوں۔

میر سے اس دلچسپی ہی نے، عرصہ ہوا، میرے دل میں ان کے کلام کو مرتب کرنے کا چراغ روشن کیا اور نامکمل صورت ہی میں سہی، وہ شائع بھی ہوا۔ پریس والوں کی لاپروائی کی وجہ سے اس میں غلطیاں بھی رہ گئیں۔ لیکن اس کے باوجود آج پونے دو ہزار صفحات کی یہ کتاب اس طرح نایاب اور ناپید ہوئی کہ اب اس کا کوئی نسخہ کسی قیمت پر نہیں ملتا۔

کلیاتِ میر کے اس نسخے پر میں نے ایک مفصّل مقدمہ بھی لکھا تھا جس کی حیثیت ایک مستقل کتاب کی تھی۔ اس مقدمے کو شوق سے پڑھا گیا۔ ادیبوں اور نقّادوں، استادوں اور طالب علموں نے

اس کو سراہا۔ مختلف یونیورسٹیوں نے اس کو اپنے نصابوں میں بھی شامل کیا۔ مضامین و مقالات میں اس کے حوالے بھی دیئے گئے۔ بعض غیر ملکی زبانوں میں اردو کے پروفیسروں نے اپنے طالب علموں کے لئے اس کے کئی حصّوں کے ترجمے بھی کئے۔ غرض اس کو پسند کیا گیا۔ حالانکہ یہ رواروی میں لکھا گیا تھا۔

ادھر کئی سال سے کلیات میر کے ساتھ یہ مقدمہ بھی نایاب ہو گیا۔ چنانچہ احباب اور طالب علم اصرار کرنے لگے کہ اس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ اس اصرار سے مجبور ہو کر میں نے اس پر نظر ثانی کی، اور اس میں ترمیم و اضافہ بھی کیا۔ میر کے تنقیدی شعور اور میر کی ادبی اہمیت پر دو نئے باب بھی اس میں شامل کئے، اور اب یہ آپ کے سامنے کتابی صورت میں موجود ہے۔

میر کے مطالعے کے نتائج تو میری آئندہ شائع ہونے والی چار کتابوں (۱) حیات میر (۲) میر کی غزل (۳) منظومات میر اور (۴) میر کی شاعری کا جمالیاتی پہلو، میں سامنے آئیں گے۔ ان کتابوں میں میر کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کی دل چسپ تفصیل و جزئیات ہوگی جس کو تحقیقی اور تنقیدی زاویہ نظر سے تجزیاتی انداز میں پیش کیا جائے گا۔

یہ کتاب، جو اس وقت "میر تقی میر" کے نام سے شائع کی جا رہی ہے، اس کو ان چاروں کتابوں کی تمہید، مقدمہ یا خاکہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں بھی میں نے میر کی شخصیت اور شاعری پر زیادہ سے

زیادہ مواد جمع کرنے کی کوشش کی ہے، اور اختصار کے ساتھ ہی سہی، ان کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی تجزیہ بھی کیا ہے۔

عبادت بریلوی

اورینٹل کالج، لاہور
۱۶ ر جنوری ۱۹۸۰ء

نالۂ درد

حضرت خواجہ میر دردؒ بارہویں صدی ہجری اٹھارویں صدی عیسوی کے صوفیائے کرام میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ ۱۱۳۳ھ میں دلی میں پیدا ہوئے اور اس آشوب قیامت کے باوجود، جس سے اس زمانے میں دلی دوچار تھی، ہمیشہ دلی ہی میں رہے۔ ۱۱۹۰ء میں دلی ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے اپنی زندگی درویشی کے عالم میں بسر کی۔ زندگی بھر گوشے میں بیٹھے رہے۔ لیکن اُن کا روحانی فیض عام رہا۔ ساری زندگی تصوف سے انہوں نے گہری دلچسپی لی۔ سلسلہ محمدیہؒ، جو ان کے والد حضرت خواجہ ناصر عندلیب نے قائم کیا تھا، اس کو انہوں نے فروغ دیا۔ ذات باری سے انہیں قربت حاصل تھی اور وہ عشق رسولؐ سے سرشار تھے۔ شریعت کی

پابندی بھی ان کا شعار تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اُردو اور فارسی کے نامور شاعر بھی تھے۔ اسلامی تصوف کی مزاج دانی بھی ان کا خاص میدان تھا۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں بھی تصوف کے بے شمار معاملات و مسائل کو تجربات اور واردات و کیفیات کا روپ دیا ہے، اور جتنا بھی غور کیا جائے ان کی شاعری میں مسائل تصوف کی تہیں کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ اردو شاعری میں تصوف کو جس طرح انہوں نے پیش کیا، کوئی اور اس طرح پیش نہ کر سکا۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ ان کے ہاں مسائل تصوف کے ان پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کی ترجمانی سے اس کارگہ شیشہ گری کو ٹھیس نہیں لگی جس کو شاعری اور شاعرانہ فن کاری کہا جاتا ہے۔ اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ تصوف اور اس کے مسائل حضرت خواجہ میر دردؒ کے ہاں واردات و کیفیات کا روپ اختیار کرتے ہیں اور صحیح شاعرانہ تجربہ بن کر سامنے آتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ حضرت خواجہ میر دردؒ زندگی بھر تصوف اور اس کے مسائل پر غور و فکر کرتے رہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان میں ڈوبے رہے۔ ان کی دنیا صرف تصوّف اور درویشی تھی۔ انہوں نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو صوفیائے کرام کا مشہور و معروف خاندان تھا۔ ان کے والد حضرت خواجہ ناصر عندلیب اپنے زمانے کے مشہور و معروف صوفی بزرگ تھے۔ انہیں کے سائے میں خواجہ میر دردؒ کی پرورش اور نشو و نما ہوئی، اور اُنہوں نے ساری زندگی اپنے والد محترم حضرت خواجہ ناصر عندلیب کے خیالات و نظریات کو عام کرنے کی کوشش کی۔ یہ کام انہوں نے اپنی اردو اور فارسی شاعری کے ذریعے سے بھی انجام دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ

اُنہوں نے ایسے رسالے بھی لکھے اور ایسی کتابیں بھی تصنیف کیں جو اسلامی تصوف کے نظام کو سمجھنے سمجھانے اور اس کو پھیلانے اور عام کرنے میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

خواجہ میر دردؒ نے پندرہ سال کی عمر سے یہ کام شروع کیا۔ ان کی پہلی تصنیف رسالہ اسرار الصلواۃ ہے۔ یہ رسالہ انہوں نے ۱۱۴۸ھ میں لکھا۔ اس وقت خواجہ میر دردؒ کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ اس رسالے میں انہوں نے نماز کے مختلف پہلوؤں کی اہمیت کو واضح کیا ہے، اور یہ لکھا ہے کہ اپنے والد محترم کی بدولت مجھ پر نماز کے مختلف پہلو پوری طرح واضح ہوئے۔ اس لئے میں نے ان کے اثر سے اس رسالے کو لکھا تاکہ میرے یہ خیالات عارفوں کے لئے لطف و انبساط کا باعث ہوں۔ اس رسالے کو، عرصہ ہوا، مولانا نور الحسن خاں صاحب نے بھوپال سے شائع کیا تھا۔ لیکن اب یہ رسالہ عرصے سے نایاب ہے۔

رسالۂ واردات، دوسرا رسالہ ہے جس کو حضرت خواجہ میر دردؒ نے ۱۱۷۲ھ میں لکھا۔ یہ ان واردات کا مجموعہ ہے جو عالم سلوک و جذب میں خواجہ صاحب پر گزرتی تھیں۔ ان واردات کو انہوں نے مختلف رباعیات کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ اس میں معرفت و حقیقت کی باتیں ہیں۔ یہ رسالہ خواجہ میر دردؒ نے ۲۹ سال کی عمر میں لکھا، اور اپنے والد محترم حضرت خواجہ ناصر عندلیب کی خدمت میں پیش کیا۔ اس میں ۱۱۱ واردات ہیں۔

خواجہ میر دردؒ کی تیسری تصنیف علم الکتاب ہے۔ یہ کتاب خاصی ضخیم ہے، اور اس میں ان ۱۱۱ واردات کی تشریح ہے جو رسالہ واردات کی صورت میں پیش کی گئی تھیں۔ گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ علم الکتاب واردات کی مفصل

شرح ہے۔ عرصہ ہوا ۶۲۸ صفحات کی اس ضخیم فارسی کتاب کو بھی مولانا نورالحسن خاں صاحب نے شائع کیا تھا۔لیکن اب یہ بھی ایک زمانے سے نایاب ہے۔

نالۂ درد، حضرت خواجہ میر دردؔ کا چوتھا رسالہ ہے۔ واردات اور علم الکتاب لکھنے کے بعد، جو موضوعات تصوف باقی رہ گئے تھے، ان کے بارے میں خواجہ صاحب نے وقتاً فوقتاً اظہار خیال کیا۔ ان خیالات کو ان کے چھوٹے بھائی اور مرید خواجہ میر اثرؔ جمع کرتے رہے اور اس طرح یہ رسالہ نالۂ درد، مرتب ہوا۔ اس میں تصوف اور اسلامی نظام اخلاق سے متعلق بڑی ہی اہم باتیں ہیں۔ یہ رسالہ بھی فارسی میں ہے اور ۱۲۱ صفحات کے اس رسالے کو بھی مولوی نورالحسن خاں صاحب نے شائع کیا تھا۔لیکن اب یہ بھی نایاب ہے۔ یہ رسالہ اپنے موضوع کے اعتبار سے تو اہم ہے ہی لیکن اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے شروع میں خواجہ میر دردؔ نے اپنے اُن علمی کاموں کی تفصیل پیش کی ہے جو انھوں نے اسلامی تصوف کے موضوع پر کیے ہیں، اور نالۂ درد کے بنیادی موضوعات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

"اس کے بعد عرض ہے کہ بندۂ دل سرد خواجہ میر دردؔ، خدا اس کی مغفرت کرے، جو مسلمانوں میں سب سے ادنیٰ اور کمترین ہے، یوں بیان کرتا ہے کہ فطری طور پر اس کمترین کو قوت گویائی کا وافر حصہ ملا ہے، جس کی وجہ سے بچپن ہی سے شعر و نثر میں اُلٹی سیدھی باتیں کہتا آیا ہوں، اور اب بھی کر رہا ہوں۔ میں ہمیشہ اس بات پر بھی عمل پیرا رہا ہوں کہ جس نے خدا کو پہچان لیا اس کی قوت گویائی بڑھ جاتی ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی میں نے خاموشی بھی اختیار کی ہے۔ لیکن جب بھی جنونِ گفتار دوبارہ جوش میں آجاتا ہے تو سخن سرائی

کے لق ودق صحرا کی جانب بے اختیار دوڑتا ہوں۔ چنانچہ پندرہ سال کی عمر میں میں نے ایک رسالہ اسرار الصلوٰۃ کے نام سے اس وقت لکھا جب میں رمضان المبارک کے آخری عشرے میں، اعتکاف کی حالت میں تھا۔ اس کے بعد میں نے ۳۹ سال کی عمر میں رسالۂ واردات لکھا۔ اس کی تشکیل کے بعد میں نے اس مختصر رسالے کی شرح علم الکتاب کے نام سے لکھی۔ یہ ایک سو گیارہ (۱۱۱) ابواب پر مشتمل ایک مبسوط کتاب ہے جس کی تصنیف و تالیف میں مجھے ایک مدت لگی۔ اس کتاب کو مکمل کرنے کے بعد بھی کبھی کبھی جو کچھ ذہن میں آتا، اور جو دل پر وارد ہوتا اُسے لکھ لیتا۔ اس رسالے میں میں نے سوائے اپنے اشعار کے کسی دوسرے کے کلام کو شامل نہیں کیا۔ ان کلمات کو جمع کرنے کا کام میرے بھائی میر محمدؐ اثر نے اپنے ذمے لیا۔ ہوتے ہوتے وہ ایک اچھا خاصا رسالہ بن گیا جس کا نام نالۂ درد رکھا گیا۔ اس نام سے میرے غفلت بھرے دل کے درد کی نمائندگی ہوتی ہے، اور اس کو نالۂ عندلیب سے مناسبت بھی ہے، جو قبلہ والد صاحب کی تصنیف ہے۔ اللہ تعالیٰ نیتوں کو خوب جانتا ہے، اور وہی نجات کی راہ دکھانے والا ہے۔ انشاء اللہ میرے دل کا یہ نالہ جو ایک آہِ سرد کی مانند ہے، ہر فرد بشر کے دل پر اثر کرے گا۔"

(نالۂ درد)

اس بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت خواجہ میر دردؒ کا یہ رسالہ نالۂ درد کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ایک سچے مسلمان اور ایک صوفیٔ باصفا کو ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر جس طرح خواجہ صاحب نے ان معاملات و مسائل کو بیان کیا ہے اس کے تو ایک ایک لفظ سے درد ٹپکتا ہے، اور اس کے پیچھے ایک بے چین اور بیقرار

دل کے تڑپنے کی آواز صاف سُنائی دیتی ہے۔ اس رسالے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ میر دردؔ پر جذب کا عالم بھی طاری رہا ہے، اور اس جذب وشوق میں وہ ہر لمحہ آہ کھینچتے اور آنسو بہاتے رہے ہیں۔ ذات باری سے انہیں قرب حاصل رہا ہے اور وہ عشق رسولؐ سے سرشار رہے ہیں۔ فرط شوق کا ان کے یہاں یہ عالم رہا ہے کہ اُنہوں نے ہر حال میں نالہ کیا ہے اور آنسو بہائے ہیں۔ وصل کی حالت میں خوشی کے آنسو اور عالم ہجر میں رنج وغم کے آنسو۔ غرض یہ کہ خواجہ میر دردؔ کا یہ رسالہ نالۂ درد ان کی تصانیف میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

نالۂ دردؔ کے بعد خواجہ صاحب نے آہ سرد، شمع محفل، درد دل، حرمت غنا، واقعات درد اور سوز دل کے ناموں سے تصوف کے مختلف موضوعات پر رسالے تصنیف کئے۔ ان میں شمع محفل اور دردِ دل کو انہوں نے ۱۱۹۵ھ میں شروع کر کے ۱۱۹۹ھ میں اپنی وفات سے چند ماہ قبل مکمل کیا۔ دَرد دل کے آخر میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں :

"اب میری عمر کا چھیاسٹھواں سال ہے، اور یہ رسالہ ختم ہو رہا ہے۔ مُبارک اسم اللہ کے بھی عدد چھیاسٹھ ہیں۔ صحیفہ واردات ۱۱۷۲ھ میں ختم ہوا تھا۔ اسی سال والد عالی مرتبہ نے چھیاسٹھ سال کی عمر میں رحلت فرمائی تھی۔ حسن اتفاق کہ اس رسالے کا خاتمہ امسال ہوا جو میرا ارتحال ہے۔ یہ رسالہ شمع محفل کے ساتھ ۱۱۹۵ھ میں شروع ہوا تھا۔ اب ۱۱۹۹ھ میں ختم ہو رہا ہے۔ ظاہرا یہ خاتمہ توام ہے۔ سکوت خاتمہ بالخیر راقم رسالہ ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ حضرت خواجہ میر دردؔ کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی، اور اس رسالے

کو مکمل کرنے کے بعد چند ماہ کے اندر ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ کو ان کا انتقال ہو گیا۔

خواجہ صاحب کے یہ تمام رسالے اسلام اور اسلامی تصوف کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے بیش بہا خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسی احساس نے میرے دل میں اس خواہش کی شمع فروزاں کی کہ ان رسالوں کو اس طرح شائع کیا جائے کہ زیادہ سے زیادہ افراد ان سے استفادہ کر سکیں۔ اسی خیال سے، چند سال ہوئے، میں نے اپنے ایک شاگرد ظفر عالم سے، ام۔اے کے تھیسز کے طور پر، نالۂ دردؒ کا ترجمہ کروایا جس کی نگرانی میرے شاگرد ڈاکٹر میاں بشیر حسین نے کی جو اب اورینٹل کالج میں فارسی کے ایسوسیٹ پروفیسر ہیں۔ اس کے علاوہ اورینٹل کالج میں اُردو کے اُستاد ڈاکٹر سید ناظر حسن صاحب نے اور عربی کے پروفیسر ڈاکٹر رانا احسان الٰہی صاحب نے بھی اس کو دیکھا، نظر ثانی کی، قرآنی آیات اور احادیث کی تصحیح کو خصوصیت کے ساتھ پیشِ نظر رکھا اور نوک پلک کو درست کیا۔ پھر میں نے بھی اس پر تصحیح کے خیال سے نظر ثانی کی اور جگہ جگہ اس کے انداز و اسلوب کو بدلا۔ اس طرح ترجمے کا یہ متن نہایت اہتمام سے طباعت کے لئے تیار ہوا۔

اور اب اسلامی تصوف سے متعلق حضرت خواجہ میر دردؒ کی اس اہم کتاب کو شعبۂ تاریخ ادبیات کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس خیال سے کہ اس کے اُردو ترجمے سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو استفادے کا موقع ملے گا، اور اس میں اسلام، اسلامی تصوف اور انسانی اقدار سے

متعلق جو گراں قدر خیالات اور اَرفع اَفکار پیش کئے گئے ہیں، وہ حضرت خواجہ میر دردؒ کی عظیم شخصیت کو سمجھنے اور ان کی پہلو دار شاعری کی رُوح سے آشنا ہونے میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

اورینٹل کالج لاہور
۲۵ ؍فروری ۱۹۸۰ء

عبادت بریلوی

(۴۴)

اورینٹل کالج میگزین

شذرات

گذشتہ چند سال میں اورینٹل کالج میگزین نے، اپنے محدود وسائل کے باوجود علم وادب اور تحقیق وتنقید کی دُنیا میں جو خدمات انجام دیں، انہیں علمی دنیا، خصوصاً مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں میں، اہمیت دی گئی اور تحسین کی نظروں سے دیکھا گیا۔ امریکہ، کینیڈا، روس، انگلستان، جرمنی، فرانس، اٹلی، اسپین، مصر، ترکی، شام، اُردن، عراق، سعودی عرب، جاپان، چین، ہندوستان اور آسٹریلیا کی مختلف یونیورسٹیوں نے اورینٹل کالج میگزین سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور اگرچہ اس میں بیشتر مقالات پاکستان کی قومی زبان اُردو میں شائع

ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود بین الاقوامی شہرت رکھنے والے پروفیسروں اور محققوں نے اس سے دلچسپی لی اور اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بے شمار خطوط جو دُنیا کے مختلف حصّوں سے وصول ہوئے ہیں، ان میں سے بعض کو وقتاً فوقتاً شائع کر دیا گیا ہے۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ تمام خطوط کو شائع کر دیا جائے لیکن اس خیال سے ایسا نہیں کیا گیا کہ اس کو خود ستائی پر محمول کیا جائے گا۔

○

بہر حال اب یہ ایک حقیقت ہے کہ اورنٹیل کالج اپنے علمی اور تحقیقی کام کی بدولت دُنیا کے گوشے گوشے میں پہچانا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مشرقی اور اسلامی علوم کے مشہور و معروف ادارے اور ان کے ساتھ منسلک پروفیسر اور محقق برابری کی سطح پر اس کے ساتھ تعاون نہ کرتے۔ اورینٹل کالج کے لئے یہ بات باعث فخر و افتخار ہے کہ گذشتہ دس سال میں پروفیسر سی۔ ایچ فلپس وائس چانسلر لندن یونیورسٹی، پروفیسر اے۔ جے آربری (کیمبرج)، پروفیسر سی۔ ڈی کوون ڈائرکٹر اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن، پروفیسر منٹگمری، (اڈنبرا یونیورسٹی) پروفیسر رائٹ، پروفیسر رالف رسل، پروفیسر بیرسن (لندن ہسٹر سٹن، مس کرافورڈ، مسٹر بلوم فیلڈ، مس لائیڈ (انڈیا آفس لائبریری)، مسٹر گارڈنر، ڈاکٹر لنکس (برٹش میوزیم) پروفیسر جان ہے وڈ ڈرہم یونیورسٹی) وکٹر کیرنن (اڈنبرا) پروفیسر جان ہیالک (آکسفورڈ) ڈاکٹر سائمن ڈگبی (رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) ڈاکٹر محمد حمید اللہ، (پیرس)، پروفیسر آندرے گوئیمبر یر (پیرس) پروفیسر آرنلڈیز (پیرس)

پروفیسر انی میری شمل، (بون، ہارورڈ) ڈاکٹر واتشر (جرمنی) پروفیسر بوزانی (روم، اٹلی) پروفیسر عبدالقادر قرہ خان (استنبول ترکی) ڈاکٹر سید حسین نصر (ایران) پروفیسر مجتبی مینوی (ایران) پروفیسر اسلامی پروفیسر جلال متینی، پروفیسر ضیا الدین سجادی (ایران) محمد حسین مجددی، پروفیسر وصی اللہ سمیعی، پروفیسر سعید افغانی (افغانستان) پروفیسر گینکاوسکی، ڈاکٹر مارا استیپانینس (سوویٹ یونین) پروفیسر یان مارک (چیکوسلاویکیہ) پروفیسر ہروشی کان کاگایا (اوساکا، جاپان) پروفیسر بروس پرے (کیلی فورنیا برکلے) ڈاکٹر بارکر (مینی سوٹا) پروفیسر تھیوڈو ڈ باری (کولمبیا) ڈاکٹر فلیمنگ (ایری زونا) ڈاکٹر باربرا مٹکاف (پنسلوینیا) جناب مالک رام (دہلی) پروفیسر آل احمد سرور (سری نگر) پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ) پروفیسر کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود (پٹنہ) پروفیسر محمّد حسن (دہلی) اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے ایسے عالموں، محققوں اور پروفیسروں نے اورینٹل کالج کے ساتھ علمی اور تعلیمی سطح پر تعاون کیا۔ اورینٹل کالج ان سب کا شکر گزار ہے۔

اورینٹل کالج میگزین کے اقبالؒ نمبر کی انگریزی اور اُردو دونوں جلدوں کو بین الاقوامی سطح پر پسند کیا گیا۔ ساری دُنیا سے تعریف و تحسین کے خطوط آئے۔ یونیورسٹی اور حکومت کے ارباب اختیار نے بھی ہمت افزائی کی۔ اسی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ان دونوں جلدوں کے مجلد ڈی لکس اڈیشن تیار کیے جائیں۔ چنانچہ یہ کام شروع کیا گیا، اور اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ یہ ڈی لکس اڈیشن ایسی خوبصورت کتابوں کی صورت میں تیار کئے

گئے ہیں کہ دنیا میں ایسی خوبصورت کتابیں کم ہی شائع ہوتی ہوں گی۔ یہ سب کچھ علامہ اقبالؒ کے نام کی برکت ہے ورنہ ایسی کتابیں اس زمانے میں بھلا کون شائع کرسکتا ہے۔ محدود تعداد میں ان کتابوں کو شائع کیا گیا ہے۔ اس لئے علامہ اقبالؒ کے جو شیدائی اس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ جلد از جلد اورینٹل کالج سے رابطہ قائم کریں تو بہتر ہے۔

علامہ اقبالؒ پر یہ کام اورینٹل کالج نے ایک منصوبے کے تحت کیا ہے۔ اس کا مقصد مغرب اور مشرق دونوں کو علامہ اقبالؒ کے افکار و خیالات سے آشنا کرنا ہے۔ علامہ مرحوم پر کام تو بہت ہوا ہے لیکن وہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ اس کام کو سمیٹ کر یک جا کرنا اور اس سے استفادہ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے اورینٹل کالج کا یہ کام اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس میں علامہ کی اپنی تحریریں اور ان کے بارے میں تقریباً تمام اچھے لکھنے والوں کی تحریریں یک جا ہیں۔ اور یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جو کچھ اردو اور انگریزی کی ان دونوں جلدوں میں پیش کیا گیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ علامہ اور ان کے افکار و خیالات کو سمجھنے میں مدد دیتا رہے گا۔ اور یہ کام بلاشبہ علامہ اقبالؒ، پاکستان اور نظریۂ پاکستان کی خدمت ہے۔ انشاء اللہ ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت علامہ اقبالؒ پر اس قسم کے کاموں کو آئندہ بھی جاری رکھا جائے گا۔ اور اس طرح نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں بھی علامہ اقبالؒ اور ان کے علمی اور قومی و ملی کارناموں سے دلچسپی عام ہوگی۔

میگزین کا موجودہ شمارہ دلچسپ اور مفید ہے۔ مولانا امتیاز علی خان عرشی اورینٹل کالج کے پرانے طالب علم ہیں، اور تحقیق کی اس روایت سے تعلق رکھتے ہیں جو اورینٹل کالج کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کا گراں قدر مقالہ "حافظ اور خیام کا رشتہ" نئی معلومات فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک نے اس شمارے کے لئے عربی میں ایک گراں قدر مقالہ لکھا ہے۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، حضرت نیاز فتح پوری، ڈاکٹر عندلیب شادانی، مولانا صلاح الدین احمد، میاں بشیر احمد گل پروفیسر رشید احمد صدیقی، اور پروفیسر عزیز احمد کے غیر مطبوعہ خطوط ان بزرگوں کی اہم شخصیتوں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ "افسانۂ عشق" حکیم الٰہی بخش شوق اکبر آبادی کی وہ کہانی ہے جو انہوں نے اس وقت آگرے میں بیٹھ کر لکھی جب اس قسم کی نثر لکھنے کا تجربہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں کیا جا رہا تھا، لیکن شمالی ہندوستان میں اس کی کوئی روایت نہیں بنی تھی۔ یہ قلمی نسخہ ایک ادبی دریافت کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے اردو ادب کے طالب علموں کے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث ہو گا۔

اورینٹل کالج کے پروفیسروں اور ان کے دوستوں کی کچھ تصویریں بھی اس شمارے کی زینت ہیں۔ یہ تصویریں اورینٹل کالج کے علمی اور ادبی ماحول سے متعلق کچھ پرانی یادوں کو تازہ کرتی ہیں۔ اسی لئے ان کو شریکِ اشاعت کیا جاتا ہے۔

عبادت بریلوی

اورینٹل کالج لاہور
۷ مارچ ۱۹۸۰ء

میر کا تذکرہ نکات الشعراء اُردو شعراء کا ایک اہم تذکرہ ہے۔ اس تذکرے کو اُردو شاعروں کا پہلا تذکرہ بھی کہا گیا ہے۔ اس سے قبل تذکرے تو لکھے جاتے تھے لیکن ان تذکروں میں فارسی شاعروں کا ذکر ہوتا تھا۔ میر پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے تذکرہ نگاری کی اہمیت کو محسوس کیا اور سب سے پہلے زبان اُردو کے شاعروں کا تذکرہ لکھا۔

ایک زمانے تک میر کا یہ تذکرہ گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا اور کسی نے تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ صرف بعض تذکروں اور ادبی تاریخوں میں اس کی طرف اشارے کر دیئے گئے۔

بالآخر بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کو اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا اور اُنہوں نے اس نسخے کو مرتب کر کے ایک مقدمے کے ساتھ جون ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقیٔ اُردو، اورنگ آباد، دکن سے شائع کیا۔ اس سے قبل اس کا ایک اڈیشن نامکمل صورت میں ۱۹۲۰ء میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شیروانی مرحوم کے مقدمے کے ساتھ بھی شائع ہوا تھا۔ لیکن اب یہ دونوں نسخے عرصے سے نایاب ہیں۔

نکات الشعراء ۱۱۶۵ء کی تالیف ہے۔ مولوی صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

”میر صاحب نے اپنے تذکرے کے سنہ تالیف کے متعلق کہیں کوئی صراحت نہیں کی۔ البتہ آنند رام مخلص کے حال میں یہ فقرہ اُن کے قلم سے ایسا نکل گیا ہے جس سے اُس کی نسبت قیاس قائم ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ”قریب یک سال است کہ درگذشت، یعنی جس وقت یہ تذکرہ زیرِ تالیف تھا، اُس وقت مخلص کو مرے ہوئے ایک سال ہوا تھا۔ مخلص کا سنہ وفات ۱۱۶۴ھ ہے (ملاحظہ ہو خزانۂ عامرہ مطبوعہ نول کشور صفحہ ۴۲۵) لہٰذا یہ قیاس بالکل بجا ہے کہ اس کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ ہے۔“[1]

بہرحال ۱۱۶۵ھ کا تالیف کیا ہوا شعرائے اُردو کا یہ تذکرہ پہلے

---

[1] مقدمہ نکات الشعراء۔

۱۹۲۰ء میں پھر ۱۹۳۵ء میں چھپ کر شائع ہوا اور اس کی اشاعت کا سہرا بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کے سر ہے۔ مولوی صاحب مرحوم نے نکات الشعراء کا متن ایک اہم قلمی نسخے کو سامنے رکھ کر تیار کیا تھا۔ یہ نسخہ سید عبدالولی عزلت کے لئے ۱۱۷۲ء میں لکھا گیا تھا۔ مولوی صاحب مرحوم لکھتے ہیں :

"ہم نے یہ تذکرہ ایک مستند قلمی نسخے سے طبع کیا ہے۔ جیسا کہ کتاب کے ترقیمے سے معلوم ہوگا، یہ سید عبدالولی عزلت کے لئے لکھا گیا تھا۔ میر صاحب عزلت کے علم و فضل اور بزرگی کے قائل ہیں اور عزلت بھی میر صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے میں سید صاحب کی بیاض سے استفادہ بھی کیا ہے۔ تذکرے کی کتابت ۱۱۷۲ھ کی ہے یعنی تصنیف سے سات سال بعد لکھا گیا ہے"۔[۱]

اس قلمی نسخے کے آخر میں یہ عبارت ملتی ہے :

"تمام شد نکات الشعراء ہندی من تصنیف میر محمد تقی میر تخلص، بہ حسب الفرمائش حضرت سید عبدالولی صاحب و قبلہ عزلت تخلص کاتب الحروف سیّد عبدالبنی ابن سیّد محمود ابن میر محمد رضا اصفہانی غفراللہ ذنوبہما وستر عیوبہا در بلدۂ فرخندہ بنیاد۔ تحریر فی التاریخ ہفت

---

[۱] مقدمہ نکات الشعراء۔

دہم رمضان المبارک ۱۱۷۲ھ یک ہزار یک صد و ہفتاد
و دو من الہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم"۔[1]

نکات الشعراء چونکہ تقریباً نصف صدی سے نایاب ہے۔ اس لئے اس کی ادبی اہمیت کے پیشِ نظر ایک نئی ترتیب و تحقیق اور مقدمے و حواشی کے ساتھ شعبۂ تاریخ ادبیات کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے۔

عبادت بریلوی

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۲۵ اپریل ۱۹۸۰ء

---

[1] نکات الشعراء، ص ۱۸۰۔

(۱)

اُردو زبان وادب کی تاریخ میں میر تقی میر ایک منفرد مرتبے کے مالک ہیں۔ وہ صرف ایک بلند پایہ شاعر ہی نہیں تھے، ایک مورخ، ایک تذکرہ نگار، ایک زبان دان، ایک افسانہ نویس اور فارسی کے ایک انشاء پرداز بھی تھے۔ ادب کے ان تمام میدانوں میں اُنہوں نے کمال حاصل کیا ہے اور ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں جو اسلامیان ہند کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے اور مورخوں اور اَدبی تاریخ نویسوں، زبان ولسان کے نکتہ دانوں، باوصفا صوفیوں، الہیات کے ماہروں، کہانی کے پرستاروں اور اسلوب و انشاء کے مزاج دانوں کے لئے ان کے افکار و خیالات رہتی دنیا تک مشعلوں کا کام کرتے رہیں گے۔

میر کا کلام اپنے عہد کی جذباتی زندگی، معاشرتی اور تہذیبی حالات، ذہنی و فکری ماحول اور ادبی و شعری معاملات و مسائل کا صحیح ترجمان اور عکاس ہے۔ اپنی شاعری میں اُنہوں نے پہلو دار اسلوب اور تہہ در تہہ انداز میں جو باتیں کہی ہیں اور جن افکار و خیالات کی ترجمانی کی

ہے، اس سے ان کے زمانے کی زندگی کے نشیب و فراز کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ اور اُس عہد میں افراد جن حالات سے دوچار تھے، اُن سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کی دوسری تصانیف سے اُن حالات اور معاملات و مسائل کی تفصیل و جزئیات کا علم ہوتا ہے۔

شاعری کے ساتھ ساتھ میر کی دوسری تصانیف بھی اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

(۲)

میر کی تصانیف میں سب سے زیادہ اہم تو اُن کی غزلوں کے چھ دیوان ہیں اور وہ منظومات جو مختلف اصناف سخن میں تخلیق کی گئی ہیں۔ غزلوں میں میر نے انسانی زندگی کے جذباتی معاملات کے اَن گنت پہلوؤں کو پیش کیا ہے اور اگرچہ ان معاملات کی نوعیت بظاہر انفرادی ہے لیکن ان کا اطلاق تمام انسانوں پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان غزلوں میں آفاقی رنگ و آہنگ سب سے زیادہ نمایاں ہے اور جذباتی معاملات کے ساتھ ساتھ میر کی ان غزلوں میں حیات و کائنات کے مختلف مسائل بھی سموئے ہوتے ہیں۔ ان مسائل کی ترجمانی نے میر کی غزلوں میں ایک فکری آہنگ پیدا کیا ہے جس کی حدیں فلسفے سے جا ملتی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میر نے اپنی غزلوں میں جو جمالیاتی خوبیاں پیدا کی ہیں اُن کی بدولت خود صنف غزل انتہائی بلندیوں سے ہم کنار ہوئی ہے۔ جہاں تک میر کی مثنویوں اور دوسری منظومات

کا تعلق ہے، اُن میں میر کے ذاتی حالات، اُن کی شخصیت کی نُمایاں خصوصیات، اُن کے عہد کے اہم واقعات، اُن کے زمانے کے اہم معاملات اور اُن کے بُنیادی خیالات و نظریات اپنے آپ کو رُونما کرتے ہیں۔

لیکن میر نے ان تمام پہلوؤں کو صرف اپنی شاعری ہی میں نُمایاں نہیں کیا، اپنی ایک خود نوشت سوانح حیات 'ذکرِ میر' بھی لکھی، جس میں اُن کی زندگی کے واقعات، اُن کے زمانے کے حالات و واقعات اور اُن کے افکار و خیالات تفصیل و جزئیات کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 'ذکرِ میر' اس زمانے کے تاریخی واقعات اور میر کے نجی حالات کا حد درجہ متاثر کرنے والا مرقع ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں جس قسم کی تفصیلات ملتی ہیں، وہ اس عہد کی لکھی ہوئی شاید کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتیں۔ اس اعتبار سے یہ کتاب ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب کے علاوہ میر نے ایک مختصر سی کتاب 'فیضِ میر' کے نام سے لکھی۔ اگرچہ یہ کتاب اُنھوں نے اپنے بیٹے میر فیض علی کی تعلیم و تربیت کے خیال سے لکھی تھی لیکن اس کتاب نے میر کو کہانی کا ایک منفرد فن کار بنا دیا اور الٰہیات سے اُن کی گہری دِل چسپی کو بھی نمایاں کر کے پیش کر دیا۔ میر نے اس کتاب میں درویشوں، صوفیوں اور مجذوبوں کے عجیب و غریب واقعات لکھے ہیں جن سے اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ میر کو ان لوگوں سے کس قدر دِل چسپی تھی اور وہ زندگی میں ان درویشوں اور ان کے خیالات و نظریات اور عادات و اطوار کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

لیکن میر کی ان تصانیف میں اُن کے زمانے کے ادبی و شعری

ماحول کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ ذکرِ میر تک میں اُنہوں نے اس کی تفصیل نہیں لکھی۔ اُن کے زمانے کے اَدبی اور شعری ماحول کی تفصیل اگر کہیں ملتی ہے تو ان کے اس تذکرے میں، جس کو اُنہوں نے نکات الشعراء کے نام سے تالیف کیا اور جس میں نہ صرف اُردو شعراء کے حالات لکھے بلکہ اپنے اَدبی و شعری ماحول کی وہ تفصیل و جُزئیات بھی پیش کی جو اُس زمانے میں لکھی جانے والی کسی دوسری کتاب میں مُشکل ہی سے ملے گی۔

(۳)

اُردو شعراء کے تذکروں میں نکات الشعراء ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ اُردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں عہدِ میر کے اُردو شاعروں کے بارے میں مُفید اور گراں قدر معلومات ہے۔ اُن کے کلام کا انتخاب ہے، بعض اشعار پر اہم اصلاحیں ہیں، شاعروں کی شخصیت، اُن کے کلام اور اَدبی مرتبے پر تنقید و تبصرہ ہے، اُس زمانے کے ادبی اور شعری ماحول کی تصویر کشی ہے۔ اور اُردو زبان کی اصل اور اُس کے ارتقا کا ایک جائزہ ہے۔

نکات الشعراء اُردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے اور اس اعتبار سے اس کی اہمیّت اپنی جگہ مسلم ہے۔ میر اس تذکرے کے شروع میں لکھتے ہیں:

پُوشیدہ نماند کہ در فن ریختہ، کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبانِ اُردوئے معلیٰ شاہ جہان آباد دہلی، کتابے تا حال تصنیف

نہ شدہ کہ احوالِ شاعران این فن بہ صفحۂ روزگار بماند۔
بنائہً علیہ این تذکرہ کہ مسمیٰ بہ نکات الشعراء است،
نگاشتہ می شود"۔ ¹

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس کی تفصیل اس طرح بیان
کی ہے:

"اُس وقت تک جتنے تذکرے دستیاب ہوئے ہیں اُن میں
نکات الشعراء کو تقدم حاصل ہے۔ میر صاحب کے علاوہ بعض
اور تذکرہ نویس بھی اس بات کے مدعی ہیں کہ سب سے
پہلے ریختہ گو شعراء کا تذکرہ اُنہوں نے لکھا ہے۔ مثلاً قائم
جس کے تذکرے کا سنہ تالیف ۱۱۶۸ھ ہے یا خاکسار جس
نے ۱۱۶۵ھ میں معشوق چہل سالہ خود، کے نام سے ایک تذکرہ
لکھا۔ گارساں دتاسی نے غلطی سے یہ خیال کرلیا ہے کہ گردیزی
کو بھی یہ دعویٰ ہے کہ اُس کا تذکرہ سب سے پہلا ہے۔
حالانکہ اُس نے کہیں ایسا دعویٰ نہیں کیا اور اپنے دیباچے
میں اُن تذکروں کی ناانصافی اور کم تحقیقی کی شکایت کی ہے
جو اس سے قبل لکھے گئے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اُس نے اپنا
تذکرہ میر صاحب ہی کے جواب میں لکھا ہے۔ خاکسار کے
تذکرے کے متعلق میر صاحب فرماتے ہیں کہ عُلی الرغم این
تذکرہ، تذکرۂ نوشتہ است بنام معشوق چہل سالہ خود۔
احوال خود را اوّل از ہمہ نگاشتہ وخطاب خود سید الشعرا

---

¹ میر: نکات الشعراء، ص ۱۔

پیش خود قرار دادہ ، اس کی حقیقت ان چند سطروں سے ظاہر ہے۔ تذکرہ گردیزی کا سنہ تالیف ۱۱۶۲ھ ہے اور قائم کا ۱۱۶۸ھ۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے کے سنہ تالیف کے متعلق کہیں کوئی صراحت نہیں کی۔ البتہ انند رام مخلص کے حال میں یہ فقرہ اُن کے قلم سے ایسا نکل گیا ہے جس سے اس کی نسبت قیاس قائم ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں قریب یک سال است کہ درگذشت ، یعنی جس وقت یہ تذکرہ زیر تالیف تھا، اس وقت مخلص کو مرے ایک سال ہوا تھا۔ مخلص کا سنہ وفات ۱۱۶۴ھ ہے۔ (ملاحظہ ہو خزانۂ عامرہ ، مطبوعہ نول کشور ، ص ۴۲۵)۔ لہٰذا یہ قیاس بالکل بجا ہے کہ اس کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ ہے اور چونکہ گردیزی نے اپنا تذکرہ میر صاحب ہی کے جواب میں لکھا ہے جس کے متعلق میں تذکرۂ ریختہ گویاں مولفہ گردیزی کے مقدمے میں مفصل بحث کر چکا ہوں۔ اس لئے اس سنہ کی صحت کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے۔ البتہ اسی سنہ میں دو تذکرے اور تالیف ہوئے تھے۔ ایک تحفۃ الشعرا، مولفہ افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی اور دوسرا گلشن گفتار مولفہ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی لیکن ان کا علم میر صاحب کو مطلق نہیں تھا۔ بلکہ میر صاحب کے بعد بھی جس قدر مشہور تذکرہ نویس ہوئے ہیں مثلاً قائم ، میر حسن ، مصحفی ، قائم ، شوق وغیرہ ، وہ سب ان سے لاعلم تھے۔

چند تذکرے میر صاحب سے قبل بھی لکھے گئے تھے۔ مثلاً
تذکرۂ سید امام الدین خاں بہ عہد محمد شاہ، جس کا حوالہ
میر حسن نے اپنے تذکرے میں دیا ہے۔ تذکرۂ خان آرزو،
مگر یہ تذکرہ فارسی شعراء کا ہے۔ تذکرۂ سودا، اس کا حوالہ
دو جگہ قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے مجموعۂ نغز میں
دیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسے کچھ غلط فہمی ہوئی
ہے۔ غالباً وہ قائم کے تذکرے کو سودا کا سمجھا ہے۔ بہر حال
میر صاحب کے سامنے ان میں سے کوئی تذکرہ نہ تھا"[1]

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے اس بیان سے صاف ظاہر
ہے کہ میر نے جب اپنا یہ تذکرہ نکات الشعراء لکھا اس وقت اُردو
میں شعراء کے تذکرے لکھنے کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ البتہ
فارسی شعراء کے تذکرے لکھے جاتے تھے اور میر کے زمانے ہی میں
فارسی شعراء کے بعض اچھے تذکرے لکھے گئے تھے۔ مثلاً خان آرزو
اور حاکم لاہوری کے تذکرے۔ میر کو فارسی شعراء کے انہیں تذکروں
سے تحریک ہوئی اور اُنہیں یہ خیال آیا کہ وہ اُردو شاعروں کا یہ تذکرہ
نکات الشعراء کے نام سے لکھیں۔ میر کو اُردو شاعری سے گہری دلچسپی
تھی اور چونکہ وہ اس "فن بے اعتبار" کو اعتبار سے ہم کنار کرنا چاہتے
تھے، اس لئے بھی ان کے دل میں اس تذکرے کو لکھنے کا خیال آیا۔
بہر حال میں نے اس طرح اُردو شاعروں کا یہ اولین تذکرہ لکھا جس

---

[1] ڈاکٹر مولوی عبدالحق : مقدمہ نکات الشعراء۔

میں ہم عصر اُردو شعرا، اُن کی شاعری اور اُن کے شاعرانہ ماحول کے بارے میں دِل چسپ معلومات فراہم کی۔ تاریخی موشگافیوں سے قطع نظر بھی کرلی جائے اور یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ میر کا تذکرہ اُردو کا پہلا تذکرہ نہیں ہے، تب بھی نکات الشعراء کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اُردو شاعروں کے حالات، اُن کے شاعرانہ ماحول، اُن کے کلام اور اَدبی و شعری اہمیت کو جس طرح یہ تذکرہ پیش کرتا ہے، شاید کوئی دوسرا تذکرہ اس طرح پیش نہیں کرتا۔

اس لئے نکات الشعراء اُردو شعراء کے تذکرے کی حیثیت سے ایک منفرد مرتبے کا مالک ہے اور اُردو تذکرہ نگاری کی روایت میں ایک بلند مقام رکھتا ہے۔

(۴)

میر کے زمانے میں اور ان سے قبل بھی عام رواج یہ تھا کہ تذکروں میں شاعروں کے حالات تفصیل سے نہیں لکھے جاتے تھے۔ البتہ اختصار کے ساتھ حالات کا ذکر کر کے ان کی شخصیت اور زندگی اور شاعری میں ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ میر نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ لیکن اشاروں اور کنایوں میں اُردو شاعروں کے حالات اور شخصیت کی ایسی تصویریں بنائی ہیں جن کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اب اُن میں جان پڑنے ہی والی ہے۔ یہ میر کے طرزِ اَدا اور اندازِ نگارش کی ساحری ہے کہ اُن کی بنائی ہوئی ہر شاعر کی تصویر منہ سے بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

میر نے نکات الشعراء میں زیادہ تر اپنے ہم عصر شعراء کے حالات لکھے ہیں۔ البتہ شروع میں صرف حضرت امیر خسروؒ، مرزا عبدالقادر بیدل اور مرزا معز فطرت وغیرہ کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا ہے۔

حضرت امیر خسروؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مجمع کمالات و صاحبِ حالات۔ فضائل او اظہر من الشمس است۔ احوال امیر مذکور در تذکرہ ہا مسطور۔ نوشتنِ ایں احقر العباد فضولیست۔ اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد"۔[1]

اور مرزا عبدالقادر بیدل کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"شاعر پُر زور فارسی، صاحب دیوان پنجاہ ہزار بیت و مثنویات وغیرہ۔ اوائل جوانی نوکر شاہزادۂ محمد اعظم شاہ بودند۔ بعد از چندے ترکِ روزگار گرفتہ فروکش کرد۔ از مذاق شعراء دریافتہ می شود کہ بہرۂ کلی از عرفان داشت۔ احوالش مفصلاً در تذکرہ ہا مرقوم است۔ دو شعر ریختہ بنام او شنیدہ می شود۔ شاید بتقریبے گفتہ باشد"۔[2]

اور مرزا معز فطرت کے بارے میں صرف اتنی معلومات فراہم کرتے ہیں:

"موسوی خاں خطاب است۔ معز و فطرت و موسوی ہر سہ تخلص می کند۔ احوال او من وعن در تذکرۂ سراج الدین

---

[1] میر: نکات الشعراء، ص ۲۔
[2] ایضاً، ص ۲۔

علی خاں کہ اُستاد و پیر و مرشد بندہ است مسطور"۔[1]

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر نے ان بزرگوں کا ذکر تفصیل سے نہیں کیا ہے۔ صرف اتنا لکھ دیا ہے کہ اُن کا ذکر تذکروں میں موجود ہے۔ البتہ ریختہ گو شعراء کی حیثیت سے اُنہوں نے ان شعراء کو اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اس کا اظہار کیا ہے اور دو ایک شعر بھی نقل کیے ہیں۔

میر کو اپنے ہم عصروں سے نسبتاً زیادہ دل چسپی تھی۔ وہ ان کے بارے میں زیادہ جانتے تھے۔ اُن کی شخصیت کے نقوش بھی اُن کے ذہن پر بہت گہرے تھے۔ اس لئے اُن کے حالات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُنہوں نے زیادہ دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔

سراج الدین علی خاں آرزو میر کے بزرگ تھے۔ اُنہوں نے اُن سے فیض بھی حاصل کیا تھا۔ حالانکہ ایک زمانے میں میر سے اُن کے تعلقات خراب ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود میر نے اُن کا ذکر جس طرح کیا ہے اُس سے خان آرزو کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ لکھتے ہیں :

"آب و رنگ باغِ نکتہ دانی، چمن آرائے گلزارِ معانی، متصرف ملک زور طلب بلاغت، پہلوان شاعر عرصۂ فصاحت، چراغِ دودمان صفائے گفتگو کہ چراغش روشن باد۔ سراج الدین علی خاں سلمہ اللہ تعالیٰ ابداً۔ شاعر زبردست، قادر سخن، عالم، فاضل، تا حال ہم چو ایشاں بہ ہندوستان جنت نشاں

---

[1] میر: نکات الشعراء، ص ۲۔

ہمم نہ رسیدہ بلکہ بحث در ایران می رود۔ شہرۂ آفاق، در سخن فہمی طاق۔ صاحب تصنیفات دہ پانزدہ کتب و رسالہ و دیوان و مثنویات۔ حاصل کمالات او شان از حیزۂ بیان بیرون است۔ ہمہ اُستادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگرد آں بزرگوار اند۔ گاہے برائے تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ این فن بے اعتبار را کہ ما اختیار کردہ ایم، اعتبار دادہ اند"[1]

اس بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خان آرزو اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔ فصاحت اور بلاغت میں اُن کا جواب نہیں تھا۔ ہندوستان ہی نہیں ایران تک میں اُن کی شہرت تھی۔ اُنھوں نے کثیر تعداد میں کتابیں تالیف کیں اور اُردو کے بیشتر شاعر اُن کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے خود بھی کبھی کبھی اُردو میں شعر کہے اور اس فن بے اعتبار کو اعتبار سے ہم کنار کیا۔

اسی طرح مرزا مظہر جان جاں کے بارے میں میر نے لکھا ہے کہ درویش صفت بزرگ تھے۔ میں خود بھی اُن کے پاس جاتے اور اُن سے استفادہ کرتے تھے۔ اُن کا زیادہ وقت یادِ الٰہی میں گزرتا تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے اور خوش تقریر ایسے تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ اُردو شاعری کے فن بے حاصل سے اُنھوں نے دل چسپی لی اور انعام اللہ خاں یقین اور حزیں وغیرہ ریختے میں اُن کے شاگرد تھے۔ میر لکھتے ہیں:

"مظہر تخلص مردے ست مقدس۔ مطہر، درویش، عالم،

---

[1] نکات الشعراء، ص ۳۔

صاحبِ کمال، شہرۂ عالم بے نظیر، معزز، مکرم، اصلش از اکبر آباد است۔ پدر او مرزا جاں نام داشت۔ از فرطِ شفقت مرزا جانِ جاں می گفت۔ از یں سبب بہ ہمیں اسم موسوم است۔ بندہ بخدمتِ او رفتہ سعادت اندوز گشتہ است۔ اکثر اوقات دریادِ الٰہی صرف می کند۔ خوش تقریر بہ مرتبہ است کہ در تحریر نہ می گنجد۔ دیوانِ مختصر فارسی بہ نظر فقیر مولف آمدہ است۔ از سلیم وکلیم پائے کمی ندارد۔ اگرچہ شعر گفتن دوں مرتبہ است لیکن گاہے متوجۂ ایں فن بے حاصل می شود۔ انعام اللہ یقین وحزیں کہ شاعر ریختہ اند، شاگرد او یند۔ غرض مرزا عجب کسے است"۔[1]

اور اپنے ہم عصروں میں سے حضرت خواجہ میر دردؒ اور مرزا رفیع سودا کا ذکر تو میر نے اپنے اس تذکرے میں کچھ اس طرح محبت سے کیا ہے کہ قلم توڑ دیا ہے۔ اس بیان کا لطف فارسی ہی میں ہے۔ اس لئے یہاں اصل کو نقل کیا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ میر دردؒ کے بارے میں لکھتے ہیں :

"میاں صاحب میاں خواجہ میر سلمہ اللہ تعالیٰ المتخلص بہ درد، جوشِ بہارِ گلستانِ سخن، عندلیبِ خوش خوانِ چمن ایں فن۔ زبانِ گفتگو یش گرہ کشائے زلفِ شامِ مدعا۔ مصرعہ نوشتہ اش بر صفحۂ کاغذ از کاکلِ صبح خوش نما۔ طبعِ سخن پرداز او سرو مائل چمنستان

---

[1] میر: نکات الشعراء، ص ۵۔

انداز ــــت۔ گاہے در کوچۂ باغ تلاش بطریق گل گشت قدم رنجہ می فرماید۔ در چمن شعرش لفظ رنگین چمن چمن۔ گلچین خیال او را گل معنی دامن دامن۔ شاعر زور آور ریختہ۔ کمال علاقگی وارستہ، خلیق، متواضع، آشنائے درست از درویشی بہرۂ وافی دارد، فقیر را بخدمت او بندگی خاص است۔۔۔ ایامے کہ فقیر بخدمت آں بزرگوار شرف اندوز می شد از زبان مبارکش می فرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد۔۔۔ مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است واللہ بہ ذات ہمیں بزرگ است۔ زیرا کہ پیش ازیں ایں مجلس بخانہ اش مقرر بود از گردش روزگار بے مدار برہم خورد۔ از بس کہ بہ ایں احقر اخلاص دلی داشت، گفت کہ ایں مجمع را شما اگر بخانۂ خود معین بکنید، بہتر است۔ نظر بر اخلاص آں مشفق عمل کردہ آمد"۔[1]

اور مرزا رفیع سودا کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں:

"جوانے ست خوش خلق، خوش خوئے، گرم جوش، یارباش، شگفتہ روئے۔ مولدِ او شاہ جہان آباد است۔ نوکر پیشہ، غزل و قصیدہ و مثنوی و قطع و مخمس و رُباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سر آمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گو است۔ بلاگردان ہر شعر ش طرف لُطف رستہ رستہ۔ در چمن

---

[1] میر: نکات الشعراء، ص ۴۹-۵۰

بندیٔ الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرع برجستہ اش
را سرو آزاد بندہ۔ پیش فکر عالیش طبع عالی شرمندہ، شاعر
ریختہ۔ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ اورا شاید۔"[۱]

غرض یہ کہ میر نے اپنے ہم عصر شعراء کی شخصیتوں کے خاکے اپنے اس تذکرے میں بڑے سلیقے سے بنائے ہیں۔ مختصر ہونے کے باوجود یہ خاکے ان شاعروں کی شخصیتوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں، اور یہ میر کے مخصوص اندازِ نگارش کی ساحری ہے کہ ان کی شخصیتیں پڑھنے والے کے حواس پر اس طرح چھا جاتی ہیں کہ وہ اُنہیں کبھی بُھلا نہیں سکتا۔

اُردو شاعروں کی شخصیتوں کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ میر نے اُن کے شاعرانہ اور اَدبی مرتبے کی اندازہ دانی کا کام بھی بڑی بصیرت کے ساتھ انجام دیا ہے۔ میر گہرے تنقیدی شعور کے مالک تھے۔ شعر کا صحیح ذوق اُن کی شخصیت میں رچا ہوا تھا۔ وہ بڑے ہی صاف گو اور دیانت دار شخص تھے۔ اُن کے پاس ادب و شعر کو جانچنے کے لیے کچھ اُصول اور معیار بھی تھے۔ اُن کا ذوقِ شعر بھی بہت بُلند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے نکات الشعراء میں شاعروں کے اَدبی مرتبے کا جو جائزہ لیا ہے، اُس میں اُن کی تنقیدی بصیرت ہر جگہ اپنے آپ کو رونما کرتی ہے اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اُس زمانے کے اَدبی ماحول کا نقشہ بھی سامنے آتا ہے۔

---

[۱] میر: نکات الشعراء، ص ۳۱۔

اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میر نے اس تنقیدی رائے کے اظہار میں اپنے آپ کو صرف مشہور شاعروں ہی تک محدود نہیں رکھا۔ ایسے شاعروں پر بھی رائے کا اظہار کیا ہے جو اپنے زمانے میں زیادہ مشہور نہیں تھے۔ مثلاً میر محمد حسین کلیم کے بارے میں میر یہ رائے دیتے ہیں:

"طرزش بہ طرز کسے مانا نیست۔ اکثر بہ زبان مرزا بیدل حرف می زند۔ در فہم شعر تہہ دار او فکر عاجز سخناں پشت دست بر زمیں می گزارد۔ طبع روان او مانند سیل روانست و فکر رسایش آن سوئے آسماں۔ بازوئے فکر تش زورین کش کمان معنی را۔ شعر پیچ دار پُر تاثیر او تیر کا گل ربا۔ اگرچہ کلیم در فارسی گزشتہ است اما کلیم ریختہ پیش فقیر این است۔"[۱]

اور میر سجاد کے کلام پر اس طرح اظہارِ رائے کرتے ہیں:

"سخن او بہ پایۂ استادی رسیدہ۔ چنین خوش گو و معنی یاب۔ اگرچہ در بند لفظ تازہ است لیکن بر زبان خامۂ او خیلہائے معنی سپاہی می کند۔ لب و دہن ہر کم لغلے نیست کہ پیش او چوں کاغذ سفید نشود۔ فکر رنگین او چمن تلاش را سایۂ ابر بہارے۔ ہر مصرع بندش را طرف لطف باچنارے۔ ہر بیت بحر خفیفش بر جگر نشتر زن۔ زبان طاقت بیانش رگ سخن۔ بے انصافی امر علیحدہ است وگرنہ تہہ داریٔ شعر او نمایاں

---

[۱] میر: نکات الشعراء، ص ۴۲۔

است"۔[1]

اور عبدالحیٔ تاباں کے کلام کے بارے میں یہ بلیغ فقرہ لکھا ہے:

"ہر چند عرصۂ سخن او ہمیں در لفظ ہائے گل و بلبل تمام است اما بسیار بہ رنگین می گفت"۔[2]

میر کی ان تنقیدی آراء سے یہ ظاہر ہے کہ انہیں اپنے زمانے کی اُردو شاعری سے گہری دل چسپی تھی اور وہ ہر شاعر کے بارے میں بصیرت کے ساتھ غور کرتے تھے اور اُن کے کلام میں اُن خصوصیات کو تلاش کرتے تھے جو اُصولی طور پر اُن کے نزدیک شاعری اور خصوصاً غزل کی شاعری کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً تہہ داری، تیرچ دار کیفیت، رنگینی، سادگی، صفائی، روانی، دردانگیزی، پُرسوز کیفیت وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ میر کے اس تذکرے میں صحیح تنقید پائی جاتی ہے۔ ان کی تنقید اُصولوں پر مبنی ہے۔ اسی لئے وہ کسی کے ساتھ رورعایت نہیں کرتے اور بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب "اس میں عموماً اور اکثر شعراء کے کلام پر منصفانہ اور بے باکانہ تنقید پائی جاتی ہے۔ یہ بات دوسرے تذکروں میں نظر نہیں آئے گی"۔[3]

(۶)

نکات الشعراء اُس زمانے میں دِلّی کی سرزمین پر لکھا گیا جب اُردو

---

[1] میر: نکات الشعراء۔ ص ۶۱۔

[2] ایضاً، ص ۱۰۸۔

[3] ڈاکٹر مولوی عبدالحق: مقدمہ نکات الشعراء، ص د۔

زبان اور اُس کی شاعری، فارسی کے گہرے اثرات کے باوجود، معاشرے اور ماحول میں اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ میر نے اس صورتِ حال کی پوری تفصیل اپنے اس تذکرے میں پیش کر دی ہے۔ اُردو زبان کی اصل، اُس کی اہمیت، اُس میں جو شاعری اُس وقت ہو رہی تھی، اس کی تفصیل، شاعروں کے اس شاعری کے بارے میں خیالات، اُن کے آپس کے ادبی و شعری روابط، محفلیں، مجلسیں، مل بیٹھنے کے طور طریقے، آپس کی محبّت اور نفرت، شکر رنجیاں غرض اس قسم کی بے شمار باتوں کا اس تذکرے سے اندازہ ہوتا ہے۔

اُردو زبان اور اُس کی شاعری کو اس تذکرے میں میر نے ریختہ کا نام دیا ہے اور بار بار اس بات کی وضاحت کی ہے کہ فارسی کے ساتھ ساتھ اب (یعنی اُن کے زمانے میں) اُردو شاعری کی گرم بازاری ہے۔ فارسی کے شاعر بعض سنجیدگی سے اور بعض برائے تفنن طبع فارسی کے ساتھ اُردو میں بھی شاعری کرنے لگے ہیں۔ زبان اور شاعری کے اُصول معین کیے جا رہے ہیں۔ اَدبی محفلیں منعقد ہونے لگی ہیں جن میں اُردو کے شاعر جمع ہوتے اور اپنا اپنا کلام ایک دوسرے کو سُناتے ہیں۔ اس طرح اُردو میں شعر کہنے اور سننے سُنانے کا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ شاعروں نے اُردو کلام کے بھی دیوان مرتب کرنے شروع کر دیئے ہیں اور تذکرۂ شعراء لکھنے کی داغ بیل بھی ڈال دی گئی ہے۔ غرض یہ کہ میر نے نکات الشعراء میں اُردو زبان اور شاعری کی ابتدا اور نشو و نما کے نشیب و فراز کی نہایت ہی دلچسپ؛ مُفید اور معلومات افزا تفصیل پیش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تفصیل اُردو زبان اور شاعری سے دِل چسپی لینے والوں، طالب علموں اور تحقیقی کام کرنے والوں

کے لئے ایک بیش بہا خزانہ ہے۔

نکات الشعراء کا آغاز ہی ریختہ یعنی اُردو زبان اور شاعری کے ذکر سے ہوتا ہے اور میر اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہیں کہ ریختہ فارسی شاعری ہی کی طرح ایک اندازِ شاعری ہے جس کو اُردوئے معلیٰ کی زبان میں تخلیق کیا جاتا ہے۔ لیکن آج تک اس کے بارے میں کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں ریختہ کے شاعروں کا حال احوال ہو۔ اس لیے میں (یعنی میر) اس خیال سے کہ ان شاعروں کے حالات محفوظ ہوں، میں یہ تذکرہ "تذکرۂ نکات الشعراء" کے نام سے لکھ رہا ہوں۔ میر لکھتے ہیں:

"پوشیدہ نماند کہ درفن ریختہ، کہ شعریست بطور شعر فارسی بہ زبانِ اُردو معلیٰ شاہ جہان آباد دہلی، بہ صفحۂ روزگار بماند، بناء علیہ، ایں تذکرہ کہ مسمی بہ نکات الشعراء نگاشتہ می شود"۔[1]

میر نے اپنے تذکرے میں اس تاریخی حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ ریختے یعنی اُردو کا آغاز دکن میں ہوا اور وہاں دکنی اُردو کے شاعر پیدا ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ اُنھوں نے دکن کے اُردو شعراء کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا۔ پھر بھی لکھا کہ ان میں سے بعض کو نکات الشعراء میں اُنھوں نے شامل کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"اگرچہ ریختہ از دکن است۔ چوں از آنجا یک شاعر مربوط برنخواستہ لہٰذا شروع بہ نام او نہ کردہ، وطبع ناقص مصروف

---

[1] میر: نکات الشعراء، ص ا۔

ایں ہم نیست کہ احوال اکثر آنہا ملال اندوز گردد۔ مگر بعضے از آں ہا نوشتہ خواہد شد۔"[۱]

بہرحال دکنی اُردو شعرا میں سے سعدی دکنی، غواصی، ولی، سراج اور داؤد وغیرہ کا ذکر اختصار کے ساتھ میر نے اپنے اس تذکرے میں کیا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہیں اُردو زبان کے ہر پہلو سے گہری دل چسپی تھی۔

میر کا زمانہ اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس زمانے میں اُن کے ہم عصر فارسی شعرا ریختے سے دِل چسپی کا اِظہار کر رہے تھے۔ میر نے اس تذکرے میں کئی جگہ اس کی طرف اشارے کیے ہیں۔

خان آرزو کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"ہمہ اوستادانِ فن ریختہ ہم شاگردانِ آں بزرگوارند۔ گاہے برائے تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ ایں فن بے اعتبار را کہ ما اعتبار کردہ ایم اعتبار دادہ اند۔"[۲]

اور قزلباش خاں اُمید کے بارے میں تو یہ دِل چسپ بات بھی لکھی ہے کہ ایک عرس کے موقع پر جب اُنہوں نے مجھے دُور سے دیکھا تو کہا کہ خوشی کی بات ہے کہ میں نے بھی ریختے میں دو شعر کہے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"در ہر سیر و تماشائی رفت و صحبت ہامی داشت چنانچہ یک روز در عرس سید حسن رسول نما[۳] صاحب قدس سرۃ العزیز

---

[۱] میر: نکات الشعرا، ص ۱۔
[۲] ایضاً۔

بندہ نیز بہ تحریک یارانِ موافق رفتہ بود۔ واو ہم تشریف
می داشت۔ چوں مرا از دور دید، گفت کہ خوش باشد کہ من
ہم دریں ایام دو شعر ریختہ موزوں کردہ ام، بشنوید۔" [1]

اور مرزا گرامی کے ذکر میں اُردو کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے
ایک دل چسپ بات یہ کہی ہے کہ جب اُنہوں نے دیکھا کہ ریختے کا ہنگامہ
گرم ہے تو خود بھی ریختے میں شعر کہے۔ لکھتے ہیں:

"چُوں دید کہ ہنگامہ ریختہ گرم شدہ خودش نیز شعر ریختہ
گفت بطورے کہ داشت۔" [2]

غرض یہ کہ میر کے ان بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اُن کے زمانے
میں اُردو کی اہمیت بڑھ رہی تھی اور بڑے بڑے شاعر اس زبان کی
ضرورت اور اس کی شاعری کی اہمیت کو محسوس کر رہے تھے۔ میر کے
تذکرے میں اس صورتِ حال کی ایک واضح تصویر نظر آتی ہے۔

میر نے نکات الشعراء میں اُن ادبی محفلوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں
ریختہ گو شعراء جمع ہوتے اور اپنا اپنا کلام سناتے تھے۔ ان بیانات سے
بھی اُردو کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ یہ محفل حضرت خواجہ میر دردؒ کے
ہاں ہوتی تھی۔ اس میں میر بھی شریک ہوتے تھے۔ لیکن پھر خواجہ صاحب
نے اپنی زبان مُبارک سے فرمایا کہ یہ مجلس اب میر کے یہاں ہونی چاہیئے۔
چنانچہ یہ مجلس میر کے ہاں منعقد ہونے لگی۔ خاصی تعداد میں اُردو کے

---

[1] میر: نکات الشعراء، ص ۷۔
[2] ایضاً، ص ۸۔

شعرا ان محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ صرف میر کے تذکرے نکات الشعرا میں اس کی کچھ تفصیل ملتی ہے۔

خواجہ میر دردؔ کے بیان میں لکھتے ہیں :

"ایامے کہ فقیر بخدمت آں بزرگوار شرف اندوزمی شد، از زبانِ مبارکش می فرمود کہ میر تقی میر تو میر مجلس خواہی شد۔ الحمد للہ المنتہ کہ حرف آں سر سلسلۂ خدا پرستان موثر اُفتاد مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است واللہ بہ ذات ہمیں بزرگ است۔ زیرا کہ بیش ازیں ایں مجلس بخانہ اش مقرر بود، از گردش روزگار بے مدار برہم خورد۔"

نکات الشعرا میں کئی شاعروں کے تذکرے میں میر نے اس مجلس ریختہ کا ذکر کیا ہے، کہیں کہیں اس کو مراختہ بھی کہا ہے۔ ان بیانات سے اُردو کے اس ماحول اور فضا پر روشنی پڑتی ہے جو میر کے زمانے میں قائم ہو گئی تھی۔ نکات الشعرا اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

تذکرے کے آخر میں میر نے ریختہ یعنی اُردو کے بارے میں بعض بڑی بصیرت افروز باتیں کہی ہیں۔ ان باتوں کی اہمیت بھی اس وجہ سے ہے کہ ان سے اس صورتِ حال کا اندازہ ہوتا ہے جس سے اُردو اس زمانے میں دوچار تھی۔

میر لکھتے ہیں :

"بدانکہ ریختہ بر چندیں قسم است۔ از انجملہ آنچہ معلوم

فقیراست نوشتہ می آید۔ اول آنکہ یک مصرعہ اش فارسی
ویک ہندی۔ چنانچہ قطعہ حضرت امیر علیہ الرحمۃ نوشتہ شد۔
دوم این کہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی۔ چنانچہ
شعر میر معزکہ نوشتہ آمد۔ سویم آنکہ حرف و فعل پارسی نگار
می برند واین قبیح است۔ چہارم آنکہ ترکیبات فارسی می
آرند۔ اگر ترکیب کہ مُناسب زبان ریختہ می اُفتد، آں جایز
است، واین را غیر شاعرنمی داند۔ وترکیبے کہ نامانوس ریختہ
می باشد آں مجبوب است و داستن این نیز موقوف سلیقہ
شاعری است، و مختار فقیر ہم ہمین است۔ اگر ترکیب فارسی
موافق گفتگوئے ریختہ بود مضائقہ ندارد۔ پنجم ایہام است
کہ در شاعران سلف دریں فن رواج داشت اکنوں طبع
ہا مصروف این صنعت کم است۔ مگر بہ بیار شتگی بستہ شود۔
و معنی ایہام این است کہ لفظے بود بنائے بیت بود آں دو معنی
داشتہ باشد۔ یکے قریب ویکے بعید۔ و بعید منظور شاعر
باشد و قریب متروک او۔ ششم انداز است کہ ما اختیار
کردہ و آں محیط ہمہ صنعت ہا است۔ تجنیس، ترصیع،
تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی،
خیال وغیرہ۔ این ہمہ ہا در ضمن ہمین است، و فقیر ہم از ہمین
وتیرہ محظوظم۔ ہر کہ را دریں فن طرز خاصے است این معنی را
می فہمد، با عوام کار ندارم۔ این کہ نوشتہ ام برائے یاراں
من سند است نہ برائے ہر کس۔ زیرا کہ عرصۂ سخن وسیع

است واز تلون چمنستان ظہور آگہم۔"

بر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"۔[1]

یہ طویل اقتباس صرف اس خیال سے یہاں دیا گیا ہے کہ اس سے میر کی ریختے سے دل چسپی، اس کے مسائل کی مزاج دانی اور اس کے معاملات کی اندازہ دانی کے شعور کا علم ہوتا ہے۔ میر کے سوا کسی اور نے اُن کے زمانے میں ان موضوعات پر اظہارِ خیال نہیں کیا۔ میر اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

(۷)

غرض یہ کہ اُردو زبان، اُردو شاعری اور اُردو کے شاعروں سے متعلق بڑی دِل چسپ اور مُفید تفصیل و جزئیات میر کے تذکرے نکات الشعراء میں ملتی ہے۔ یہ گویا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں عہدِ میر کی معاشرتی زندگی، تہذیبی حالات، تخلیقی رُجحانات، جمالیاتی میلانات اور لسانی معاملات کے خدوخال اپنے آپ کو پوری طرح رُونما کرتے ہیں۔ میر نے شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ان پہلوؤں سے متعلق مختلف معاملات و مسائل پر نہایت بلیغ اشارے کیے ہیں۔

اس تذکرے سے اس حقیقت کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ میر بنیادی طور پر ایک اَدبی انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر بات ادب و شعر

---

[1] نکات الشعراء: ص ۱۸۰۔

کے حوالے سے ہوتی تھی۔ وہ اپنے عہد کے ادبی و شعری ماحول کے خاموش تماشائی ہی نہیں تھے، اس کو بنانے، سنوارنے اور آگے بڑھانے میں ان کی عظیم شخصیت کا بڑا حصہ تھا۔ میر نے اس سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور یہ سب کچھ اُنہیں کی پہلودار شخصیت کی بدولت تھا کہ اُردو شاعری کے فن بے اعتبار کو اعتبار سے ہم کنار ہونے کا موقع ملا۔ یہ اُنہیں کی کوششوں کے نتائج تھے کہ اس زبان اور اس کی شاعری کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے آداب آئے۔

میر نے اُردو شعراء کے اس تذکرے میں جگہ جگہ اس صورتِ حال کی وضاحت کی ہے۔ کہیں کہیں اپنا ذکر بھی کیا ہے لیکن دوسرے، ہم عصر شاعروں کے حوالے سے اور نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ۔ اس سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس اعتبار سے ایک عظیم انسان تھے۔ اس عہد میں ان کی یہ عظیم شخصیت ہر طرف چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ شاعروں کو دیکھتے، ان کے فن کا جائزہ لیتے، ان کے کلام پر اصلاحیں دیتے، اَدبی محفلوں میں شریک ہوتے، بزرگانِ دین کے مزاروں پر حاضری دیتے اور زبان اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کرتے ہوتے دِکھائی دیتے ہیں لیکن جب اپنا ذکر کرتے ہیں تو صرف یہ دو فقرے لکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں:

"فقیر حقیر میر محمد تقی میر، مولف ایں نسخہ، متوطن اکبرآباد است۔ بسبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہ جہاں آباد است۔"[۱]

عبادت بریلوی

---

[۱] میر: نکات الشعراء، ص ۱۵۴۔

اسلامیانِ ہند کی تہذیب و ثقافت نے بارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں فارسی اور اردو کے جن شاعروں کو پیدا کیا اُن میں حضرت خواجہ میر دردؒ ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اُن کا شمار اُردو کے صفِ اوّل کے شعراء میں تو ہوتا ہی ہے لیکن فارسی کے ایک شاعر کی حیثیت سے بھی اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس لئے کہ اس میں صرف تغزّل اور حُسن و عشق کے معاملات کی ترجمانی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں اسلام اور خصوصاً اسلامی تصوّف کے اسرار و رمُوز کو نہایت سلیقے سے فن کارانہ انداز میں بے نقاب کیا گیا ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حضرت خواجہ میر دردؒ کی اُردو اور فارسی

شاعری اسلامیانِ ہند کی فکری اور فنّی اقدار کی صحیح ترجمان اور عکّاس نظر آتی ہے۔

حضرت خواجہ میر درد ۱۱۳۳ھ میں دلّی کی سرزمین پر پیدا ہوئے۔ اُن کے والد حضرت خواجہ ناصر عندلیبؒ اپنے زمانے کے مشہور صوفی بزرگ تھے۔ وہ تصوّف کے نقشبندیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُس زمانے کے مشہور صوفی بزرگ شاہ سعداللہ گلشنؒ سے اُنہیں خاص نسبت تھی اور وہ اُن کے ساتھ ارادت رکھتے تھے۔ خواجہ میر دردؒ نے اپنے والد کے سائے میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ چھوٹی عمر ہی میں انہوں نے اسلامی علوم، قرآن، حدیث، فقہ میں مہارت حاصل کر لی اور اس کے ساتھ ہی تصوّف کا علم بھی حاصل کیا اور راہِ سلوک پر بھی گامزن ہو گئے۔ سلسلۂ محمّدیہ، جس کے بانی حضرت خواجہ ناصر عندلیبؒ تھے، خواجہ میر دردؒ کی توجّہ کا مرکز بنا اور انھوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ اس سلسلے میں اسلامی شریعت کو نمایاں حیثیت حاصل تھی اور عشقِ رسولؐ اس کا محور تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیبہ اور اُسوۂ حسنہ کو اس سلسلے کے علمبردار مشعلِ راہ سمجھتے تھے۔ خواجہ میر دردؒ نے اپنے حلقے میں ان خیالات کو عام کیا اور اس طرح اسلام کی گراں قدر خدمت انجام دی۔

عنفوانِ شباب میں خواجہ میر دردؒ نے ملازمت بھی کی۔ تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ کچھ عرصے تک وہ سپاہی پیشہ رہے اور خود ان کے الفاظ میں "ہوا و ہوس کے عالم میں بھی کچھ وقت گزرا"۔ لیکن بالآخر انتیس ۲۹ سال کی عمر میں دُنیا کو خیرباد کہا اور درویشی اختیار کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔ اپنے رسالے نالۂ درد میں لکھتے ہیں کہ "فقیر یک چند در عنفوان جوانی بصورت

دُنیاداری گرفتار ماند و مرکب غفلت در میدان ہوا و ہوس دواند و ہنوز عالمِ جوانی باقی بود کہ دست ازیں عالم فانی، بے ثبات کشید و در سن بست و نہہ سالگی لباس درویشانہ پوشید۔"[۱] اور فقر و درویشی کے ساتھ اُن کا یہ رابطہ مرتے دم تک قائم رہا۔

اس طرح وہ اپنے والد حضرت خواجہ ناصر عندلیبؒ کے نقش قدم پر چلے اور اوّل المحمدیّینؒ کہلاتے۔ اپنے رسالے "آہِ سرد" میں لکھتے ہیں کہ "من شوریدہ حال حضرت محمد زبیرؓ و حضرت شاہ گلشنؒ را برائے حضرت قبلۂ کونین خودمی پرستم والا با وجود دریافت صحبت ہائے ایشاں و تفضل و مہربانی ہائے بے پایاں بالذات بندہ درگاہ حضرت خویش ہستم، اے باغباں گلستان ایجاد من ازاں سبب خیرخواہ گلشنم کہ دلدادۂ نالۂ عندلیب خویشتنم و در ہر مقام ہمیں آہنگ می سرایم و برنام عندلیب و گلشن فدایم ؎

باغباں ہرجا کہ باشم خیر خواہ گلشنم
من فدائے عندلیب و خاکِ راہِ گلشنم"[۲]

خواجہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا تھا۔ لاکھوں روپے کی جائیداد تھی، دُنیاوی اعتبار سے بلند سے بلند منصب بھی اُنہیں نصیب تھا لیکن انہوں نے ان سب کو ٹھکرا دیا، اور انہیں اس کے بدلے میں قربِ الٰہی کی ایسی دولت بیش بہا نصیب ہُوئی، جس پر بڑے بڑے امیروں اور بادشاہوں کو بھی رشک آتا۔ اُن کا دربار ہر ایک کے لئے کھُلا ہوا تھا اور کسب فیض کے لئے ہر شخص اُن کی خدمت میں حاضر

۱؎ نالۂ درد ص۵۸ ۲؎ آہ سرد ص۱۱۷

ہو سکتا تھا لیکن اُن کی محفل میں شریک ہونے کے کچھ آداب تھے۔ شاہ عالم ثانی کا یہ واقعہ کئی لکھنے والوں نے بیان کیا ہے کہ بادشاہ اکثر خواجہ صاحب کے ہاں حاضری دیتے تھے۔ ایک دن اُن کے پاؤں میں تکلیف تھی، پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ حضرت خواجہ میر دردؔ نے فوراً محسوس کیا اور فرمایا کہ یہ درویشوں کے آداب محفل کے خلاف ہے، بادشاہ نے فوراً معذرت کی اور آئندہ محتاط رہے۔

غرض یہ کہ خواجہ میر دردؔ کی درویشی بڑی بلند مرتبہ تھی۔ انہیں دُنیا کے جھمیلوں سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔ اس لئے وہ اُمراء و رؤسا سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ صرف عوام کی خدمت ان کا نصب العین تھا اور ان کی روحانی تعلیم و تربیت ان کے پیشِ نظر تھی، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے آستانے کو کبھی بھی نہیں چھوڑا اور اس آشوب قیامت کے باوجود جس سے دلّی اس زمانے میں دوچار تھی، وہ ہمیشہ دِلّی ہی میں رہے، بڑے بڑوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ نادر و ابدالی کی یلغاروں نے بڑے بڑوں کو جڑوں سے اُکھاڑ پھینکا اور وہ نہ جانے کہاں کہاں پناہ لینے کے لئے مجبور ہوئے لیکن خواجہ میر دردؔ اپنی جگہ سے نہ ہلے اور ان کے اس رویّے کی وجہ سے لوگوں کو خاصا سہارا ملا، ڈھارس بندھی رہی، ورنہ تو ایک فرد بھی دلّی کی سرزمین پر باقی نہ رہتا۔

حضرت خواجہ میر دردؔ کا انتقال ۱۱۹۹ھ میں ہوا اور وہ خاکِ پاک دِلّی ہی میں سُپردِ خاک ہوئے اور آج بھی وہ اسی سرزمین مینو سواد میں محوِ خواب ہیں جس کے ذرّے ذرّے میں بقولِ اقبالؔ ہمارے اسلاف کا لہو خوابیدہ ہے۔

خواجہ صاحب اسلامیانِ ہند کے نہایت سربرآوردہ مُرشد و رہنما

ہیں، اُنہوں نے صرف گوشے میں بیٹھ کر ہی افراد کی رہنمائی نہیں کی۔ اپنی تحریروں سے بھی لوگوں کے دلوں اور دماغوں کو منوّر کیا۔ اس سلسلے میں ان کے وہ رسالے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں جو انہوں نے اسلامی تصوف کے مختلف پہلوؤں پر لکھے اور جنہوں نے ان کو تصوف کا فلسفی بنا دیا ہے۔

پندرہ سال کی عمر میں خواجہ صاحب نے اس کام کا آغاز کیا اور اپنی وفات تک یہ کام کرتے رہے۔ ان کی پہلی تصنیف رسالہ اسرار الصلوٰۃ ہے۔ یہ رسالہ انہوں نے ۱۱۴۸ھ میں لکھا۔ اس میں نماز کے مختلف پہلوؤں کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اپنے والد محترم (حضرت خواجہ ناصر عندلیب) کی بدولت مجھ پر نماز کے مختلف پہلو پوری طرح واضح ہوئے۔ اس لئے میں نے اس رسالے کو لکھا تاکہ میرے یہ خیالات عارفوں کے لئے لُطف و انبساط کا باعث ہوں۔ رسالہ واردات ان کا دوسرا رسالہ ہے جس کو انہوں نے ۱۱۷۲ھ میں مکمّل کیا۔ یہ اُن واردات کا مجموعہ ہے جو عالم جذب و سلوک میں خواجہ صاحب پر گزری تھیں۔ ان واردات کو انہوں نے مختلف رُباعیات کی صورت میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں ۱۱۱ واردات ہیں، خواجہ صاحب کی تیسری تصنیف علم الکتاب ہے جو خاصی ضخیم ہے۔ اس کتاب میں ان ۱۱۱ واردات کی تشریح ہے جو انہوں نے رسالۂ واردات کی صورت میں پیش کی تھیں۔ خواجہ میر دردؔ کی چوتھی تصنیف نالۂ درد ہے۔ واردات اور علم الکتاب لکھنے کے بعد جو موضوعاتِ تصوف باقی رہ گئے تھے، ان کے بارے میں وقتاً فوقتاً خواجہ صاحب اظہارِ خیال کرتے رہے، خواجہ صاحب کے بھائی خواجہ میر اثرؔ نے ان خیالات کو جمع

کیا اور اس طرح رسالہ نالۂ درد کی تشکیل ہُوئی۔ اس رسالے میں تصوف اور اسلامی نظامِ اخلاق سے متعلق بڑی ہی اہم باتیں ہیں۔ نالۂ درد کے بعد خواجہ میر دردؒ نے آہِ سرد، شمعِ محفل، دردِ دل، حرمت غنا، واقعاتِ درد اور سوزِ دل وغیرہ رسالے تالیف کئے۔ ان کے موضوعات بھی تصوف اور اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کے مختلف پہلو ہیں۔ ان رسالوں نے خواجہ صاحب کو صحیح معنوں میں تصوّفِ اسلام کا مبصرّ اور فلسفی بنا دیا ہے۔

خواجہ میر دردؒ ایک صُوفی صافی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی ایک اہم ادبی شخصیت بھی تھے، شاہ گلشنؒ کے ساتھ تو اُن کا رابطہ تھا ہی لیکن ان کے ادبی ذوق کی نشو و نما میں بھی شاہ صاحب نے یقیناً نمایاں کام کیا ہوگا۔ پھر اس وقت کے جیّد عالم، ادیب اور زبان دان سراج الدین علی خاں آرزو سے بھی انہوں نے استفادہ کیا۔ بیشتر تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ فارسی زبان و ادب کی تعلیم خواجہ صاحبؒ نے خان آرزو سے حاصل کی اور اس میں کمال حاصل کیا۔ خان آرزو نے اپنے تذکرے مجمع النفائس میں خواجہ میر درد کے ادبی مزاج کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ "خواجہ میر جوانے است خیلے صاحب فہم و ذکا، با شعر ربط بسیار دارد بسیار ریختہ کہ الحال در ہندوستان رواج دارد، فارسی ہم خوب می گوید، چہ بسیار بہ مذاق آشنا است، بالقوۃ اس آں چہ دریافت می شود کہ در فن تصوف صاحب نامنہ۔ بہ زبان پارسی رباعی اکثر می گوید و خوب می گوید و با ایں عاجز رابطۂ خاصے دارد و خیلے شفقت بر احوال این عاجز نماید"

خان آرزو کا شمار اپنے عہد کے بزرگ ادیبوں اور جیّد عالموں میں ہوتا تھا اس لئے خان آرزو کا خواجہ میر درد کی اتنی تعریف کرنا اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ کم عمری ہی میں وہ اپنے ادبی مزاج کی وجہ سے مشہور ہو گئے تھے اور انہیں احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

اُن کی ادبی شخصیت کی عظمت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ادبی محفلوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے اور خود اپنی جائے قیام پر ادبی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ ان ادبی محفلوں میں ان کے ہم عصروں کا مجمع ہوتا تھا۔ تذکرہ "مردم دیدہ" میں لکھا ہے کہ "ایں عزیز بزرگ عالی دو دماں را فقیر مکرر نجانۂ خان آرزو او زمبر اختہ یعنی صحبتِ ریختہ گویان ہندی کہ دریا نیز دہم ہر ماہے مقرر بودہ، دیدہ ام۔ بسیار خلیق و متواضع و ضاحت معنی بہ نظر می آمد"[1] میر تقی میر نکات الشعراء میں لکھتے ہیں "ایامے کہ فقیر بخدمت آں بزرگوار شرف اندوز می شد از زبان مبارکش فرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد، الحمدللہ والمنۃ کہ حرف آں سر سلسلۂ خدا پرستاں موثر افتاد، باطن آن خضر قافلہ اہلِ عرفاں کہ ظاہرش ظاہر تر است، واللہ بہ ذات ہمیں بزرگ است۔ زیرا کہ پیش، از یں ایں مجلس بخانہ اس مقررہ بود از گردش روزگار بے مدار برہم خورد۔ از بس کہ بہ ایں دلی داشت گفت کہ ایں مجمع را شما بہ خانہ خود معین بکند بہتر است نظر بر اخلاص آں مشفق عمل کردہ آمد"[2]

---

[1]

[2] میر تقی میر: نکات الشعراء: مرتبہ راقم الحروف: ص ۶۴

غرض یہ کہ خواجہ میر دردؔ نہ صرف ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تھے بلکہ خود ادبی محفلیں سجاتے بھی تھے اور جیسا کہ میرؔ نے لکھا ہے ایسی محفلوں کو ترتیب دینے کی ترغیب بھی دیتے تھے اور یہ تمام باتیں ان کے ادبی مزاج کی وضاحت کرتی ہیں۔

خواجہ میر دردؔ نے اردو میں بھی شاعری کی اور فارسی میں بھی اور ان دونوں زبانوں میں اپنے دیوان مرتّب کئے۔ یہ دونوں دیوان اگرچہ مختصر ہیں لیکن اُردو اور فارسی شاعری کی روایت میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں ان کی واردات و کیفیات کا لہو ہے۔ ان میں کائنات اور تسخیرِ کائنات کی بصیرت ہے۔ ان میں انسان کی عظمت اور برتری کا خیال ہے، انسانی رشتوں کے تقدس کا احساس ہے۔ ان میں زندگی کی اعلیٰ قدریں ہیں، ارفع معیار ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں حُسن کی فن کاری اور فن کاری کا حُسن ہے اور ان میں جو غزلیں، قطعات، رُباعیات اور دوسری اصناف جمع کی گئی ہیں وہ فکر و خیال کے لئے غذا اور احساسِ جمال کے لئے تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

اُردو اور فارسی کے یہ دونوں دیوان ۱۱۹۹ھ میں مرتّب ہوئے یعنی اُسی سال جس سال حضرت خواجہ میر دردؔ کا انتقال ہُوا۔

خواجہ صاحبؒ کے اردو دیوان کے قلمی نسخے تو مختلف کتب خانوں میں خاصی تعداد میں محفوظ ہیں اور یہ بار بار چھپ کر شائع بھی ہُوا ہے لیکن فارسی دیوان کے قلمی نسخے کم ملتے ہیں اور یہ اردو دیوان کی طرح بار بار شائع بھی نہیں ہُوا ہے۔ آج سے تقریباً سو سال قبل ۱۳۰۹ھ میں اس فارسی دیوان کا نسخہ مطبع انصاری دہلی میں چھپ کر شائع ہُوا تھا لیکن اب یہ تقریباً ایک

صدی سے نایاب ہے۔

دیوان فارسی کے اس نسخے کی تفصیل اختتامیہ کی اُس عبارت سے ظاہر ہوتی ہے جو مرتب اور ناشر کی طرف سے آخر میں درج کی گئی ہے۔ اس مندرجہ ذیل اقتباس کو اس نسخے کے تعارف کے طور پر یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

"بیائید و بہ بینند کہ دریں روزہا دیوانِ سعادت بنیاں، حقائق ترجمان، خواجہ خواجگاں، وحید عصر، فرید زماں، در عشقِ الٰہی با نالۂ پُرسوز و باآہِ سرد، حضرت خواجہ میر محمدی المتخلص بہ دردؔ علیہ الرحمہ کہ ہم بر بام شاعری ماہ نیم ماہ و ہم بر آسمان معارف مہر نیم روز است، فروغ اشاعت پزیرفتہ است حضرت خواجہ جادۂ سخن وری را بہ پائے عرفاں بہ نہجے طے فرمودہ اند کہ کوئی کہ شائقانِ فن را بر خویش فریفتہ نمودہ اند۔ نازم بہ حق پژوہی عمدۃ السالکین زبدۃ العارفین قدوۃ الکاملین مولانا و اولینا سیدی سندی جناب مولوی سیّد نور الحسن خان صاحب کہ طبع والائے شاں بہ انطباع ایں دیوانِ لطافت نشاں مبذول توجہ گشت بہ ایمائے ممدوح الصدر کارپردازان ایں ادارہ چاپ نمودنش کوشش بلیغ وسعیٔ فراواں بہ کار بُردند"

(دیوانِ فارسی خواجہ میر درد: ص ۱۴۸)

خواجہ میر دردؔ کا یہ فارسی دیوان اسلامیانِ ہند کی تہذیبی و ثقافتی، ذہنی و فکری اور ادبی و شعری روایت کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت

ہوتا ہے اور اس عہد کی تہذیبی اور ادبی تاریخ کے ایک ماخذ کی حیثیت سے اس کی اہمیت مسلّم ہے۔

اس لئے اس نادر و نایاب نسخے کو اب تقریباً سو سال بعد ادارۂ ادب و تنقید اور مجلس اشاعت مخطوطات کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے۔

عبادت بریلوی

لاہور ۷ مئی ۱۹۸۱ء

(۲۷)

ولی اورنگ آبادی

ولی اورنگ آبادی کو اردو شاعری کا آدم کہا گیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہو یا غلط، لیکن اس حقیقت سے کسی کافر ہی کو انکار ہو سکتا ہے کہ ولی اُردو کے ایک اہم شاعر تھے۔ اُن کی انفرادیت اُن کی شاعری میں پوری طرح اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اُنہوں نے صحیح معنوں میں اُردو غزل کو غزل بنایا۔ اس کو صنفِ غزل کے صحیح مزاج سے آشنا کیا۔ انسانی زندگی کے لطیف اور حسین پہلوؤں کو اس میں جگہ دی۔ اُس کو گرمی اور روشنی سے روشناس کیا۔ انسانی رشتوں کے حسن و جمال کی ترجمانی کی اور اُس کے ان گنت پہلوؤں کو اس طرح صنفِ غزل میں داخل کیا کہ وہ خود حسن و جمال کا مجسمہ بن گئی۔ خارجیت اور حسیت کو انہوں نے غزل کے لئے گوارا بنایا اور مناظر و معاملات

کو پیش کرنے کا حسین و دلآویز تجربہ کیا۔ براہ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر انہوں نے اپنے عہد اور اس کے مختلف سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی پہلوؤں کی عکاسی کی، اور غزل میں ان پہلوؤں کو اس طرح داخل کیا کہ اس کے کارگہ شیشہ گری کو ذرا بھی ٹھیس نہیں لگی۔ وہ بہرصورت غزل باقی رہی۔ دکنی زبان کو اُنہوں نے اُردو زبان کا روپ دے دیا اور اس میں سادگی اور صفائی کے ایسے پہلو پیدا کئے کہ وہ غزل کی صحیح زبان بن گئی۔ وہ ایک بڑے فن کار اور عظیم خالق جمال تھے، اور اس کے اثرات ان کی غزل میں ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک بت ہزار شیوہ بن کر دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

میں طالب علمی کے زمانے سے ولی کی غزل کا گرویدہ اور دلدادہ تھا اور زندگی کے ہر دور میں یہ بت ہزار شیوا میرے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی رہی۔ چنانچہ ولی کی شخصیت اور شاعری کے مطالعے میں عمر عزیز کے تقریباً چالیس سال گزر گئے۔ اس عرصے میں میں نے دکن کی تاریخ، معاشرت اور تہذیب کا مطالعہ کیا، ولی سے قبل کی دکنی اُردو شاعری کی ورق گردانی کی۔ ولی کے حالات کا سراغ لگایا۔ اُن کے کلام کو اپنے دل میں جگہ دی، اور اُنہوں نے اُردو شاعری اور خصوصاً اُردو غزل میں جو کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں، اور اس صنف میں جو گراں قدر اضافے کئے ہیں، اُن سے اپنے آپ کو آشنا کرنے کی کوشش کی۔

اس طرح ولی کی شخصیت اور شاعری سے متعلق جو نتائج سامنے آتے، اُن کو اب اس کتاب "ولی اورنگ آبادی" میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس میں ولی کے حالات، شخصیت، ماحول، تصانیف، غزل گوئی، تصوف،

اور جمالیاتی پہلو پر مُفصل بحث ہے۔ جتنا مواد اس سلسلے میں دستیاب ہوسکا ہے، اور جو کام اس سے قبل ہوچکا ہے، میں نے اس کو بھی اپنے سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے یہ کتاب ولی کے مطالعے کے سلسلے میں مفید ثابت ہوسکتی ہے اور اگر اس میں دلچسپی کا کوئی سامان ہے تو ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ ولی کی شخصیت اور شاعری ہی کے حسن و جمال کا عکس ہے۔

کہنے کو تو ولی اُردو شاعری کے آدم تھے لیکن آج تک اُن کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ جیسا اور جس طرح ہونا چاہیئے تھا نہ ہوسکا۔ بحث زیادہ تر ان باتوں پر ہوتی رہی کہ آیا وہ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے یا گجرات احمد آباد کے۔ چنانچہ دکن کے لکھنے والے انہیں اورنگ آبادی ثابت کرتے رہے اور گجرات کے رہنے اُن کے گجراتی ہونے پر زور دیتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے کوئی قابل ذکر کام ولی پر نہ ہوسکا۔ ویسے ولی گجراتی کے نام سے جو کتاب ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی نے لکھی وہ قابل قدر ہے، اور دکن میں یادگار ولی اور نذر ولی کے نام سے جو مقالات مختلف اُستادوں اور طالب علموں نے لکھے وہ بھی اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ لیکن ولی کی اُردو شاعری کی روایت میں جو حیثیت اور اُن کی شاعری کی جو اہمیت ہے، اُس کے پیش نظر اُن کی شخصیت اور شاعری پر تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے مستقل کام ہونے چاہئیں تھے۔

یہی خیال اور احساس اس کتاب کی ترتیب و تالیف کا باعث بنا ہے۔ اس میں اور کچھ ہو یا نہ ہو ولی کی دلچسپ شخصیت اور پہلودار شاعری کو سمجھنے،

اور ان سے لُطف اندوز ہونے کا تھوڑا سا سامان ضرور موجود ہے۔
اسی لئے مجھے یقین ہے کہ اسے دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

لاہور

۲۵ر جون ۱۹۸۱ء

عبادت بریلوی

سیاحت نامہ

سیاحت نامہ اُردو کی پہلی ڈائری ہے اور برٹش میوزیم کے اس گراں بہا قلمی نسخے کی یہی سب سے اہم خصوصیت ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم خصوصیت اس نسخے کی یہ ہے کہ انیسویں صدی میں اسلامیانِ ہند سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور فکری اِعتبار سے جس آشوبِ قیامت سے دوچار تھے، اُس کی تصویریں بھی اس میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ اس لحاظ سے اس کو اُس عہد کی زندگی کا مرقع کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اگرچہ بلوم ہارٹ نے برٹش میوزیم کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست میں اس قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامیانِ ہند کی زندگی سے دلچسپی لینے والوں میں سے کسی نے بھی اس کا باقاعدگی کے ساتھ غور سے مطالعہ نہیں کیا، اسی لئے اس کی اہمیت محسوس نہیں کی گئی اور کوئی ڈیڑھ سو سال تک یہ قلمی نسخہ گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا۔

لندن کے دورانِ قیام میں مجھے اس قلمی نسخے کے بغور مطالعے کا موقع ملا، اور اُس کی لسانی، ادبی، معاشرتی، تہذیبی اور فکری اہمیت کے پیشِ نظر میرے دل میں اس کو شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ میں نے رسالہ "ادبِ لطیف" میں اس پر ایک مفصل مضمون لکھا، اور اس کے کچھ اقتباسات بھی تعارُف کے طور پر اس مضمون میں شامل کئے۔

اُردو زبان و ادب کے ماہروں اور بعض دانشوروں نے اس نسخے میں گہری دلچسپی لی اور اس کو کتابی صورت میں شائع کرنے پر اصرار کیا چنانچہ میں اس پر کام کرتا رہا، اور اب پندرہ سولہ سال بعد یہ قلمی نسخہ طباعت اور اشاعت کے قابل ہوا ہے۔

مقدمے میں اس نسخے کی تفصیل ہے، اور اس کے مصنف نواب کریم خاں کے حالات، ان کے لندن کے اس سفر کی تفصیلات اور اس شہرِ نا پرساں میں دو سال تک ان کی گوناگوں مصروفیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے "سیاحت نامہ" کے اس قلمی نسخے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اُردو کے مشہور فرانسیسی پروفیسر گارساں دی تاسی نے اس کتاب کے ابتدائی کچھ صفحات کا فرانسیسی ترجمہ (جو ہندوستان کے حالات سے متعلق تھے) تقریباً سو سال قبل شائع کیا تھا۔ لیکن پوری کتاب کبھی شائع

نہیں ہوئی۔

اب اُردو کی یہ پہلی ڈائری جو انیسویں صدی کے اسلامیانِ ہند کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، ذہنی اور فکری حالات کا مرقع ہے۔ مجلس اشاعت مخطوطات ادارۂ ادب و تنقید کی طرف سے شائع کی جارہی ہے۔ یہ ایک نئی ادبی دریافت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ اس کو نہ صرف یہ کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا، بلکہ انیسویں صدی میں اسلامیانِ ہند کی تاریخ و تہذیب پر تحقیقی کام کرنے والے بھی اس سے استفادہ کریں گے۔

عبادت بریلوی

لاہور
۲۵ جنوری ۱۹۸۲ء

برٹش میوزیم لندن کے شعبۂ مشرقی کے کتب خانے میں نواب کریم خاں کے "سیاحت نامہ" کا ایک قلمی نسخہ ہے جس کا ذکر بلوم ہارٹ نے برٹش میوزیم کے اُردو مخطوطات کی فہرست میں کیا ہے — لیکن صرف بلوم ہارٹ کے بیان سے اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس نے تو صرف اتنی معلومات فراہم کی ہے کہ سیاحت نامہ نواب کریم خاں کی ڈائری ہے جس میں انھوں نے اپنے قیامِ لندن کے حالات کی تفصیل پیش کی ہے نواب کریم خاں ریاست جھجّر کے رہنے والے تھے اور آخری تاجدار ہندوستان ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر نے انہیں اپنے سفر خاص کی حیثیت سے لندن بھیجا تھا۔ وہ یکم دسمبر ۱۸۳۹ء کو کشتی کے ذریعے دلّی سے کلکتہ روانہ ہوئے، اور وہاں سے ۴ مارچ ۱۸۴۰ء کو بحری جہاز میں سوار ہو کر ۲۷ جولائی ۱۸۴۰ء کو لندن پہنچے۔ اس سفر کی تفصیل اور لندن کی روزانہ مصروفیتوں کا حال انھوں نے اس کتاب میں لکھا ہے۔ یہ نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ کسی طرح گارساں دی تاسی کے پاس پہنچا اور اس نے اس کے پہلے حصّے (یعنی اس کے سفر ہندوستان کے حالات) کا ترجمہ

فرانسیسی زبان میں کرکے REVUE DL'ORIENT FOR 1865 میں شائع کیا تھا۔ دی تاسی نے اپنے مختصر سے پیش لفظ میں اس بات کی وضاحت بھی کی تھی کہ نواب کریم خاں کے تعلقات ڈاکٹر ڈنکن فوربس سے بڑے گہرے تھے، اور ڈاکٹر فوربس نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ نواب کریم خاں غیر معمولی ذہانت کے انسان تھے، اور انہیں یوپ کے نظامِ سیاست اور طرزِ حکومت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس نسخے کے شروع میں کچھ فارسی نظمیں اور شیخ سعدی کی گلستان کے چند اقتباسات بھی شامل ہیں[1]

میں نے اپنے قیامِ انگلستان کے زمانے میں، بلوم ہارٹ کے اس بیان کو پڑھ کر جب نواب کریم خاں کی ڈائری کے اس قلمی نسخے کو نکلوایا، تو مجھے یہ اُردو نثر کی بڑی ہی اہم کتاب معلوم ہوئی۔ مجھے یہ خیال آیا کہ یہ تو اُردو کی پہلی باقاعدہ ڈائری ہے جو ایک اہم شخص نے انگلستان میں بیٹھ کر لکھی ہے پھر میں نے سوچا کہ اس سے قبل اُردو میں ڈائری لکھنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اور میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ اس میں جس طرح ہندوستان کے حالات، بحری جہاز کے سفر کی روداد، اور اُنیسویں صدی کے وسط میں لندن کی سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کی تفصیلات اور سات سمندر پار سے آتے ہوتے ایک اہم غریب الوطن ہندوستانی مسلمان کے تاثرات اور تجربات کو جس طرح پیش کیا گیا ہے، اس کی مثال اور کہیں نہیں مل سکتی۔ —— نہ صرف یہ بلکہ اس میں تو مجھے اس وقت کے ہندوستان اور

---

[1] بلوم ہارٹ: فہرست مخطوطات اردو برٹش میوزیم لندن صفحہ ۵

اس کے باشندوں، خصوصاً مسلمانوں کی ذہنی کیفیات کی تصویریں نظر آئیں
اسی لئے میں نے اس اہم سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور ادبی اہمیت
رکھنے والے قلمی نسخے کو شائع کرنے کا ارادہ کیا۔

نواب کریم خاں کی اس ڈائری کا نام "سیاحت نامہ" ہے، جو خود مصنف کا لکھا ہوا ہے۔ سیاحت نامہ کا یہ قلمی نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ شروع کے چند صفحات میں نواب کریم خاں نے شیخ سعدی کی گلستاں سے کچھ پند و نصائح نقل کئے ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

تمام شد بہ خطِ ناکارہ ——— احقر العباد کریم، مقام لندن[1]"

اور آخر میں مندرجہ ذیل عبارت لکھ کر اس کو ختم کیا ہے:

"تمام شد نسخۂ سیاحت نامہ احقر العباد کریم خاں ولد قائم خاں
ابن طالب خاں بن طیّب خاں بن داؤد خاں، افغان سڑا بن
ساکن قصبہ جھجھر مضاف صوبہ دار الخلافہ شاہ جہاں آباد ابتدائے
تاریخ بست سویم شہر رمضان المبارک ۱۲۵۵ھ ہجرت رسالت
پناہ خاتم النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام وآلہ واصحابہ وسلّم مطابق
یکم دسمبر ۱۸۳۹ء عیسوی یوم یکشنبہ روانگی دار الخلافہ مذکورہ لغایت
تاریخ بست وسویم ماہ مذکور ۱۲۵۷ھ ہجری مطابق ہشتم نومبر ۱۸۴۱ء
عیسوی یوم دوشنبہ مقام لندن دار السلطنت جزیرۂ انگلینڈ۔

یاس و غم و آرزو جمع یہ سب چیز ہے   بل بے ترا حوصلہ دل بھی عجب چیز ہے

سینۂ و دل حسرتوں سے چھا گیا   بس، ہجومِ یاس جی گھبرا گیا

---

[1] سیاحت نامہ (قلمی نسخہ، صفحہ ۱۰)

"اللہ بس باقی ہوس[1]"

یہ نسخہ بڑے سائز پر نہایت خوش خط لکھا ہوا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نواب کریم خاں اعلیٰ درجے کے خوش نویس بھی تھے۔ نسخے کا کاغذ ولایتی ہے اور اُس کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ خطِ نستعلیق میں تیار کیا گیا ہے۔ اس کی ضخامت بڑے سائز کے ۳۲۸ صفحات ہے۔

اس کے پہلے صفحے پر کسی نے انگریزی میں یہ چند جملے لکھے ہیں :۔

JOURNAL KEPT BY KAREEM KHAN OF GUJJUR DURING HIS TRAVELS FROM DELHI TO LONDON AND DURING HIS RESIDENCE IN ENGLAND IN 1839 AND 41 (WRITTEN IN HIN-DOOSTANEE)

اور آخری صفحے پر یہ عبارت ملتی ہے :

BT. OF ZURGATCH - C. G. DE TASSY 1.

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ نسخہ کسی طرح لندن سے نکل کر گارساں دی تاسی کے پاس پہنچا۔ چونکہ اس کو ہندوستان اور اردو زبان سے گہری دلچسپی تھی اس لئے اس نے اس کے ابتدائی حصّے کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں شائع کیا۔ یہ حصّہ ہندوستان سے متعلق ہے اور اس میں نواب کریم خاں نے اپنے دلّی سے کلکتہ تک کے سفر کی روداد لکھی ہے —— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاحت نامہ کا یہ قلمی نسخہ کچھ عرصے گارساں دی تاسی کے پاس رہا۔ لیکن جب اس کی وفات کے بعد اس

---

[1] سیاحت نامہ

کا کتب خانہ منتشر ہوا تو یہ کسی طرح پھر لندن واپس پہنچا اور برٹش میوزیم نے اس کو خرید کر محفوظ کر لیا، اور اب یہ گراں بہا قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے شعبۂ مشرقی کے کتب خانے کی ملکیت ہے۔

۲

نواب کریم خاں کے حالات کی تفصیل کسی تاریخی یا ادبی کتاب میں نہیں ملتی۔ ان سے یادگار صرف لندن کی یہ ڈائری ہے جس میں ان کے کچھ حالات مل جاتے ہیں۔ وہ ریاست جھجھر کے رہنے والے تھے اور وہاں کے سڑابن افغان خاندان سے اُن کا تعلق تھا۔ وہ نواب قائم خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے دادا کا نام طیب خاں تھا۔ لیکن اس کی تفصیل نہیں معلوم ہوتی کہ جھجھر میں ان کی حیثیت کیا تھی اور یہ کہ وہ کن کن عہدوں پر فائز رہے ـــ قیاس یہ کہتا ہے کہ نواب کریم خاں کے خاندان کا تعلق جھجھر کے نوابوں سے رہا ہوگا، اور اس ریاست میں یہ لوگ اہم عہدوں پر فائز رہے ہوں گے۔ ایک بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے، وہ یہ کہ انگریزوں سے نواب کریم خاں کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ لندن جانے سے قبل دو سال تک گورنر جنرل کے ساتھ شملے میں بھی اُن کا قیام رہا تھا۔ "سیاحت نامہ" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"صبح ویرانہ سے روانہ منزل مقصود کا ہوا۔ اور بیچ راہ کے مس کالوین پرایویت سکریٹری گورنر جنرل بہادر کی سے، کہ یہ سواری بجرے کے راہ دریا سے الہ آباد کو جاتے تھے، ملاقات کی۔ چوں کہ راقم دو برس کے عرصے تک ہمراہ نواب مستطاب معلی القاب گورنر جنرل بہادر کے بیچ دوری، ملک پنجاب و کوہستان

ضلع شمالی کے، کہ عوام الناس اس کو شملہ کہتے ہیں، رہا ہے۔
اس زمانے میں اکثر صاحب موصوف سے ملاقات رہتی تھی۔"[1]

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں سے ان کے تعلقات تھے اور وہ دو سال تک شملہ میں گورنر جنرل بہادر کے ساتھ رہے تھے۔ البتہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ قیام کس سلسلے میں تھا لیکن اس سے یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ نواب کریم خاں اپنے وقت کی اہم شخصیت تھے اور انگریزوں کے ساتھ ان کا رابطہ خاص تھا۔

ہو سکتا ہے اسی رابطے اور تعلقات کے پیش نظر انگلستان بھیجنے کے لئے ان کا انتخاب کیا گیا ہو۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا ہے وہ یکم دسمبر ۱۸۳۹ء کو اوکھلہ (دہلی) سے کشتی میں سوار ہو کر کلکتہ روانہ ہوئے، اور وہاں سے ۱۴ مارچ ۱۸۴۰ء کو بحری جہاز میں بیٹھ کر یکم دسمبر ۱۸۴۰ء کو لندن پہنچے۔ لندن میں ان کا قیام ۸ نومبر ۱۸۴۱ء تک رہا۔ اسی تاریخ کو انہوں نے اپنی ڈائری ختم کی۔

اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ ۱۸۴۱ء کے بعد وہ لندن سے کہاں گئے؟ کب ہندوستان واپس پہنچے؟ یہاں آنے کے بعد اُن کے مشاغل کیا رہے؟ اور کب ان کا انتقال ہوا؟

جہاں تک ان کے قیام لندن کا تعلق ہے، اُس کے بارے میں ہمارے پاس خاصی معلومات ہیں۔ وہ لندن میں شان و شوکت سے رہتے تھے۔ اہم شخصیتوں سے ان کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ملکہ وکٹوریہ تک سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فوربس سے ان کے خصوصی تعلقات تھے ٹیپو سلطان

---

[1] قلمی نسخہ سیاحت نامہ ص ۷

کے جلاوطن بیٹے شاہزادہ جہانگیر زماں جامع الدین محمدؒ سے بھی اکثران کا ملنا جلنا رہتا تھا۔ غرض وہ لندن میں خاصی اہم شخصیت تصور کئے جاتے تھے۔ لیکن افسوس کہ جس مقصد سے وہ لندن گئے تھے اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اگرچہ اپنے مشن کو تکمیل سے ہم کنار کرنے میں اُنھوں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی لیکن ان کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ مایوسی کے عالم میں ناکام وطن واپس ہوتے، 'سیاحت نامہ' میں واضح طور پر اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :-

"واضح ہو کہ اس مقدمہ کو بے مقدوری کی حالت میں واسطے دادرسی اپنی کے ملک انگلینڈ میں آنا گویا رنج بیہودہ اُٹھانا ہے۔ اور اگر کوئی دردمند دل میں یہ سمجھے کہ اگر میں اس قدر دور دراز سے سفر غربت کو اپنے اوپر گوارا کر کے جاؤں گا تو شاید وہ لوگ رحم کریں۔ یہ محض خیال باطل ہے۔ کس واسطے کہ جن شخصیتوں سے اس کو کام پڑے گا ان کے دل میں خوفِ خدا اور رحم بالکل نہیں۔ اور ان کے مزاج پر وہاں تک رسائی نہیں ہو گی اُس کا فقر اور احتیاج اس امر کا مانع ہو جائے گا۔"[1]

اس زمانے میں مسلمان والیان ریاست اور اُمراء و رؤساء کے بے شمار مقدمات لندن میں زیرِ سماعت تھے۔ ان کی پیروی کے لئے جیسا کہ نواب کریم خاں کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے، ہندوستان سے لوگ آتے تھے لیکن سوار خوار ہونے کے اور کوئی چیز انہیں نصیب نہیں ہوتی تھی۔ اس کا تجربہ خود نواب کریم خاں کو بھی لندن میں ہوا۔

---

[1] سیاحت نامہ

ویسے اس میں شبہ نہیں کہ لندن میں اُن کی حیثیت ہندوستان کے ایک باقاعدہ سفیر کی تھی۔ بلوم ہارٹ نے ان کے سفرلندن کے بارے میں واضح طور پر لکھا تھا کہ وہ بہادر شاہ ظفر کے سفیر خاص کی حیثیت سے لندن آئے تھے۔ اصل الفاظ یہ ہیں :-

HE WAS SENT IN A.D. 1839 BY THE EMPERON, BAHADUR SHAN ON A MISSION TO LONDON, AS AN ENVOY TO THE DIRECTORS OF EAST INDIA COMPANY."

لیکن دراصل اس سفر کا بنیادی مقصد جھجھر کے نواب حسن علی خاں کے مقدمے کی پیروی تھا۔ لندن میں وہ اچھی طرح رہتے تھے۔ مصروف زندگی گذارتے تھے۔ بڑے بڑے لوگوں سے ملتے تھے۔ مسلمان جلاوطن شہزادوں کی دل دہی کرتے تھے اور ہندوستان سے آتے ہوئے جو لوگ اس وقت لندن میں موجود تھے انہیں مفید مشورے دیتے تھے۔ غرض اُس وقت کے لندن کی زندگی میں ان کی شخصیت کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔

۳

نواب حسن علی خاں جن کے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں نواب کریم خان لندن گئے تھے۔ یہ نواب حسن علی خاں جھجھر کے نواب نجابت علی خاں کے بیٹے تھے۔ جب لارڈ لیک کی فوجوں نے دلّی میں داخل ہوکر مرہٹہ سردار جسونت راؤ ہولکر کو نکالا اور اس کا پیچھا کیا تو بیاس ندی تک جو اہم لوگ ان کے ہمرکاب رہے، ان میں ایک نجابت علی خاں بھی تھے۔ اسی کے صلے میں انگریزوں کی طرف سے انہیں جھجھر کی ریاست ملی ــــ نواب

نجابت علی خاں کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نواب فیض محمدؐ خاں اور نواب فیض محمدؐ خاں کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے نواب فیض علی خاں تخت نشین ہوئے ــــ نواب فیض علی خاں کے بعد ریاست ان کے بیٹے عبدالرحمٰن خاں کو پہنچی۔ یہ عبدالرحمٰن خاں وہی ہیں جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف لڑے تھے۔ اور جن کو انگریزوں نے جنگ ختم ہونے کے بعد دلّی میں پھانسی پر چڑھا دیا تھا۔

جیسا کہ عام طور پر ریاستوں میں ہوتا ہے جھجر کی ریاست میں بھی جاگیروں اور جائیدادوں کے معاملے میں مختلف اسیروں کے درمیان خاصے اختلافات تھے۔ چنانچہ نواب فیض محمد خاں کے زمانے ہی میں چند پرگنوں پر نواب فیض طلب خاں سے جھگڑا ہوا اور معاملہ انگریزوں تک پہنچا۔ انہوں نے نواب فیض طلب خاں کے حق میں فیصلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نواب شمس الدین خاں سے مل کر مسٹر فریزر کو قتل کرایا گیا۔ نواب شمس الدین خاں کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ نواب فیض محمدؐ خاں بچ تو گئے لیکن اس واقعہ کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ جلد ہی خوف کی وجہ سے مر گئے۔ فیض محمد خاں کے مرنے کے بعد نواب فیض علی خاں تخت نشین ہوئے، اور جب ان کا انتقال ہوا تو اُن کے بیٹے عبدالرحمٰن خاں کو ریاست ملی۔ اس موقع پر نواب حسن علی خاں نے پھر یہ دعویٰ کیا کہ چونکہ عبدالرحمٰن خاں کنیزک زادے ہیں اس لئے ریاست عبدالرحمٰن خاں کو نہیں بلکہ انہیں ملنی چاہیئے لیکن انگریزوں نے فیصلہ عبدالرحمٰن خاں کے حق میں کیا ــــ نواب حسن علی خاں اس مقدمے کو انگلستان تک لے گئے لیکن وہاں بھی فیصلہ اُن کے حق میں نہ ہوا۔

ان واقعات کی تفصیل برٹش میوزیم ہی کے ایک اور قلمی نسخے کیفیت احوال

جھجھر وغیرہ میں ملتی ہے۔ اس کے چند اقتباسات دلچسپی سے خالی نہیں۔
اس لئے یہاں درج کئے جاتے ہیں :۔

"شروع عملداری سرکار دولت مدار کے نواب نجابت علی خاں
ابائی سرکار کی رفاقت میں حاضر ہوا اور تعاقب راجہ جسونت
راؤ ہولکر میں ہمراہ رکاب نواب مستطاب لارڈ لیک صاحب
بہادر کے بیاس ندی تک گئے تھے۔ بعد محاورات اور سلوک
راجہ موصوف کے لاٹ صاحب ممدوح نے آٹھ لاکھ روپے
جمع کئے۔ پرگنات نواب نجابت علی خاں کی جاگیر میں عطا فرمائے
۔۔۔۔ جھجھر، بادلی ۔۔۔۔ اور پرگنہ پاٹودی نواب فیض طلب خاں
کے نام ۔۔۔۔

بعد چندے نواب نجابت علی خاں مر گئے اور ان کے بیٹے
فیض محمد خاں گدی نشیں ہوئے نواب نجابت علی خاں کے عہد
میں نواب فیض علی خاں نائب اور مختار کل دخل اور خرچ نواب
نجابت علی خاں کے تھے اور نواب نجابت علی خاں کے سوائے
پرگنہ پاٹودی کے دو پرگنہ اپنے نام جاگیر لکھوالئے۔ بعد وفات
نواب نجابت علی خاں کے درمیان نواب فیض محمد خاں اور فیض طلب
خاں کے قضایا ہوا اور نواب فیض محمد خاں نے پرگنات جھجھر اور بادلی
نواب فیض طلب خاں سے چھین لئے۔ نواب فیض طلب خاں
سرکار میں نالشی ہوتے اور سند مہری نواب نجابت علی خاں کی
پیش کی۔ نواب فیض محمد خاں نے جواب دیا کہ میرے باپ کی مہر
آپ کے پاس رہتی تھی، اپنے ہاتھ سے مہر کر لی ہوگی۔ اس

سر چارلس مٹکف صاحب رزیڈنٹ دہلی نے یہ ارشاد فرمایا کہ کرنل مالکم صاحب بہادر نے جاگیر کی ایسی مضبوطی کی تھی کہ کسی نوع سے مداخلت اہالی سرکار کی اس میں نہ ہوتی نہ الا۔ یہ قضیایا سبب دخل اہالی سرکار کا ہو گیا — بعد چندے نواب فیض محمد خاں نے اور نواب شمس الدین خاں نے شریک ہو کر مسٹر فریزر بہادر کو قتل کروایا۔ چنانچہ شمس الدین نے پھانسی پائی اور نواب فیض محمد خاں اس سزا سے محفوظ رہے۔ الا اسی خوف اور دبدبے میں مر گئے اور اپنی حیات میں ایک وصیت اپنے خاندان کے واسطے لکھ گئے کہ ہماری ریاست میں کوئی کنیزک زادہ مالک ریاست کا نہ ہو، اور وہ وصیت نامہ دس برس قبل نواب حسن علی خاں، فیض محمد خاں کے بھائی نے نواب مستطاب لارڈ اکلنڈ صاحب کے حضور میں بہ مقام شملہ پیش کیا تھا۔ اس غرض سے کہ بہ موجب اس وصیت نامہ کے سرکار کو ہماری ریاست میں دست اندازی کا اختیار حاصل ہے۔ فقط۔

بعد نواب فیض محمد خاں کے نواب فیض علی خاں، اُن کا بیٹا مالک ریاست کا ہوا۔

عرصہ زیادہ ایک مہینہ کا ہوا کہ نواب فیض علی خاں قضائے الٰہی سے مر گئے۔ بعد موت نواب فیض علی خاں کے حسن علی خاں، نجابت علی خاں کے بیٹے اور علی محمد خاں، نواب فیض محمد خاں کے چھوٹے بیٹے نے، عرائض اپنے اپنے دعوے کے صاحب اجنٹ کے حضور میں گذارنے کہ بہ موجب وصیت نواب فیض محمد

خاں کے عبدالرحمٰن خاں اور دونوں کنیزک زادوں کو اور فیض علی خاں کو ریاست نہیں پہنچتی، ہم کو پہنچتی ہے فقط

اور حسن علی خاں جو بیٹا نجابت علی خاں کا ہے اور دعویٰ کرتا ہے جو کہ بعد مرنے نجابت علی خاں اور فیض محمد خاں کے سوائے تین ہزار روپیہ ماہوار کے اس کو کچھ حق نہیں پہنچتا۔ علاوہ بریں ولایت تک وہ نالش کر چکا اور کچھ نہ پایا۔ اس کا دعویٰ محض بے جا تین پشت اس کے باپ کی گذر گئی۔ فقط

نیز دریافت ہوا کہ نواب علی محمد خاں نے کپتان الحلم صاحب قلعہ دار کے پاس جا کر معرفت چٹھی کپتان صاحب موصوف کی، صاحب اجنٹ بہادر کے پاس بھیجی تھی صاحب اجنٹ اس کو پڑھ کر بہت ناراض ہوئے۔ اس وقت ایک خط حسن علی خاں کا آیا، اس میں لکھا تھا کہ علی محمد خاں نے تو اپنا لا دعویٰ لکھ دیا، اب مستحق ریاست کا میں ہوں عبدالرحمٰن خاں نہیں ہے۔ فقط

بعد ازاں دریافت ہوا کہ علی احمد خاں نے اب مولوی صدرالدین خاں بہادر صدر الصدور سے رجوع کیا ہے، اور مولوی صاحب ذمہ دار ہوتے ہیں اور معرفت اپنی کسی مختار کار کو اکبر آباد بھیجا ہے۔ اگر یہ بات ظہور میں آتے گی بعد تحقیقات کے مفصل مع نام مختار کار عرض کیا جاوے گا۔

المرقوم ۲۶ ماہ اکتوبر ۱۸۴۵ عیسوی[1]

---

[1] قلمی نسخہ کیفیت احوال جھجر وغیرہ ص ۳۷ تا ۴۵

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نواب نجابت علی خاں والئ جھجھر کے بیٹے نواب حسن علی خاں اپنے والد کی وفات کے بعد آخر دم تک ریاست جھجھر کو حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے دلّی، شملہ اور لندن تک مختلف عدالتوں میں اپنا مقدمہ لڑا۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں کامیابی نہ ہو سکی۔

نواب کریم خاں اسی مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں لندن بھیجے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ نواب حسن علی خاں نے یہ کام ان کے سپرد کیا تھا — لیکن اُس وقت دلّی میں دو حکومتیں تھیں۔ ایک تو مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی اور دوسری انگریزوں کی۔ مغل شہنشاہ کے اختیارات اگرچہ بڑی حد تک محدود تھے اور لارڈ لیک کی فتح کے بعد دلّی میں انگریزوں کا سکّہ چلتا تھا — لیکن اس کے باوجود بغیر مغل شہنشاہ کی منظوری کے، کسی معاملے میں انگریز قدم اُٹھاتے تھے۔

قیاس یہ کہتا ہے کہ نواب کریم خاں کے لندن جانے کا معاملہ بہادر شاہ ظفر کے سامنے رسمی طور پر پیش ہوا ہوگا، اور انہوں نے نہ صرف اس کی منظوری دی ہوگی بلکہ انگلستان میں انہیں اپنا سفیر مقرر کیا ہوگا۔ کیونکہ اس مقدمے کے علاوہ اُس وقت کتنے ہی ہندوستانی امراء و رؤسا اور والیان ریاست کے مقدمے انگلستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالت میں زیر غور تھے۔ ان سب کی دیکھ بھال نواب کریم خاں کے سپرد کی گئی ہوگی۔ لندن میں نواب کریم خاں کا اندازِ زندگی اس کو صحیح ثابت کرتا ہے۔ کیونکہ اپنے لندن کے دورانِ قیام میں انہوں نے صرف نواب حسن علی خاں کے مقدمے ہی کی پیروی نہیں کی بلکہ ہندوستان کے دوسرے والیان ریاست کو

ان کے مقدمات میں مشورے بھی دیتے اور کسی حد تک اُن کی نگرانی بھی کی۔ مسلمان والیان ریاست کے علاوہ مرہٹے تک ان سے ملنے آتے تھے اور گھنٹوں تک اپنے معاملات میں مشورے کرتے تھے۔

غرض یہ کہ لندن میں ان کو اپنے عہد کی ایک اہم شخصیت تصوّر کیا جاتا تھا اور وہ انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں میں یکساں عزّت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

۴

نواب کریم خاں جس مقصد سے لندن گئے تھے اُس میں تو اُنہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی لیکن لندن میں ان کا قیام اس حیثیت سے مفید رہا کہ اُنہوں نے اُردو زبان کو پہلی ڈائری دی۔ اس سے قبل اُردو زبان میں ڈائری لکھنے کا کوئی تصوّر نہیں تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نواب کریم خاں کو اردو زبان میں بہ حیثیت ایک ڈائری لکھنے والے کے اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔

یہ ڈائری کئی لحاظ سے اہم ہے اس میں ایک اہم شخصیت کے روزانہ کے معمولات، اس کے سفر کے حالات، زندگی کے مختلف شعبوں سے اس کی دلچسپی، اہم شخصیتوں سے اس کے تعلقات، اُس کے عقائد، توہمات، خیالات، نظریات ان سب کی تفصیل نہایت دلکش انداز میں پیش کی گئی ہے اور اس صورتِ حال نے اس کو ایک ایسا آئینہ بنا دیا ہے جس میں اس شخصیت کا عکس پوری طرح دیکھا جا سکتا ہے۔

ہندوستان اور انگلستان کے بارے میں نہایت مفید معلومات بھی اس میں فراہم کی گئی ہے اور لندن کی زندگی کا تو ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

جس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ اُنیسویں صدی کے وسط میں لندن کے ساتھ تھا، اس میں کس قسم کے لوگ رہتے تھے، ان کی دلچسپیاں کیا تھیں، مسائل کیا تھے، ان کے سوچنے کا انداز کیا تھا۔ ان کے علوم و فنون کی کیفیت کیا تھی، معاشرت اور تہذیب کا کیا حال تھا۔ یہ ڈائری ان سب کا ایک نہایت ہی حسین مرقع ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے لکھنے والے کی آنکھیں اس زمانے میں جلوۂ دانش فرنگ سے خیرہ نہ ہو سکیں۔ اس نے لندن میں بھی خاک مدینہ و نجف کو اپنے لئے سرمہ بنایا۔ نواب کریم خاں خاصے دین دار اور بلند کردار انسان تھے۔ اُنہوں نے لندن میں کئی سال کا عرصہ گذارا لیکن وہاں کا گوشت نہیں کھایا۔ شراب نہیں پی، اور اس کے علاوہ کوئی خلافِ شرع کام نہیں کیا۔ وہ اسلام کے سچّے پرستار تھے، مسلمانوں کے درد سے ان کا دل بھرا ہوا تھا۔ اس کا اظہار اُنہوں نے اس ڈائری میں جگہ جگہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک نہایت پاکیزہ سی فضا نظر آتی ہے اور انسان دوستی اور اخلاق کے اعلیٰ معیار ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔

اُنیسویں صدی میں ہندوستان کے مسلمان جس آشوب قیامت سے دوچار تھے، اور ان کی سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، ذہنی اور جذباتی زندگی میں انتشار اور افراتفری کا جو دور دورہ تھا اس کی تفصیل بھی اس ڈائری میں بڑے سلیقے سے پیش کی گئی ہے اور اس صورت حال نے اس کو انیسویں صدی کے مسلمانوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک نگار خانہ بنا دیا ہے۔

اس کتاب کی انہیں خوبیوں کے پیشِ نظر میں نے اس کو شائع کرنے کا منصوبہ بنایا مجھے یقین ہے کہ انیسویں صدی کے ہند کی تاریخ، تہذیب، معاشرت اور زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس ڈائری میں دلچسپی کا خاصا سامان نظر آئے گا۔

عبادت بریلوی

لاہور
۲۵ جنوری ۱۹۸۲ء

(۴۹)

دیوانِ ولا

میں نے جب سے مولانا سید محمدؒ، مرزا محمد عسکری، مولانا حامد حسن قادری اور اُردو کے دوسرے ادبی مؤرخوں کے یہ بیانات پڑھے تھے کہ مظہر علی خاں وِلاؔ نے تقریباً تین سو صفحات کا ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا جس میں غزلیات، قصائد، رباعیات وغیرہ تمام اصناف سُخن یکجا کیے گئے تھے، میری یہ خواہش تھی کہ کسی طرح یہ نُسخہ دستیاب ہو جائے۔ مولانا سید محمدؒ نے صرف اتنا لکھا تھا کہ اس دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ شاہان اودھ میں موجود تھا اس کے علاوہ کسی اور کتب خانے میں ان کے دیوان کا پتہ نہیں چلا۔

لندن کے دورانِ قیام میں دیوانِ وِلاؔ کے اس نادر قلمی نسخے کی تلاش

میں نے جاری رکھی اور بڑی تلاش وجستجو کے بعد مجھے اس کا قلمی نسخہ کوپن ہیگن ڈنمارک کے شاہی کتب خانے میں مل گیا۔ اس نادر ونایاب قلمی نسخے کو کوپن ہیگن کے ایسے دور افتادہ مقام پر حاصل کرکے مجھے جو مسرّت ہوئی اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔

یہ قلمی نُسخہ قصائد اور غزلیات پر مُشتمل ہے اور اس کے شروع میں مرزا کاظم علی جوان نے ایک دیباچہ لکھا ہے۔ جس سے منظر علی خاں ولاؔ کے بارے میں گراں قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مرزا کاظم علی جوآن بھی منظر علی خاں ولاؔ کی طرح فورٹ ولیم کالج سے منسلک تھے اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی نگرانی میں تصنیف و تالیف کا کام کر رہے تھے۔

مرزا کاظم علی جوان نے منظر علی خاں ولاؔ کی زندگی، شخصیت اور ان کے خاندان کے بارے میں بھی خاصی معلومات فراہم کی ہیں اور دیوانِ ولاؔ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ یہ دیوان انہوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر مرتّب کیا تھا۔

کاظم علی جوآن منظر علی خاں ولاؔ کے والد محترم سلیمان قلی خاں وداد کے فارسی کلام کو نقل کرنے کے بعد اس دیباچے میں لکھتے ہیں:

"بتاریخ پانزدہم جمادی الاولیٰ در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و یک ہجری رحلت گزین عالم بقا شدند۔ چنانچہ تاریخ وفات شاہاتے بہ نظم آوردہ"

خاں سلیماں علی وداؔد افسوس　　بہ بقا کرد چوں سفر زجہاں
سال تاریخ ہاتف از سرآہ　　گفت ماواتے اور یاضِ جناں

پسر خرد خانِ وداؔد مرحوم منظر علی خاں متخلص بہ ولاؔ کہ مدتے بہ رفاقت نواب سیف الدولہ بخشی الملک نجف علی خاں بہادر مظفر جنگ و چندے

بہ سلک ملازمان شاہزادہ جہاں دار شاہ بہادر عرف مرزا جواں بخت ملقب بہ صاحب عالم منسلک شد اکثر اوقات کہ اشعار بہ حضور شہزادہ جنت آرام گاہ می گزرانیدند، تفضلات خداوندی مبذول داشتہ پیرایۂ تحسین و آفرین می بخشیدند۔

وقتے کہ شاہزادہ عالی جاہ نہضت فرمائے سمت بنارس شدند و بہ حسب اتفاق در لکھنؤ ماندہ۔ بعد چندے بہ سرکار نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر با متیاز نوکر شد ہمراہ معتمد الدولہ مشیر الملک مہاراج ادھیراج نراندر، مہارج ٹکیٹ رائے بہادر صلابت جنگ ماندہ۔ قریب ہفت سال بہماں سررشتہ بحال بود۔ بعد برہمی مختاری مہاراج چندے بیکار بودہ تعیش نمودند۔

از اتفاقات حسنہ در سنہ یک ہزار و ہشت صد عیسوی حسب الحکم جہاں مطاع نواب مستطاب، معلی القاب، نگین خاتم سلطنت ہفت کشور، واسطۂ احکام قضا و قدر، تاج بخش سلاطین ہند و ایران، مقنن قوانین عدل و احسان صاحب السیف والقلم، مالک الرقاب ذوالحشم، امیر الامراء زبدۂ نوئینان عظیم الشان، مشیر خاص حضور شاہ کیواں بارگاہ انگلستان، اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی بہادر گورنر جنرل کہ بہ طلب شاعران ریختہ گو بہ لکھنؤ، شرف نفاذ یافتہ بود بہ سعی بخشی الملک فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر صاحب قرابتی نواب حسن رضا خاں بہادر بہ پیش اسکات صاحب نوکر شدہ بتاریخ دہم مارچ سنہ مذکور وارد کلکتہ شدہ ملازمت امیر الامراء بہادر حاصل کردہ بہ حاضر باشی خدمت والا رتبت صاحبان عالی شان عالم علوم ہمگناں

جان گلکرسٹ صاحب مدرس ہندی متعین گردیدہ وبرطبق ایماے صاحب ممدوح بہ تدوین ایں کلیات مامور شدند۔

الحق کہ حلاوت ریختہ گوئی اش لذّت تازہ در کام سخنوری ریختہ و قوت گفتار ملیحش شورے در بازار شاعری انگیختہ۔"[۱]

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ دیوان ولاؔ کا یہ قلمی نُسخہ صرف شاعری کے اعتبار ہی سے اہم نہیں بلکہ اس معلومات کے لحاظ سے بھی دلچسپ اور اہم ہے جو مرزا کاظم علی جواںؔ نے اس کے دیباچے میں مظہر علی خاں ولاؔ کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں فراہم کی۔

بہرحال دیوانِ ولاؔ کا یہ نادر و نایاب قلمی نُسخہ ایک نئی ادبی دریافت کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس کو اب شائع کیا جاتا ہے۔

لاہور
۷ مئی ۱۹۸۳ء

عبادت بریلوی

---

[۱] دیوان ولا قلمی نسخہ کوپن ہیگن

مظہر علی خاں ولا فورٹ ولیم کالج کے لکھنے والوں میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا مرتبہ میر بہادر علی حسینی، میرامن دہلوی، سیّد حیدر بخش حیدری، مرزا علی لُطف، مرزا کاظم علی جوان، میر شیر علی افسوس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور ایک بلند پایہ نثر نگار تھے۔ لیکن نہ تو ان کا دیوان چھپا نہ وہ کتابیں شائع ہوئیں جو انہوں نے نثر میں لکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی ادبی دنیا میں ابھی تک ان کا مرتبہ مُتعیّن نہیں ہو سکا ہے اور لوگ ان کے صحیح مقام کو پہچان نہیں سکے ہیں۔

مصحفی، شیفتہ اور بینی نرائن جہاں نے ان کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ یہ سب کے سب ان کی عزّت کرتے ہیں اور ان کی اہمیّت سے پوری طرح آشنا ہیں۔

مصحفی لکھتے ہیں :-

"مظہر علی خاں ولا تخلص عرف مرزا لطف علی خلف سلیمان علی خاں وداد، جوان حلیم وسلیم بہ مقتضائے موزونیٔ طبع گاہ گاہے خیال شعر ہندی می کند و بہ نام پدر بزرگوار خود ہر جا فروختہ می شود۔ استفادۂ شعرش چندے

بہ مرزا جان طپش و چندے بہ مولف بود۔ حالا بہ میر نظام الدین ممنونؔ کلام خود را می نماید[1]۔"

"ولاؔ تخلص مظہر علی خاں فرزند سلیمان علی خاں وداد کہ از شعرائے مشہور پارسی است نسبت تلمذ وے بہ میر نظام الدین ممنون کردہ اند"[2]

اور بینی نرائن جہاں نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے :

"ولاؔ تخلص، نام مرزا لطف علی خاں عرف مظہر علی خاں خلف سلیمان علی خاں عرف مرزا محمد زمان ودادؔ ابن محمد حسین بہ خطاب علی قلی خاں، دِلّی کے رہنے والے ہمیشہ عمدہ روزگار رہے۔ بالفعل کلکتہ میں تشریف رکھتے ہیں اور اس خاکسار پر نہایت مہربانی فرماتے ہیں"[3]

افسوس ہے مظہر علی خاں ولاؔ کے حالات کہیں تفصیل سے نہیں ملتے۔ جن لکھنے والوں نے ان کے حالات لکھے ہیں ان سے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ دِلّی کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصّہ کلکتہ میں گزارا اور یہیں تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ انہیں شاعری سے دلچسپی تھی۔ وہ مصحفیؔ اور ممنونؔ کے شاگرد تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ شاعری کا یہ شوق انہیں ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد سلیمان علی خاں ودادؔ بھی اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ ولاؔ کی تعلیم اچھے ماحول میں ہوئی اور اُنہوں نے عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی میں مہارت حاصل

---

[1] مصحفی : تذکرہ ہندی ۲۶۶ [2] شیفتہ : گلشن بے خار : ۲۳۷

[3] بینی نرائن جہاں : دیوان جہاں : ۲۵۸

کی۔ جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو وہ بھی لکھنؤ سے کلکتہ چلے گئے۔ اور وہاں ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ کا صحیح علم نہیں۔ بینی نرائن جہاں کے تذکرے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۱۴ء تک زندہ تھے اور کلکتہ میں مقیم تھے۔

ولاؔ نے اپنے آپ کو خود بھی شاعر کہا ہے۔ 'ہفت گلشن' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"مظہر علی خاں شاعر کہ ولاؔ جس کا تخلص ہے، واسطے سمجھنے اور سیکھنے نوآموز صاحبوں کے، بموجب حکم جناب گل کرسٹ صاحب دام اقبالہ زبان اُردو میں بیان کرتا ہے" [۱]

انہوں نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ مرزا محمد عسکری نے لکھا ہے:-

"ایک دیوان ریختہ تقریباً ساڑھے تین سو صفحات جس میں غزلیات، قصائد، رباعیات وغیرہ مع سوانح عمری مصنف کے ہیں۔ اس کا نسخہ خود مصنف نے بطور یادگار کے فورٹ ولیم کالج کو ۱۸۱۰ء میں دیا تھا" [۲]

اور سید محمد نے ان کے دیوان کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے:-

"ولا صاحب دیوان ہیں اور ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ شاہان اودھ میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور کتب خانے میں ان کے دیوان کا پتہ نہیں چلا" [۳]

---

[۱] مظہر علی خاں ولا: ہفت گلشن ۱۹ [۲] مرزا محمد عسکری: تاریخ ادب اُردو
[۳] سید محمد: ارباب نثر اُردو ۱۶۱

ولاؔ کے کلام کا انتخاب درج ذیل ہے :

ممکن نہیں کہ خاک نشینوں کی تُو سُنے
رہے ان دنوں دماغ ترا آسمان پر

○

نہ حاجت کے لئے دست دعا کو منہ پہ لاتا ہوں
میں اپنی زندگی سے ہیچ تو یہ ہے ہاتھ اٹھاتا ہوں

○

ایک جیحوں ہے کہ پلکوں سے بہا آتا ہے
کیا بلا تھی یہ میرے دیدۂ گریان کے بیچ
یوں ہی گر کرتے رہے ہم اشک سے تر آستیں
آپ بھی رو دیں گے اِک دن منہ پہ دھر کر آستیں
قتل سے میرے نہ مُنکر ہو کہ ظالم اب تلک
بھر رہی ہے خون سے تیرنے سراسر آستیں
عشق کے آثار سب تجھ میں ہویدا ہیں ولاؔ
رنگ زرد و آہ سرد و اشک سے تر آستیں

○

ہرگز نہ گریں اس سے اشکِ اثر آلودہ
ہووے نہ کبھی خوں سے جو چشم تر آلودہ
ازبس کہ کلیجے کے ٹکڑے ہوئے گرتے ہیں
آنکھوں سے مرے آنسو لختِ جگر آلودہ

واں رشکِ چمن اس نے گھر اپنا کیا ہے، یاں
اشکِ جگری سے ہے دیوار و در آلودہ
اک پل میں گزر جاوے یہ چرخ بریں سے بھی
ہوتی ہے بُری ظالم آہِ اثر آلودہ
بخش اپنے ولاؔ کو بھی از راہِ کرم یارب
ہر چند گنہ سے ہے وہ سر بسر آلودہ

○

دل کیونکہ نہ ہو اس بت طرار کے صدقے
ہوتے ہیں سبھی وضع طرحدار کے صدقے
گہہ چشم و گہہ ابرو و گہے چین جبیں کے
گہہ خال کے ہوں گاہ میں رُخسار کے صدقے
اک بوسہ تو لینے دے مجھے اپنے لبوں سے
انکار نہ کر میں ترے انکار کے صدقے
اس عشق کے قطرے کو اثر دے مرے یارب
تا ہووے ولاؔ چشم گُہر بار کے صدقے

○

ہمدم فقط نہ مجھ ہی کو اس گُل نے غش کیا
آیا جو انجمن میں تو بس کل نے غش کیا
یک قطرہ خون نہیں جگر و دل میں یاں مرے
مجھ کو تو اشک خون کے تسلسل نے غش کیا

عالم نہ سکتے کا ہے فقط اپنا ہی ولاؔ
عالم کو اس کی شانِ تجمّل نے غش کیا

○

زُلفوں میں جا اسی کی دلِ زار بندھ گیا
چھٹتے ہی آہ پھر یہ گرفتار بندھ گیا
اس برق وش کی یاد میں رویا ہوں یاں تلک
مینہ کی جھڑی کی طرح سے اِک تار بندھ گیا
ہوش و حواس اُڑ گئے فی الفور اے ولاؔ
دِل میں خیالِ یار جو اِک بار بندھ گیا

○

یاد میں اس کی کون سا دل جو مثل جرس نالاں نہیں
چشمِ نظارہ کس کی یہاں اب آیئنہ ساں حیراں نہیں
ایک نگہ اس ماہ جبیں کو دیکھا ہے جس نے اُس کا تو
دیدہ ہے گریاں، دِل ہے بریاں، ہوش نہیں اوسان نہیں
بزم میں اپنی بیٹھ کے ہم کو جو جو کچھ تم کہتے ہو
ہم پر گو ہموار ہوا سب، آپ کے یہ شایان نہیں
کون سُنے ہے، کس کنے جا کر حال دل اپنا عرض کرے
تیرے سوا تو کوئی ولاؔ کا جان نہیں پہچان نہیں

یہ اشعار اعلیٰ درجے کے اشعار ہیں اور ان سے صاف ظاہر ہے کہ ولاؔ غزل کے اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ اس فن پر انہیں پوری قدرت حاصل تھی اور انہوں نے شاعری کی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔

مظہر علی خاں وِلّا نے اپنی کتاب جہانگیر شاہی میں اپنے حالات کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس لئے یہاں اس کا نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"حقیر حقیر مظہر علی خاں جو سلیمان علی خاں کا چھوٹا بیٹا اور پوتا آقا محمد حسین اصفہانی کا، جس کا خطاب علی قلی خاں تھا اور پرپوتا آقا صادق ترک کا یہ بیان کرتا ہے کہ ـــ جب وہ دونوں بزرگوار ساتھ ساتھ ولایت اصفہان سے شاہ جہان آباد میں آتے ـــ شدہ شدہ آقا محمد حسین نے نواب سعید الدین خاں بہادر میر آتش غفراں پناہ کی وساطت سے سنہ احد میں فردوس آرامگاہ محمد شاہ بادشاہ کا شرف ملازمت اختیار کیا اور اپنی لیاقت و قابلیت سے یہ رسم بہم پہنچائی کہ شہنشاہ گیتی ستاں نے از راہ نوازش و مہربانی حضور کی بائیس خدمتوں سے ـــ جیسے خاصہ، بارہ اور کچہری اور گلال باد اور بادۂ کرناٹک اور اکثر حلقوں سے اہتمام کے سوا، اور خدمتوں کی د،وغگی سے سرفراز کر علی قلی خاں خطاب عنایت فرمایا ـــ خان مغفور کی رحلت کے بعد سلیمان قلی خاں عرف مرزا محمد زمان ودآدکہ کمالات حمیدہ سے مُتصّف تھا، نواب نجم الدولہ محمد اسحاق خاں بہادر جو بہ نواب شہید مشہور رہے، اس کے وسیلے سے اور بہ نظر قدامت از راہ نوازش اور مہربانی کے ظل سبحانی نے تجویز کر منگل باشی کے منصب سے سرفراز فرمایا ـــ نواب موصوف اس کے جوہر کے ملاحظے سے برابر کا سلوک کرتا اور اس بزرگولد کی تقلید و تتبع شاہ و گدا کرتا، چنانچہ یہ بات مشہور و معروف ہے

اور شاہ عالم بادشاہ خلد اللہ برہانہ ملکہ، کی ابتدائے سلطنت میں
نواب عزّت الدولہ صولت جنگ موسیٰ خاں بہادر غفراں پناہ
کی رفاقت اختیار کی تھی جو فن اشعار فارسی و ہندی اور محاورہ
دانی اُردو و فارسی میں مہارت کلی تھی، چنانچہ فخرالشعراء مرزا رفیع
سودا اور میاں خاکسار خادم قدم شریف نے سرمایہ ریختہ گوئی کا
اسی جناب کی شاگردی سے حاصل کیا — یہ عاصی مدت تلک نواب
سیف الدولہ بخشی الملک نجف علی خاں بہادر مظفر جنگ کی رفاقت
میں رہا اور کتنے دنوں شہزادہ جہاندار شاہ جنت آرام گاہ کے حضور
اشعار گزرانتا، تفضلات و مہربانی سے تحسین و آفرین فرماتے۔ جس
وقت کہ شہزادہ عالی جاہ نے بنارس کو کوچ کیا، اتفاقاً بندے
کا رہنا لکھنؤ میں ہوا۔ بعد اس کے معتمد الدولہ مشیر الملک مہاراج
ادھراج نرا ندر مہاراج ٹکیٹ رائے بہادر دیانت جنگ نے
اس بندے کی نوکری سررشتۂ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ
بہادر ہزبر جنگ کی سرکار میں درست کر، اپنا رفیق کیا، چنانچہ
چھ سات برس تلک اس کے سررشتے میں رہا۔ جب مہاراج
کی مختاری کا سررشتہ برہم ہوا، راقم کتنے دنوں معطل رہا —
اتفاق حسنہ سے سنہ اٹھارہ سو (۱۸۰۰ء) عیسوی میں نواب
مستطاب معلّیٰ القاب تاج بخش سلاطین ہندوستان مارکوئس ولزلی
گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ جو لکھنؤ سے شاعروں کو بلوایا تھا،
بندے نے بخشی الملک فخرالدین احمد خاں بہادر عرف مرزا جعفر
ابن محسن زماں خاں مرحوم کی وساطت و مربّی گری سے ملازمت

اسکاٹ صاحب والامناقب و عالی مناصب کی حاصل کی اور مارچ
کی دسویں تاریخ نوکر ہو کر سنہ مذکور میں وارد کلکتہ ہوا — اور ملازمت
امیرالامرا بہادر (چیف سیکرٹری) کی حاصل کی — انہیں کے
حکم کے بموجب صاحب عالیشان، عالم معانی و بیان جان گل کرسٹ
صاحب کی خدمت میں، جو زبان ہندی کے مدرس تھے، متعین ہوا
— اور صاحب ممدوح کے فرمانے سے مادھونل اور بیتال
پچیسی سے، جو برج بھاشا میں ہیں، ان کا ترجمہ للو لال کب کی
مدد سے اس طرح کیا کہ بیشتر برج کی بولی بیتال پچیسی میں رہنے
دی کہ مرضی صاحب مدرس کی یوں ہی تھی۔ بعد اس کے ہفت
گلشن کا ترجمہ کیا۔ جب اس سے فراغت حاصل ہوئی، محسن زماں
حاتم دوراں، فیض رسان شرفا مسٹر ہارنگٹن دام حشمتہ کی نذر کے
لئے پندنامہ سعدی شیرازی کا ترجمہ زبان اردو میں شعر کا شعر
کیا۔ چنانچہ ہزار جلد اس کی چھاپی گئی۔ پانچ سو گلستان ہندی
کے ساتھ اور پانچ سو علیحدہ — بعد اس کے صاحب مدرس
والامناقب نے از راہ نوازش والطاف مجوز ہو کر فرمایا کہ
لطائف وظرائف کا ترجمہ بہ لطائف وظرائف کیا جائے۔ بہتر
ہے کہ تو ہی اس کا ترجمہ کر کہ زبانِ اردو میں تجھے خوب دخل ہے
اور یہ مرتبہ مہارت راقم نے بہ موجب ارشاد کے قبول کیا، اور
اسے انصرام کو پہنچایا۔ اس سلسلے میں صاحب ممدوح کو (گل کرسٹ)
ولایت جانے کا اتفاق ہوا اور کپتان جیمس مویٹ صاحب والا
مناقب قائم مقام ان کے ہوئے۔ حقیر نے موافق حکم کے ترجمہ

تاریخ شیرشاہی کا کیا۔ بعد اس کے صاحب عالیشان منبع لطف واحسان ڈاکٹر ولیم ہنٹر دام ثروتہ، کی ابتدائے ارشاد میں اقبال نامہ جہانگیری کا ترجمہ شروع کیا اور بارہ سو چوبیس ہجری مطابق سنہ اٹھارہ سو نو عیسوی میں نواب معلیٰ القاب لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر کے عہد دولت میں اس طرح تمام انمام کو پہنچا کہ بالکل لفظاً باللفظ ترجمہ کیا، مگر بعضی جگہ رعایت محاورہ کے لئے اس کا مدعا لیا اور جہانگیر شاہی اس کا نام رکھا اور اس کو کپتان ٹیلر صاحب دام دولتہ کو بالفعل مدرس مدرسہ ہندی کے ہیں ان کی وساطت سے حضور والا میں گزرانا"۔[1]

مظہر علی خاں ولا کی تصانیف نثر میں (۱) ہفت گلشن (۲) مادھونل اور کام کندلا (۳) بیتال پچیسی (۴) تاریخ شیرشاہی اور (۵) جہانگیر نامہ مشہور ہیں۔ ہفت گلشن، ناصر علی خاں واسطی بلگرامی کی فارسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوئی لیکن شائع نہ ہوسکی۔ اس کا صرف ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ راقم نے اس قلمی نسخے کو مرتب کر کے ۱۹۶۴ء میں شائع کر دیا۔

مادھونل اور کام کندلا، موتی رام کبیشر کی برج بھاشا کی لکھی ہوئی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ ولا نے اس کو ۱۸۰۱ء میں مکمل کیا۔ اس میں مادھونل اور کام کندلا کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب کبھی شائع نہیں ہوئی۔

---

[1] مظہر علی خاں ولا: تاریخ جہانگیر شاہی بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد از محمد عتیق صدیقی صفحہ ۳۰۶۔

اس کا بھی صرف ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن کے کتب خانے میں ہے۔ میں نے اس کتاب کو بھی مرتب کر کے ۱۹۶۵ء میں شائع کر دیا۔

بیتال پچیسی بھی ترجمہ ہے۔ یہ سنسکرت زبان کی قدیم کتاب ہے جس کو محمد شاہ کے زمانے میں سورت کبیشر نے برج بھاشا میں لکھا تھا۔ ولاؔ نے اس کا ترجمہ ۱۸۰۳ء میں کیا۔ اس میں پچیس کہانیاں ہیں جن کو ایک بھوت بیان کرتا ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے کلکتہ میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد بار بار چھپی اور موجودہ دور میں ناگری رسم الخط میں اس کے متعدد اڈیشن شائع ہوتے ہیں۔

تاریخ شیر شاہی عباس خاں بن علی شیروانی کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب شیر شاہ سوری کے بارے میں ہے اور اکبر اعظم کے حکم سے فارسی میں لکھی گئی تھی۔ ولاؔ نے اس کا ترجمہ ۱۸۰۵ء میں کیا۔ یہ کتاب بھی ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں ہے۔

جہانگیر نامہ فارسی کتاب تزک جہانگیری کے ایک حصے کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب بھی ابھی تک شائع نہیں ہوئی اور بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ یہ نایاب ہے۔ راقم کو اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن کے کتب خانے میں ملا ہے لیکن یہ ناقص ہے اور اس سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔

مظہر علی خاں ولاؔ کا دیوان ان کی اوّلین تالیف ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ انہوں نے اپنا یہ دیوان ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر اس وقت مرتب کیا تھا جب وہ کلکتہ جا کر فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گل کرسٹ کو

منظہر علی خاں ولا کی شاعری کا علم تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ کئی اہم تذکروں میں ولا کا ذکر اس سے قبل کیا گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کلکتہ جانے سے قبل ولاؔ کی شہرت بہ حیثیت شاعر دور دور تک پھیل چکی ہو اور اسی شہرت کی وجہ سے کرنل سکاٹ کی معرفت وہ لکھنؤ سے کلکتہ پہنچ کر فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے ہوں۔

یہ عجیب بات ہے کہ یہ دیوان مرتب تو ہوا۔ مرزا کاظم علی جوان نے اس پر دیباچہ بھی لکھا، لیکن یہ شائع نہیں ہوا، بلکہ اس کا کوئی نسخہ ہندوستان کے کسی کتب خانے میں محفوظ بھی نہیں رہا۔ خدا جانے اس کا نسخہ کوپن ہیگن ڈنمارک کی رائل لائبریری میں کس طرح پہنچا۔ ہو سکتا ہے کوئی پادری ہندوستان سے لے گیا ہو اور اس نے حیدری کی گلزار دانش کے قلمی نسخے کی طرح دیوان ولا کے اس قلمی نسخے کو بھی وہاں محفوظ کر دیا ہو۔

بہرحال اب کوئی ڈیڑھ سال بعد اس نادر و نایاب قلمی نسخے کی اشاعت عمل میں آ رہی ہے۔ خوشی کی بات کہ اس کی اشاعت کا سہرا مجلسِ اشاعت مخطوطات ادارۂ ادب و تنقید کے سر ہے۔

لاہور

۷/ مئی ۱۹۸۳ء

عبادت بریلوی

حضرت خواجہ میر درد دہلوی

حضرت خواجہ میر دردؒ دہلوی اٹھارویں صدی عیسوی کے ایک ایسے صوفی صافی، درویش خدا رسیدہ اور شاعر بلند مرتبہ تھے جنہوں نے نہ صرف اسلامیانِ ہند کی فکر میں گراں قدر اضافے کئے بلکہ اُس دورِ پرآشوب میں، جب ہر طرف دور دور تک انحطاط و زوال کی گھٹا ٹوپ اندھیاریاں چھائی ہوئی تھیں، اپنے فکر و عمل سے ایسی مشعلیں فروزاں کیں جن کی روشنی میں مسلمانوں کی زندگی کا قافلہ ایک دفعہ پھر جادہ پیما نظر آنے لگا۔

اسلامیانِ ہند کے لئے یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ سیاسی انتشار نے اس زمانے میں زندگی کی بنیادیں ہلاکر رکھ دی تھیں۔ بیرونی طاقتوں کی یلغاروں اور اندرونی قوتوں کی یورشوں نے زندگی کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ جس طرف بھی دیکھئے، دور دور تک اس وقت کی زندگی ایک قلزمِ خوں کا نظارہ پیش کرتی تھی۔

اس صورتِ حال کے نتیجے میں قدریں ملیامیٹ ہوگئی تھیں، معیاروں کا خون ہوگیا تھا۔ سیاسی انتشار نے سازشوں کی فضا پیدا کر دی تھی۔ جب طاقت ختم ہوجاتی ہے اور اقتدار کا خاتمہ ہونے لگتا ہے تو احساسِ تحفظ افراد کو ہمیشہ سازشوں کی اس دلدل میں پھنسا دیتا ہے۔ فراری ذہنیت عام ہوجاتی ہے، اور عیش کوشی اور تعیش پسندی کے عفریت زندگی کے آنگن میں رقص کرنے لگتے ہیں۔ افراد میں زندگی سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے اُن پر شمشیر و سناں کو خیرباد کہہ کر طاؤس و رباب سے لو لگانے کا بھوت سوار ہوجاتا ہے۔

حضرت خواجہ میر دردؒ نے ایسے ہی ماحول میں دلی کی سرزمین پر آنکھ کھولی، اور اپنے دینی اور صوفیانہ افکار و خیالات سے اس ماحول میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں لوگوں کو زندہ رہنے اور زندگی بسر کرنے کے آداب آئے۔ یہ خواجہ میر دردؒ اور ان کے بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

شاعری ان کے لئے بقول ایک تذکرہ نگار کے "دوں مرتبہ" تھی لیکن انہوں نے بہرحال اس کوچے میں بھی قدم رکھا۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ افراد تک ان کا پیغام پہنچے، اور وہ ان کے پیش کئے ہوئے جذبات

واحساسات، مشاہدات وتجربات اور افکار وخیالات سے اپنی زندگیوں میں ایک انقلاب پیدا کرسکیں۔

خواجہ میر دردؒ نے اپنی شاعری سے یہ کام بڑے سلیقے سے انجام دیا ہے۔

میں کوئی تیس چالیس سال سے خواجہ میر دردؒ کی شاعری اور نثری تحریروں کے مطالعے میں مصروف رہا ہوں۔ دورانِ مطالعہ میں نے یہ بات شدّت کے ساتھ محسوس کی ہے کہ اس عظیم صوفی، درویش، مفکر اور شاعر کی شخصیت اور شاعری پر جیسا تحقیقی اور تنقیدی کام ہونا چاہیئے تھا، وہ ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔

اسی احساس نے مجھے خواجہ میر دردؒ کی شخصیت، شاعری اور افکار وخیالات پر کام کرنے کی طرف توجہ دلائی اور برسوں کی محنت کے بعد میں ان کے بارے میں یہ مبسوط کتاب پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ اس میں خواجہ میر دردؒ کے حالات، شخصیت، ماحول، تصانیف، تغزل، تصوف اور فن کا جائزہ تحقیقی اور تنقیدی زاویۂ نظر سے لیا گیا ہے۔ اس سے قبل ایک منصوبے کے تحت میری کتابیں ولی اورنگ آبادی، میر تقی میر، غالب، مومن اور علامہ اقبالؒ پر شائع ہو چکی ہیں۔ خواجہ میر دردؒ کی شخصیت اور شاعری پر یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

خواجہ میر دردؒ کی شخصیت اور شاعری پر لکھی جانے والی اس کتاب میں کوئی اور خوبی ہو یا نہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اسلامیانِ ہند کی فکری تاریخ، ان کے معاشرتی حالات، تہذیبی

معاملات اور ادبی و شعری مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے غور و فکر کا خاصا سامان موجود ہے۔ اور یہی اس کتاب کی ترتیب و تالیف کا بنیادی مقصد ہے۔

عبادت بریلوی

لاہور
۲۵ جون ۱۹۸۳ء

۵۱

تنقید اور اُصولِ تنقید

یہ کتاب "تنقید اور اصولِ تنقید" نظریاتی اور عملی تنقید کے مختلف معاملات و مسائل کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔

اُردو میں تنقید کے موضوع پر بیسویں صدی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اور اس فن نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ اِن منزلوں سے اپنے آپ کو آشنا کرنا بھی اِس کتاب کا مقصد ہے۔

اس کتاب میں نظریاتی اور عملی تنقید کے جن پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، اُن سے تنقید کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور فنِ تنقید میں روایت اور تجربات کی ایک تصویر بھی سامنے آتی ہے۔

تنقید کی موجودہ صورتِ حال، اور نئی تنقید کی ضرورت پر اِس کتاب میں جو بحث کی گئی ہے، وہ اگرچہ بہت مفصل نہیں ہے لیکن اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کا سامان ضرور فراہم کرتی ہے۔

اور اسی خیال سے اِن مباحث کو چھیڑا گیا ہے کہ اِن کی بدولت ادب اور تنقید کی دُنیا میں ایک حرکت سی پیدا ہوگی اور ہمارے ادب کو اُس تحریک سے آشنا ہونے کا موقع ملے گا جس کے لئے وہ ایک زمانے سے چشم براہ ہے۔

لاہور
۲۵ فروری ۱۹۸۴ء

عبادت بریلوی

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کے خطُوط اُردو زبان وادب اور ملّتِ اسلامیہ پاکستان و ہند کا بیش بہا خزانہ ہیں۔
مولوی صاحب مرحُوم نے اپنی زندگی میں جو خطُوط اپنے بے شُمار عزیزوں، دوستوں، شاگردوں اور عام لوگوں کو لکھے، اُن کی تعداد بلامُبالغہ لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ وہ ہر شخص کے خط کا جواب لکھنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے، اور یہ خط ہمیشہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔
اُردو زبان کے شیدائیوں اور اُردو ادب کے طالب علموں

کے لئے بابائے اُردو کی شفقت اور محبّت بے پایاں تھی۔ ایسے تمام لوگوں کو مفصّل خطوط لکھنا اُن کے معمولات میں داخل تھا۔

یہ خاکسار بھی اُردو زبان و ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم رہا ہے۔ اِسی نسبت سے بابائے اُردو نے اپنی زندگی میں، ازراہِ نوازش، اِس حقیر فقیر کو کئی سَو خطوط لکھے۔ یہ خطوط میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ میں نے ان خطوط کو زندگی بھر جان سے زیادہ عزیز رکھا، اور خُدا کا شکر ہے کہ ناسازگار حالات کے باوجود یہ خطوط میرے پاس محفوظ رہے۔

میں نے اِن خطوں کو بار بار پڑھا تو مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ صرف ذاتی خطوط ہی نہیں ہیں، ان کی نوعیّت قومی اور ملّی بھی ہے۔ کیونکہ اِن میں بابائے اُردو کی عظیم شخصیت کے اَن گنت پہلو بے نقاب ہیں اور برِعظیم پاکستان و ہند کی گذشتہ نصف صدی کی علمی، تعلیمی، مُعاشرتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کے بے شُمار معاملات و مسائل سموئے ہوئے ہیں۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ اسلامیانِ پاکستان و ہند کا گراں قدر قومی و ملّی سرمایہ ہیں۔

اِسی حقیقت کے احساس نے میرے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ اِن خطوط کو اِس طرح شائع کر دیا جائے کہ بابائے اُردو کی اِن تحریروں کے عکس ایک البم کی صُورت میں محفوظ ہو جائیں اور برِعظیم پاکستان و ہند کی ملّتِ اسلامیہ کے افراد کو اُن کے گراں بہا خیالات و نظریات، دِلنشیں اندازِ نگارش اور دلآویز خط کے بانکپن سے مُستفید اور لُطف اندوز ہونے کا موقع ملے۔

مجھے یقین ہے کہ بابائے اُردو کے یہ خطوط دلچسپی سے پڑھے جائیں گے اور جس اہتمام سے اِن کو شائع کیا گیا ہے۔ اِس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

عبادت بریلوی

لاہور
۷ ستمبر ۱۹۸۴ء

۵۳

جلوہ ہائے صدرنگ

میں ایک کم آمیز آدمی ہوں۔

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ زندگی میں مجھے اس عہد کے بڑے بڑے سیاست دانوں، ادیبوں، شاعروں اور مخلص انسانوں سے قریب رہنے کے مواقع ملے اور ان سب کی صحبتوں میں کچھ ایسے تجربات ہوئے جن کا دوسروں تک پہنچانا میں نے ضروری خیال کیا۔

اسی مقصد سے میں نے ان شخصیتوں کے خاکے لکھے جن میں سے کچھ شائع ہو چکے ہیں، کچھ اب شائع ہو رہے ہیں، اور کچھ آئندہ شائع ہوں گے۔

اس سے قبل بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، رئیس الاحرار مولانا

حسرت موہانی، حضرت جگر مراد آبادی اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیتوں کے خاکے "رہ نوردانِ شوق" کے نام سے اور صوفی تبسم، مجاز، میراجی، محمد حسن عسکری اور ناصر کاظمی کے خاکے "آوارگانِ عشق" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، اور انہیں دلچسپی سے پڑھا گیا ہے۔

اس کتاب میں جو اس وقت "جلوہ ہائے صد رنگ" کے نام سے شائع ہو رہی ہے شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی، علامہ نیاز فتح پوری، پروفیسر حمید احمد خاں، فیض صاحب، بلونت سنگھ اور میر صاحب کی دلکش اور پہلودار شخصیتوں کے دلچسپ خاکے ہیں۔

یہ خاکے دلچسپ اس وجہ سے ہیں کہ ان میں اس عہد کی بعض دلکش اور رنگا رنگ شخصیتوں کی ایسی تصویر کشی ہے، جس میں ہماری معاشرتی اور تہذیبی روایت کا پس منظر بھی بے نقاب نظر آتا ہے۔

لاہور

۲۵ مئی ۱۹۸۵ء

عبادت بریلوی

جہانِ میر

میر تقی میر کی زندگی حرکت اور ہنگاموں سے عبارت تھی۔ انہوں نے تقریباً نوے سال کی عمر پائی، اور اس طرح مغلوں کے دورِ آخر کے کئی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ اس زمانے میں جو تاریخی واقعات رونما ہوئے اور اس عہد کے افراد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی ان ہنگامہ آرائیوں کے نتیجے میں جس آشوبِ قیامت سے دوچار ہوئی، اس کو انہوں نے نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ اس میں وہ خود بھی کسی نہ کسی طرح شریک رہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی زندگی ان تمام حالات کے نشیب و فراز کی ایک متحرک اور چلتی پھرتی تصویر نظر آتی ہے۔

اس عہد کی زندگی کو میر صاحب کی زندگی کے آئینے میں اور میر صاحب کی زندگی کو اس عہد کے حالات و واقعات کے آئینے میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ میر صاحب نے اس زمانے میں آنکھ کھولی جب مغلیہ شان و شوکت کی عمارت بوسیدہ ہو چکی تھی، اور انحطاط و زوال کے عفریت اس کے آنگن میں رقص کر رہے تھے۔ شاہانِ وقت کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ داخلی خلفشار اور بیرونی یلغار نے زندگی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

میر نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دلی کی سرزمین پر انہیں حالات کے سائے میں بسر کیا اور اس زمانے میں جو کچھ لکھا، اُس میں ان حالات کے اثرات سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری اور نثر دونوں میں ان تمام حالات کی ایسی تصویر کشی کی ہے جس کی مثال اُس عہد کی کسی تحریر میں نظر نہیں آتی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو میر اس عہد کے ایک بڑے مورخ اور اس زمانے کی تاریخ و تہذیب کے ایک بہت بڑے مزاج داں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اس عہد کے واقعات بھی بیان کئے ہیں، ان واقعات سے نشیب و فراز کی مصوری بھی کی ہے، معاشرے پر اُن کا جو اثر ہوا ہے، اس کا نقشہ بھی بڑے سلیقے سے کھینچا ہے، اور افراد پر ان حالات کے نتیجے میں جو کچھ گزری ہے، جذباتی اور ذہنی طور پر وہ جس طرح اس سے متاثر ہوئے، اس کی تصویر کشی بھی اُنہوں نے بڑی چابک دستی سے کی ہے۔

خود میر اسی معاشرے کے فرد تھے۔ اس لئے ان حالات کے اثرات ان کی نجی زندگی کے واقعات میں بھی اپنے آپ کو رونما کرتے ہیں۔ اس

زمانے کے انتشار اور افراتفری کے نتیجے میں جو پریشانی عام ہوئی تھی، افلاس نے افراد کو جس طرح زبوں حال کر دیا تھا، قدروں اور معیاروں کی جس طرح شکست وریخت ہوئی تھی، اور نفسانفسی کی کیفیت پیدا ہو جانے کی وجہ سے افراد کو جس طرح ناکامیوں اور مایوسیوں کا منہ دیکھنا پڑا تھا، میر کی نجی زندگی اس صورتِ حال کی ایک نہایت ہی المناک اور دلخراش داستان ہے۔

میر ان حالات میں زندہ رہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ زندہ رہنے اور زیست کرنے کی کوشش میں ساری زندگی رواں دواں رہے۔ اُنھوں نے زمانے کی ناسازگاری کے سامنے سپر نہیں ڈالی برخلاف اس کے زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ اس جدوجہد میں انسانی اقدار کی پاس داری اور اعلیٰ اخلاقی معیاروں کا خیال ایک لمحے کو بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا۔

اس صورتِ حال نے میر کو اس عہد کی ایک اہم شخصیت بنا دیا ہے۔ ان کی شخصیت کو سمجھنے کا راز ان کی داستانِ حیات کے مطالعے میں ہے۔

یہ کتاب "جہانِ میر" ان کی داستانِ حیات کے نشیب و فراز ہی کا ایک مطالعہ ہے جس کو سوانح کا روپ دے کر ادبی و تنقیدی رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میر کی زندگی میں اکبر آباد کی اہمیت، اُن کے آباؤ اجداد، خاندانی ماحول، بچپن کے حالات، فکرِ معاش، عشق و عاشقی، تعلیم و تربیت، شعر و شاعری، زندگی میں ان کے مشاغل، دلی سے ان کی محبت، اس سرزمین کی تباہی و بربادی، اور اس کے نتیجے میں وہ آشوبِ قیامت جس سے میر کو بھی دوچار

ہونا پڑا اور بالآخر لکھنؤ کی طرف اُن کی ہجرت —— میر کی زندگی سے متعلق
ان تمام پہلوؤں کا تذکرہ اس کتاب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ملے گا۔
اس تفصیل میں ایک تخلیقی رنگ و آہنگ کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی
ہے جس نے میر کی اس داستانِ حیات کو ناول اور افسانے کی طرح خاصی
حد تک دلچسپ بنا کر پڑھنے کے قابل بنا دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ
ہی اس میں تحقیق اور تنقید بھی اپنی جھلک دکھاتی ہے، کیونکہ اس کے بغیر
کوئی بھی ادبی سوانح اپنا بلند ادبی مقام حاصل نہیں کر سکتی، بلکہ یوں
کہنا چاہیئے کہ اس کے بغیر وہ ایک "فن بے اعتبار" ہی رہتی ہے۔

حیاتِ میر کی اس ترتیب و تالیف میں میر کی تحریروں، اُن کی منظوم
تخلیقی کاوشوں، تاریخ کی کتابوں، معاصر تذکرہ نگاروں کی تحریروں،
ادبی مورخوں کی لکھی ہوئی تاریخوں، محققوں کی موشگافیوں اور نقادوں کی
اندازدانیوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس خیال سے کہ میر کی یہ داستانِ
حیات صحیح اور مستحکم بنیادوں پر استوار ہو کر ان کی رنگا رنگ شخصیت کی دلکش
و دل آویز تصویر کو اُبھار کر آنکھوں کے سامنے لائے اور پڑھنے والوں
کے لئے دلچسپی کا سامان پیدا کر سکے۔

لاہور

۲۵ جون ۱۹۸۵ء

عبادت بریلوی

افسانہ اور افسانے کی تنقید

گذشتہ تیس پینتیس سال میں، شاعری اور تنقید نگاری کی اصناف ادب کے ساتھ ساتھ میں نے ناول اور افسانے کے بارے میں جو کچھ لکھا، اُس کو اس کتاب "افسانہ اور افسانے کی تنقید" میں یک جا کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ تنقیدی تحریریں جب ادبی رسالوں میں شائع ہوئی تھیں، اُس وقت اس بات کا سان گمان بھی نہیں تھا، کہ ان کو پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ امریکہ، روس، انگلستان، کینیڈا، جرمنی، اٹلی، چیکوسلاویہ وغیرہ میں بھی پسند کیا جائے گا، اور افسانے کے فن سے دلچسپی لینے والے شوق سے ان کا مطالعہ کریں گے۔

میں حیران ہوا جب روس کے پروفیسر چیلی شیف اور سوخا چیف سے علامہ اقبالؒ کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر دلّی میں پہلی ملاقات ہوئی تو انہوں نے اچھے الفاظ میں ان مضامین کا ذکر کیا اور ان کو یک جا کر کے، کتابی صورت میں شائع کرنے کی طرف توجہ دلائی۔

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ایری زونا یونیورسٹی (امریکہ) کی استاد ڈاکٹر فلیمنگ نے اپنے ایک ریڈیو انٹرویو میں یہ بتایا کہ منٹو پر ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیقی کام کرنے کی تحریک انہیں ان مضامین سے ہوئی جو میں نے منٹو کی وفات پر لکھے تھے۔ وسکانسن یونیورسٹی نے انہیں اس کام پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی، اور اب یہ کام کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

ان کے علاوہ کچھ دوسرے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے اردو اور ثقافتِ پاکستان و ہند کے پروفیسروں نے بھی ان مضامین کو دلچسپی سے پڑھا اور اپنی تحریروں میں اُن کے حوالے دیئے، اور کتابی صورت میں ان کو شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

چنانچہ اب انہیں احباب کے اصرار پر ان مضامین کو یک جا کر کے کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

عبادت بریلوی

لاہور

۲۵ / جون ۱۹۸۶ء

(۵۶)

ترکی میں دو سال

گذشتہ دو ڈھائی سال میں نے ترکی کی انقرہ یونیورسٹی میں اُردو زبان وادبیات اور تاریخ و ثقافت پاکستان کے پروفیسر کی حیثیت سے گذارے۔
اس سے قبل بھی میں نے تھوڑا سا وقت ترکی میں گذارا تھا۔ جب میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن یونیورسٹی میں اُردو زبان و ادب اور تاریخ و تہذیب پاکستان کا پروفیسر تھا تو یورپ کے مختلف ملکوں کی سیر کرتا ہوا میں ترکی پہنچا تھا، اور میں نے اس خوبصورت ملک کے بیشتر شہر اور گاؤں دیکھے تھے۔
لیکن اب ترکی میں دو ڈھائی سال کا یہ قیام ایک عجیب و غریب تجربہ تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں مجھے ترکی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا،

اور ترک قوم کی معاشرت اور تہذیب وثقافت کے اَن گنت پہلو کچھ ایسے انداز محبوبی اور طرزِ دل رُبائی کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے آئے کہ میں ان کا گرویدہ اور اس عظیم ملّت کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔

یہ روداد سفر، اسی زلف گرہ گیر کے اسیر ہونے کی ایک کہانی ہے۔ اس حکایت لذیذ میں ہر شے کے خوبصورت اور ہر کردار کے حسین ہونے کا احساس ہوتا ہے کیونکہ

اس کیفیت میں حُسن اور حُسنِ نظر دونوں کا ایک حسین امتزاج ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ صرف ایک رودادِ سفر ہی نہیں، ایک حکایتِ جذب وشوق بھی ہے جو اپنے خلوص اور صداقت کی وجہ سے دلوں میں گھر کرنے اور حواس پر سرخوشی بن کر چھا جانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

برادرم سید انور حسین شاہ نفیس الحسینی نے اس حکایت جذب و شوق کو منظر عام پر لانے کی طرف بار بار توجہ دلائی۔ جس کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ اس کی ترتیب وتالیف اور طباعت واشاعت کا سہرا انہیں کے سر ہے۔

انقرہ یونیورسٹی

۱۶/ جولائی ۱۹۸۶ء

عبادت بریلوی

دیارِ حبیبؐ میں چند روز

میرا ایمان ہے کہ جذب صادق ہو تو اللہ تعالےٰ ہر خواہش کو تکمیل سے ہم کنار کرتا ہے اور انسان کی ہر مُراد بر آتی ہے۔

جب سے میں ترکی گیا تھا میری یہ خواہش تھی کہ دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری دوں عمرہ کروں، حج کی سعادت حاصل کروں، بیت اللہ کو دیکھوں، اُس کا طواف کروں۔ مدینہ منورہ جاؤں، مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نمازیں پڑھوں، سبز گنبد کا نظارہ کروں، روضۂ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے اپنی آنکھوں میں نور اور دل میں سُرور پیدا کروں۔

یہ خواہش اس سال اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عنایات و نوازشات سے پوری ہوئی، اور دیار حبیبؐ کو

دیکھنے کی یہ آرزوئے دیرینہ بر آئی۔

رمضان المبارک کے مہینے میں میں اپنی اہلیہ کے ساتھ دیارِ حبیبؐ میں حاضر ہوا اور مجھے عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی۔

اس مُبارک سفر کے تمام مراحل اس طرح طے ہوتے جیسے کہ یہ سب کچھ پہلے سے طے ہو چکا تھا اور اس میں انسانی کوشش مطلق شامل نہیں تھی۔ رب العالمین اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بُلاوا آیا تھا، اور وہی دیارِ حبیبؐ میں میرے میزبان تھے۔

میں اپنی اہلیہ کے ساتھ النقرہ سے جدہ، جدہ سے مکّہ مکرمہ، مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ گیا، اور اس مُقدّس سرزمین کی زیارت سے اپنے آپ کو ایسی روحانی مسرّتوں سے ہم کنار کیا جس کا تجربہ اس سے قبل مجھے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس سفر میں جذب وجنوں کی ایک عجیب وغریب کیفیت میری ہمدم و دمساز تھی۔ اسی کیفیت کے زیرِ اثر، بغیر کسی شعوری کوشش کے، مختلف اور متنوع روحانی تجربات کی یہ روداد میں نے قلم بند کر دی، جواب اس مختصر سے سفرنامہ کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

یہ سفرنامہ میرے جذب وجُنوں کی ایک حکایت لذیذ اور داستانِ دل نواز ہے لیکن اس میں عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی مسرّت و انبساط کا خاصا سامان ہے۔ کیونکہ یہ رُوحانی تجربات کی رنگا رنگ تصویروں کا ایک دلآویز مرقع ہے۔

عبادت بریلوی

لاہور

۲۵ر فروری ۱۹۸۷ء

غالب کا فن

غالب ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کی اس عظمت کا راز اِس میں ہے کہ اُنھوں نے اُردو شاعری کی روایت میں ایک نئی رُوح پھونکی ہے۔اس کو ایک نئی زندگی دی ہے۔اس میں ایک نیا انقلاب پیدا کیا ہے۔تبدیلی کی ایک نئی لہر دوڑائی ہے۔اُس کو نئے راستوں پر گامزن کیا ہے۔نئی منزلوں کی طرف بڑھایا ہے بلکہ نئے آسمانوں پر پرواز سکھائی ہے۔وہ اُردو شاعری کے مُجتہد بھی ہیں مجدّد بھی۔اُن کا بنیادی موضوع انسان اور انسانیت ہے۔اُنھوں نے اسی انسان اور انسانیت کے بُنیادی انفرادی اور اجتماعی معاملات و مسائل کو بڑی گہرائی اور گیرائی کے

ساتھ اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ اس طرح اُردو شاعری اُن کے ہاتھوں ایک آفاقی رنگ اور ایک فکری آہنگ سے آشنا ہوئی ہے اور اس کو ایک ذہن و شعور ملا ہے۔ وہ اُردو کے پہلے فلسفی شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری صرف فلسفہ نہیں ہے۔ اس فلسفے کو اُنھوں نے تجربے کے سانچے میں کچھ اس طرح ڈھالا ہے اور تخیل کے رنگوں سے اس کو کچھ اس طرح سجایا ہے کہ اس میں حُسن و جمال کی ایک دُنیا آباد ہو گئی ہے۔ اور حُسن و جمال کی اس دُنیا نے اُنھیں ایک بہت بڑا فن کار اور ایک اعلیٰ درجے کا خالقِ جمال ثابت کر دیا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ گذشتہ سو سال میں غالب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بیسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور سینکڑوں مضامین و مقالات قلم بند کئے جا چکے ہیں لیکن اُن کی فن کاری اور تخلیق جمال کے پہلو پر ان کتابوں اور مقالوں میں کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ کہیں کہیں ان کی فن کاری کا ذکر ہوا ضرور ہے۔ اس کی تحسین و تعریف میں چند فقرے اور جُملے بھی لکھے گئے ہیں لیکن ان پہلوؤں کا تنقیدی تجزیہ جس طرح ہونا چاہیئے تھا، نہیں ہو سکا ہے غالب کی شخصیت اور شاعری کے متعلق تحقیقی اور تنقیدی تحریروں کا مطالعہ کرتے وقت یہ کمی کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔

اس احساس ہی نے میرے دل میں اس خیال کی شمع روشن کی کہ میں غالب کی تخلیق جمال کے عوامل اور محرکات کا سُراغ لگاؤں اور اس کے مُختلف عناصر کا تنقیدی تجزیہ کر کے کتاب "غالب کا فن" اُن کے اسی تخلیقِ جمال کے عوامل و محرکات کی تلاش و جستجو کی ایک داستان اور اس

کے مختلف عناصر کے تنقیدی تجزیے کی ایک کہانی ہے۔

اس کتاب کو آسانی کے خیال سے دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں غالب کے فن کی اہمیت کا مختصر سا بیان ہے۔ دوسرے باب میں ان عوامل اور محرکات کی تفصیل ہے جن کے ہاتھوں غالب کے فن کی تشکیل ہوئی ہے۔ تیسرے باب میں موضوع اور فن کی اس ہم آہنگی کا ذکر ہے جس سے غالب کا فن پہچانا جاتا ہے۔ چوتھے باب میں وزن و آہنگ کی تفصیل ہے اور اس حقیقت کا جائزہ ہے کہ اس وزن و آہنگ نے غالب کے فن میں کیا کام کیا ہے۔ پانچویں باب میں اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ روایت کے اثرات نے غالب کے فن کو کس طرح مُتاثر کیا ہے اور اس نے ان کی شاعری میں کیا صُورتیں اختیار کی ہیں چھٹے باب میں علامات و اشارات کے جمالیاتی پہلوؤں پر تنقیدی بحث ہے۔ ساتواں باب رمزیت اور ایمائیت کی جمالیاتی اہمیت کی وضاحت کرتا ہے۔ آٹھویں باب میں غالب کی تصویر کاری، پیکر تراشی یا امیجری پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اور ان کی شاعری کے بعض ایسے پہلوؤں کی نقاب کشائی کی گئی ہے جن کی بدولت ان کا فن ایک اچھا خاصا نگارخانہ بن گیا ہے۔ نویں باب میں زبان و بیان کے جمالیاتی پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور دسویں باب میں اختصار کے ساتھ اس تنقیدی بحث سے نکلنے والے اُن تمام نتائج کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے نہ صرف اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا سا بلند پایہ خالقِ جمال اور اعلیٰ پائے کا فن کار اُردو شاعری میں کوئی اور پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ غالب کے بعد جتنے بھی اہم شاعر گذرے ہیں انہوں نے کسی نہ کسی زاویے سے غالب کا اثر قبول

ضرور کیا ہے۔

غالب کے فن اور جمالیاتی پہلو کے اس تنقیدی جائزے کو مُکمل نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے اپنی سی پُوری کوشش ضرور کی ہے کہ غالب کے فن کے تمام خدوخال اس جائزے سے پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آجائیں۔ اِس کوشش نے اس تنقیدی جائزے کو مکمل اور بھرپور نہ سہی لیکن ایک معقول اور بڑی حد تک صحیح مطالعہ ضرور بنا دیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس میں تفصیل و جزئیات کے عناصر نسبتاً زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں، بحثیں بھی طویل ہو گئی ہیں۔ تجزیے میں بھی کچھ پھیلاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ اشعار کا انتخاب بھی کچھ بڑھ گیا ہے۔ لیکن اس قسم کے تنقیدی اور تجزیاتی مطالعے میں ان پہلوؤں کا پیدا ہونا ایسی کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ تنقیدی خیالات کی وضاحت کے لئے اشعار کا انتخاب ضروری ہوتا ہے۔ اس کو مختصر بھی بھی کیا جا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں اشعار کے انتخاب کی تنقیدی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اِس قسم کے تنقیدی جائزے میں شاعر کے اشعار دلوں میں نور اور آنکھوں میں سُرور پیدا کرنے کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں تنقید اس معاملے میں بے بس ہے۔

اس تنقیدی جائزے میں جو رنگ و آہنگ ہے وہ اُردو تنقید میں عام نہیں ہے۔ انگریزی اور بعض دوسری زبانوں میں تو اس قسم کے تنقیدی جائزوں کی خاصی فراوانی ہے لیکن اُردو میں ان کی کوئی اہم روایت نہیں ملتی۔ اس طرح دیکھا جائے تو اس تنقیدی جائزے کی حیثیت ایک تجربے کی ہے۔ تجربہ نقشِ اوّل سے زیادہ اہمیت نہیں

رکھتا۔ اس نقشِ اوّل میں غالب کے فن اور اس کے جمالیاتی پہلوؤں کی طرف محض چند اشارے کیے گئے ہیں۔ صرف اس خیال سے کہ ان اشاروں کو سامنے رکھ کر دوسروں کو اس راستے پر گامزن ہونے، آگے بڑھنے اور نئی منزلوں سے ہم کنار ہونے، بلکہ نئے آسمانوں پر پرواز کرنے کا موقع ملے گا۔

اور اس طرح وہ کارنامے جو غالب نے اُردو شاعری میں انجام دیئے ہیں اور اُن کے ہاتھوں عظمت کی جو شمع اس کی روایت کے شبستانوں میں فروزاں ہوئی ہے وہ اُردو تنقید کے ایوانوں کو بھی اپنی مُسکراہٹ سے جگمگائے گی۔

۲۵ر جون ۱۹۸۷ء

عبادت بریلوی

(۵۹)

یادِ عہدِ رفتہ

"مَیں بہت شرمیلا آدمی ہوں صہبا صاحب!"
"اپنے بارے میں کیا لکھوں؟ میں نے کون سا تیر مارا ہے؟"
افکار کے مدیر صہبا صاحب نے جب بھی مجھ سے اپنی خود نوشت لکھنے پر اصرار کیا، تو میری زبان اور قلم سے یہی دو فقرے نکلے۔
واقعی مجھے اپنے بارے میں بات کرنے سے اُلجھن سی ہوتی ہے۔
لیکن صہبا صاحب عجیب و غریب آدمی ہیں۔ یہ جو چاہیں کر سکتے ہیں جس سے جو چاہیں لکھوا سکتے ہیں۔ کسی کو لکھنے پر آمادہ کرنا تو اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔
چار پانچ سال سے بھی زیادہ کا عرصہ گزرا کہ وہ ہر ملاقات میں مجھ سے خود نوشت لکھنے کا تقاضا کرتے رہے۔ اس سلسلے میں خط بھی انہوں

نے بے شمار لکھے ۔میں ٹالتا رہا لیکن وہ نہ مانے۔

بالآخر اس بات پر فیصلہ ہوا کہ میں اپنے بارے میں کم، اپنے زمانے اور ماحول کے بارے میں زیادہ لکھوں گا تاکہ جو کچھ میں نے گزشتہ نصف صدی میں دیکھا ہے، جو حالات مجھے نظر آئے ہیں، جو واقعات میری آنکھوں کے سامنے سے گزرے ہیں، جن بزرگوں اور دوستوں سے میں نے اثر قبول کیا ہے ان سب کی اَن گنت تصویروں کا ایک مرقع تیار کرسکوں۔

اس خیال سے کہ شاید اس مُرقع کی تصویریں، اپنے خطوط اور رنگ، معنویت اور افادیت کی وجہ سے موجودہ نسل کے لئے اور آئندہ نسلوں کے لئے بھی کسی حد تک مُفید اور خاصی حد تک دلچسپی کا باعث بن سکیں گی۔

گزشتہ نصف صدی ہماری سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، علمی و تعلیمی اور ذہنی و فکری زندگی میں بڑی اہمیت کی مالک ہے۔ اس زمانے میں آزادی کی جدوجہد تیز سے تیز تر ہوئی۔ ہندوستان آزاد ہوا۔ پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ عظیم سیاسی رہنما، بلند پایہ شاعر اور ادیب یگانۂ روزگار مفکر اور دانش ور، عظیم اساتذہ اور ماہرِ تعلیم، شعلہ بیان خطیب اور مقرر، قلم کو تلوار بنانے والے صحافی اور اہلِ قلم اس زمانے میں پیدا ہوئے۔

میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جنہیں اس مخصوص ماحول اور ان معروف شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے اس ماحول اور ان شخصیتوں سے بہت کچھ بلکہ سب کچھ حاصل کیا۔ زندگی کی راہوں میں ان کی وجہ سے جو مشعلیں سی فروزاں ہوئیں ان کی روشنی میں مَیں نے بھی اپنا سفر شروع کیا اور مجھے اَن گنت ایسی منزلوں سے ہم کنار ہونے کا موقع ملا جو میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ ایسے ایسے تجربات

ہوئے جن کی تفصیل ایک حکایت لذیذ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس حکایت لذیذ میں زندگی کو بنانے، محنت اور لگن سے کام کرنے، انسانیت اور انسانی قدروں سے اپنے آپ کو آشنا کرنے کے جو اَن گنت پہلو ملتے ہیں وہ شاید لوگوں کے لئے کسی حد تک دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں۔

اسی خیال سے میں اس حکایت کو قلم بند کرنے کے لئے آمادہ ہوا ہوں۔ یہ حکایت کسی حد تک لذیذ ضرور ہے لیکن اتنی لذیذ نہیں کہ اس کو دراز سے دراز تر بنا کر پیش کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں تفصیل کے بجائے جہاں تک ہو سکا ہے، اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ البتہ جگہ جگہ اشاروں اور کنایوں میں بہت کچھ کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں واقعات بھی ہیں اور مسائل و معاملات بھی، مشاہدات و تجربات بھی ہیں اور احساسات و تاثرات بھی جذبات و خیالات بھی ہیں اور عقل و شعور کے معاملات بھی۔

غرض یہ کہ زندگی، زمانے اور ماحول نے جو کچھ بھی مجھے دیا جن پہلوؤں سے بھی مالا مال کیا، میری داخلی زندگی میں جو چراغ روشن کیے اور خارجی زندگی میں جو مشعلیں سی فروزاں کیں اور ان کی بدولت دل و دماغ پر جو تصویریں مختلف اوقات میں ابھرتی رہیں ان کو میں نے حتی الامکان رنگین اور پُرکار بنا کر کاغذ پر منتقل کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کی ہے۔

یہ رودادِ حیات، جو اس سے قبل رسالہ 'افکار' کراچی میں بالاقساط چھپتی رہی، اور جو اَب "یادِ عہدِ رفتہ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کی جا رہی ہے، ایک طالب علم، ایک اُستاد، اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے ایک ایسے انسان کی زندگی کے نشیب و فراز کی کہانی ہے، جس نے زندگی کو ہمیشہ ذوقِ پرواز ہی تصور کیا، جو جہدِ مسلسل، عملِ پیہم، اور محبت و انسانیت کی مشعلوں

کو ہاتھ میں لے کر زندگی بھر وادی خیال کو مستانہ طے کرنے میں مصروف رہا،
اور جو منزل کی تلاش میں زندگی کی پُر پیچ، ناہموار اور پُر خار راہوں پر چل کر،
اَن گنت صحراؤں اور ویرانوں کی خاک چھانتا ہوا، اپنے اس سفر میں خدا
جانے کہاں نکل گیا!

عبادت بریلوی

۷ ۸/۸۸-این، سمن آباد، لاہور
۷ر اپریل ۱۹۸۸ء

۶۰

آزادی کے سائے میں

آج سے تقریباً چالیس سال قبل، جب اس برعظیم کے اُفق پر آزادی کا سورج طلوع ہوا تھا اور پاکستان اور ہندوستان کی دو آزاد مملکتیں دُنیا کے نقشے پر اُبھری تھیں، اس وقت میں دِلّی میں تھا۔

اس طوفانی دور میں جو کچھ ہوا، جو واقعات پیش آئے، جن حالات کا سامنا کرنا پڑا، اور اُن کے نتیجے میں جو قیامتیں برپا ہوئیں، اُن کو نہ صرف میری آنکھوں نے دیکھا بلکہ اِن طوفانوں کے تھپیڑوں نے، خاصے عرصے تک، مجھے اپنے رحم وکرم پر رکھا، اور اِس آشوبِ قیامت میں مجھے کچھ ایسے تجربات ہوئے جن کے خیال سے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔

خُدا جانے کیسے جان بچ گئی۔ بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس میں ضرور

کسی غیبی طاقت کا ہاتھ تھا جس نے مجھے اس جہنم سے نکالا، ورنہ جس مقتل میں لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے، اُس سے بچ کر نکلنا ایک معجزے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ صرف جان بچ گئی، اور کچھ باقی نہ بچا۔ سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔ مادی چیزوں کا تو خیر ذکر ہی کیا، ایک معاشرہ برباد ہو گیا۔ ایک تہذیب تباہ ہو گئی۔ انسانیت اور شرافت کے پرخچے اُڑ گئے، انسانی اقدار نے دم توڑ دیا، اور وہ صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو گئیں۔

میری آنکھوں نے دلّی کی سرزمین پر اُس زمانے میں ان سب کو تباہ و برباد ہوتے ہوتے دیکھا۔ آج تک میری طبیعت پر اس تباہی اور بربادی کے اثرات ہیں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے، اور اس آشوبِ قیامت میں جو کچھ مجھ پر گذری ہے، اس کے مختلف مناظر کو قلم بند کر دوں تاکہ آئندہ نسلوں کے لئے اس کی تفصیل محفوظ ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اب ہماری تاریخ کا حصہ ہے، اور اس سے پوری طرح آشنا ہونا ہماری ضرورت ہے۔ کیونکہ جو قربانیاں ہماری قوم نے اس موقع پر دی ہیں، اُن کو یاد کرنا اور نئی نسل کو اُن کی اہمیت کا احساس دلانا میرے خیال میں قومی و ملّی خدمت ہے۔

اس زمانے کی یہ رودادِ لہو رنگ میں نے اسی جذبے سے قلم بند کی ہے۔ اس کو آج سے چالیس قبل لکھا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اس وقت میں نے یہ سوچا کہ شاید میں شدّتِ جذبات کی وجہ سے ان مشاہدات و تجربات کو صحیح طور پر الفاظ کے قالب میں نہیں ڈھال سکوں گا۔ اس لئے وہ عرصۂ دراز تک

میرے دل و دماغ اور ذہن و شعور میں محفوظ رہے۔

اور اب یہ مشاہدات و تجربات، آزادی کے چالیس سال بعد، ایک اہم تاریخی دستاویز کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ آپ بیتی کے روپ میں جگ بیتی کی یہ تفصیل، جو اس داستان خونچکاں میں ہے، اس کا کہیں اور ملنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

اسی خیال سے میں نے یہ سوچا کہ اس کو شائع کر دیا جائے۔

عبادت بریلوی

۲۱۔ سی، یونین پارک،
سمن آباد، لاہور
۱۴ اگست ۱۹۸۸ء

۶۱

یارانِ دیرینہ

میری آپ بیتی "یادِ عہدِ رفتہ" شائع ہوئی تو غالباً اُس کو اسی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کہ اُس میں گذشتہ نصف صدی کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، ذہنی، فکری، علمی، تعلیمی اور ادبی ماحول کے ذکر کے ساتھ اس عہد کی اہم شخصیتوں کا تذکرہ بھی تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان اہم شخصیتوں کے خدوخال کی تفصیل اس میں نہیں سما سکتی تھی۔ اس میں تو اختصار کے ساتھ کچھ اشارے ہی کئے گئے تھے، جن سے ان بزرگوں اور دوستوں کی صرف ایک جھلک دیکھی جا سکتی تھی۔

اس لئے میں نے یہ سوچا کہ ان شخصیتوں کے خدوخال کی تفصیل

کو خاکوں کے چند مجموعوں کی شکل میں پیش کر دیا جاتے تاکہ ان اہم شخصیتوں سے صحیح طور پر آشنا ہونے کا موقع ملے، اور جو کارہائے نمایاں انہوں نے اسلامیانِ پاکستان و ہند کی تاریخ و تہذیب میں انجام دیئے ہیں، وہ سامنے آسکیں۔ چنانچہ اسی خیال سے میں نے اِن خاکوں کے سات مجموعے (۱) رہ نوردانِ شوق (۲) آوارگانِ عشق (۳) جلوہ ہائے صدرنگ (۴) یارانِ دیرینہ (۵) بلاکشانِ محبت (۶) غزالانِ رعنا اور (۷) شجرہائے سایہ دار طباعت واشاعت کے لئے تیار کئے۔

رہ نوردانِ شوق، آوارگانِ عشق، اور جلوہ ہائے صدرنگ تو کئی سال ہوئے، شائع ہو چکے ہیں۔ "یارانِ دیرینہ"، "بلاکشانِ محبت"، "غزالانِ رعنا" اور "شجرہائے سایہ دار" بھی شائع ہو چکے ہیں۔

ان میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت جگر مُرادآبادی، حضرت جوش ملیح آبادی، علامہ نیاز فتح پوری، ابوالاثر حفیظ جالندھری، فیض صاحب، مُصوّرِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی، میاں بشیر احمدؒ، پروفیسر حمید احمدؒ خاں، جناب صوفی تبسم، میراجی، مجاز، ناصر کاظمی، حبیب جالب، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر برکت علی قریشی، ڈاکٹر عبداللہ، پروفیسر سیّد ذوالفقار عظیم، علامہ سیّد وزیر الحسن عابدی، مولانا نورالحسن خاں، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر صابر علی خاں، مولانا صلاح الدین احمدؒ، پروفیسر عزیز احمدؒ، میاں ام۔ اسلم، پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ، پروفیسر سیّد احتشام حسین، سید آغا حسن عابدی، پروفیسر مرزا محمود بیگ، ڈاکٹر خورشید احمد فارق اور بہت سے دوسرے بزرگوں اور دوستوں کے خاکے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ خاکے کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار صفحات

پر پھیلے ہوئے ہیں۔

"یارانِ دیرینہ" کے نام سے اِس وقت جو مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے، وہ اورینٹل کالج کے رُفقائے کار اور اُن احباب کے حالات پر مشتمل ہے جن کو اورینٹل کالج سے دلچسپی تھی اور جو کسی نہ کسی نسبت سے اورینٹل کالج کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔

میں نے بہ حیثیت یونیورسٹی پروفیسر، صدر شعبۂ اُردو پرنسپل اورینٹل کالج، ڈین اورینٹل اینڈ اسلامک لرننگ، اور ڈائریکٹر شعبۂ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند عمر عزیز کے تقریباً "تیس بتیس سال اورینٹل کالج میں گذارنے، اور مختلف اوقات میں جن احباب کے ساتھ مجھے اس ادارے کے مِنّت پذیر شانۂ گیسوؤں کو سنوارنے کا موقع مِلا، اُن کی شخصیتوں کی چلتی پھرتی تصویریں میں نے اِن خاکوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اِن میں کوئی اور خوبی ہو یا نہ ہو، یہ خوبی ضرور ہے کہ اِن سے اورینٹل کالج کی گذشتہ نصف صدی کی تاریخ، اور بین الاقوامی شہرت کے اس ادارے کی تعلیمی، علمی، ادبی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول اور فضا کا ایک نقشہ آنکھوں کے سامنے ضرور آجاتا ہے۔

اور یہی اِن خاکوں کی ترتیب و تالیف اور طباعت و اشاعت کا بُنیادی مقصد ہے!

عبادت بریلوی

۲۱۔سی، یونین پارک، ہمن آباد، لاہور
۷ رستمبر ۱۹۸۸ء

۶۲

فیض احمد فیض

جدید اُردو شاعری

۱۹۷۷ء میں جب حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے جشن صد سالہ منانے کی تیاریاں ہونے لگیں، اور پاکستان کی سب سے قدیم درسگاہ پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کی ایک میٹنگ میں تقریبات منعقد کرنے کا ایک منصوبہ زیرِ بحث آیا تو میں نے سنڈیکیٹ کے ایک ممبر کی حیثیت سے وائس چانسلر اور رجسٹرار کو مخاطب کر کے کہا "علامہ اقبالؒ کی فائل نکلوایئے۔"

یہ سُن کر وائس چانسلر صاحب نے رجسٹرار صاحب کی طرف دیکھا۔ رجسٹرار صاحب کچھ پریشان سے ہوئے، اور فرمایا "کئی سال ہوئے دوسری فائلوں کے ساتھ یہ فائل بھی اربابِ اختیار کے حکم

کی تعمیل میں تلف کر دی گئی۔"

میں نے کہا "قومی نوعیت کی شخصیات کی فائلوں کو بغیر سوچے سمجھے تلف کرنے کا فیصلہ ایک ایسا جُرم ہے جس کو کبھی بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو قومی سرمائے کی تباہی و بربادی ہے۔"

رجسٹرار صاحب نے فرمایا "یہ آج سے خاصے عرصے پہلے کی بات ہے۔ میرے زمانے میں ایسا نہیں ہوا۔ بیس پچیس سال کے بعد روٹین میں ایسا کیا جاتا ہے کہ بعض فائلیں بے کار سمجھ کر تلف کر دی جاتی ہیں۔"

میں نے کہا "دُنیا کے مُہذب ملکوں میں تو کاغذ کا ایک ایک پُرزہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ ہم اپنے کاغذات کو تلف کرتے ہیں۔ حیرت اور افسوس کی بات ہے۔ حکیم الاُمتہ علاّمہ اقبالؒ اور اُن کے ہم عصروں کی فائلوں کو تلف کرنا یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی بے حسی، کم علمی اور نادانی کا ثبوت ہے۔"

اس واقعے کو یہاں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک علمی اور تعلیمی ادارے میں کم علم اور جاہل قسم کی مخلوق یہ مشق ستم کرتی تھی۔ ان ظالموں نے قومی شخصیات کے حالات سے متعلق معلومات کے نہ جانے کتنے بیش بہا خزانے ضائع کر دیئے۔ یہ تو ایک قومی المیہ ہے۔"

علامہ اقبالؒ کے بعد فیض صاحب کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا۔ اُنہوں نے ۱۹۳۹ء میں جدید اُردو شاعری پر پی ایچ ڈی کرنے کے لئے پنجاب یونیورسٹی میں ایک خاکہ پیش کیا۔ اس کی ایک فائل مجھے ایسے کاغذات میں ملی جو تلف کرنے کے لئے رکھے گئے تھے میں نے کئی گھنٹے صَرف کر کے اس انبار کو دیکھا اور کسی غیبی مدد سے فیض

صاحب کی یہ فائل میرے ہاتھ آگئی، اور میں نے کچھ دوسری اہم فائلوں کے ساتھ اس کو محفوظ کرلیا۔ اس میں کوئی غیبی مدد شامل تھی، ورنہ یہ اہم دستاویز بھی کبھی کی جل کر راکھ ہو چکی ہوتی۔

فیض صاحب بین الاقوامی شہرت کے شاعر اور نقّاد تھے۔ جدید اُردو شاعری سے اُنہیں گہری دلچسپی تھی۔ جب ۱۹۳۹ء میں وہ ایم۔اے۔او کالج امرتسر میں انگریزی کے اُستاد تھے تو اُنہیں جدید اُردو شاعری کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ اُنہوں نے اِس موضوع پر کام کرنے کے لئے پنجاب یونیورسٹی کو درخواست دی اور اِس اہم موضوع پر تحقیقی کام کرنے کا ایک مُفصّل خاکہ پیش کیا۔

یہ خاکہ پندرہ ابواب پر پھیلا ہوا ہے، اور نہایت مُفصّل ہے۔ اس سے فیض صاحب کے وسیع اور گہرے مطالعے، اور اُن کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت اور تجزیاتی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس خاکے پر مختلف کمیٹیوں کی کئی میٹنگوں میں بحث ہوئی۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ یہ موضوع بہت پھیلا ہوا ہے۔ اس پر فیض صاحب کو پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ میرے خیال میں یہ ایک المیہ تھا۔

اگر جدید اُردو شاعری کے موضوع پر یہ خاکہ منظور کرلیا جاتا تو اُردو کے ایک عظیم شاعر، محقق اور نقاد کی لکھی ہوئی ایک ایسی کتاب اُردو دُنیا کو مل جاتی جس سے اُردو ادب کے اساتذہ، طالب علم اور اُردو شاعری سے دلچسپی لینے والے ہمیشہ ہمیشہ استفادہ کرتے!

افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوسکا۔

بہرحال یہ نادر و نایاب تحریر کسی غیبی مدد سے میرے ہاتھ آگئی، اور میں نے اس کو اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کا منصوبہ بنالیا، اور اب فیض صاحب کی یہ نادر و نایاب تحریر آپ کے سامنے ہے۔

میں نے مقدمے میں فیض صاحب کی شخصیت، اُن کی شاعرانہ اور تحقیقی و تنقیدی بصیرت کی وضاحت کی ہے، اور جدید اُردو شاعری پر اُن کی اس نادر و نایاب تحریر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس خیال سے کہ ادبی دُنیا کو اس تحریر کی اہمیت کا اندازہ ہو۔

مجھے یقین ہے کہ فیض صاحب کی اس تحریر کو نہ صرف پاکستان اور ہندوستان بلکہ دُنیا کے تمام اہم مُلکوں میں ایک ادبی دریافت سمجھ کر شوق اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا، اور اُردو زبان و ادب سے دلچسپی لینے والے ہمیشہ اس سے استفادہ بھی کریں گے۔

عبادت بریلوی

۸۷/۸۸۔ این سمن آباد، لاہور
۱۶ر فروری ۱۹۸۹ء

بین الاقوامی شہرت کے پاکستانی اُردو شاعر فیض احمد فیض ۱۳؍ فروری ۱۹۱۱ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ بعض لوگوں نے اُن کی تاریخ پیدائش جنوری ۱۹۱۱ء اور جنوری ۱۹۱۲ء بتائی ہے۔ لیکن فیض نے اپنی ایک تحریر میں اس کی تصدیق کر دی ہے کہ اُن کی صحیح تاریخ ولادت ۱۳؍ فروری ۱۹۱۱ء ہے۔ لکھتے ہیں :۔

تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات میں ۷؍ جنوری ۱۹۱۱ء اور کہیں ۷؍ جنوری ۱۹۱۲ء ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک دوست سے فرمائش کی تھی کہ وہ سیالکوٹ کے دفتر بلدیہ سے پیدائش کے اندراجات کا ریکارڈ دیکھ کر صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوششیں کریں۔ اُن کی تحقیق کے مطابق بلدیہ کے کاغذات میں ۱۳؍ فروری ۱۹۱۱ء تاریخ پیدائش درج ہے۔"

فیض احمد فیض ۱۶ / ۴ / ۶۵

فیض کا آبائی وطن قصبہ کالا قادر ضلع سیالکوٹ ہے۔ (رسالہ افکار کراچی بہ یاد فیض نومبر ۱۹۸۵ء، شمارہ ۱۸۸ ص ۱۷۱)

اُن کے والد کا نام چودھری سُلطان محمد خاں تھا۔ وہ عربی، فارسی اور انگریزی زبانیں اچھی طرح جانتے تھے، اور نہایت ذہین، طباع اور قابل آدمی تھے۔ وہ نوجوانی ہی میں سیالکوٹ چھوڑ کر افغانستان چلے گئے جہاں افغانستان کے حکمراں امیر عبدالرحمٰن نے اُن کو افغان شہزادوں کا اتالیق مقرر کیا۔ قیام افغانستان کے زمانے میں وہ حکومت افغانستان کے چیف سیکرٹری بھی رہے۔ بعد میں اُنھیں انگلستان میں افغانستان کا سفیر مقرر کیا گیا اور وہ تین سال تک اس اہم عہدے پر فائز رہے۔ قیام انگلستان کے زمانے میں اُنھوں نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبالؒ بھی انگلستان میں مقیم تھے۔ چنانچہ لندن میں اُن کی علامہ اقبالؒ سے مُلاقات ہوئی۔ سفیر کی حیثیت سے اپنی مُدّت ملازمت پوری کر کے وہ افغانستان واپس گئے۔ جہاں اُنھوں نے افغانستان کے ایک وزیر کی بیٹی سے شادی کی۔ لیکن اس کے بعد وہ ناسازگار حالات کے باعث زیادہ عرصے وہاں نہ رہ سکے، اور سیالکوٹ واپس آکر بیرسٹری شروع کر دی۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور بیرسٹر تھے۔ یہیں اُن کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہوا۔

فیض کی والدہ کا نام سُلطان فاطمہ تھا۔ اُن کے چار بھائی اور پانچ بہنیں تھیں۔ گھر میں علم و ادب کا چرچا تھا۔ اُن کے والد عالم فاضل آدمی تھے۔ اُنھوں نے انگریزی میں افغانستان کے حکمران امیر عبدالرحمٰن کی سوانح لکھی تھی، اور قانون پر بھی تصنیف و تالیف کا خاصا کام کیا تھا۔ اس زمانے کی اہم علمی ادبی شخصیتوں سے اُن کے تعلقات

تھے۔ اِن میں علامہ اقبالؒ، سرشیخ عبدالقادر، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا سیّد سلیمان ندوی کے نام سرفہرست ہیں۔

ایک ایسے علمی ادبی گھرانے میں فیض نے آنکھ کھولی، اور اس ماحول کے اثرات اُن کی شخصیت پر بہت گہرے ہوئے۔ فیض کی تعلیم و تربیت کا آغاز مذہبی ماحول میں ہوا۔ چار سال کی عمر میں اُنہوں نے قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا۔ پھر وہ مولوی ابراہیم سیالکوٹی کے مکتب میں داخل ہوئے اور انہوں نے وہاں اُردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں اُنہیں اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں داخل کیا گیا جہاں وہ تقریباً سات سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ انہوں نے ۱۹۲۷ء میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس کے بعد وہ مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے جہاں سے انہوں نے ۱۹۲۹ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس زمانے میں وہ مولانا سید میرحسن سے بھی علمی استفادہ کرتے رہے جس کی وجہ سے عربی، فارسی اور اُردو سے بھی اُن کی دلچسپی قائم رہی۔ بی۔ اے کرنے کے لئے وہ ۱۹۳۱ء میں لاہور آئے۔ گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا، اور یہاں سے ۱۹۳۳ء میں بی۔ اے اور بی۔ اے آنرز کے امتحانات پاس کئے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد اُنہوں نے گورنمنٹ کالج سے انگریزی زبان و ادب میں ایم۔ اے کیا۔ پھر اورینٹل کالج میں داخل ہوئے، اور ۱۹۳۴ء میں عربی زبان و ادب میں یہاں سے ام۔ اے عربی کا امتحان پاس کیا۔

یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہوکر فیض ۱۹۳۵ء میں ام۔ اے۔ او

کالج امرتسر میں انگریزی زبان وادب کے لیکچرار ہوگئے۔ اور کئی سال تک انہوں نے اس کالج میں پڑھایا۔ اس کالج کا ماحول اُس زمانے میں علمی وادبی تھا، اور ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ ڈاکٹر اشرف محمود الظفر وغیرہ اور اُردو کے کچھ اور نامور ادیب وشاعر اس کالج کے ساتھ منسلک تھے۔ ان کی وجہ سے فیض کے ادبی ذوق میں نکھار پیدا ہوا، اور اُن کے دل میں علمی ادبی کام کرنے کی لگن اور دُھن پیدا ہوئی — ۱۹۶۰ء میں وہ یونیورسٹی ہیلی کالج آف کامرس میں انگریزی کے اُستاد کی حیثیت سے لاہور آگئے، اور تقریباً دو سال یہاں تدریس کا کام کیا۔ ۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو وہ فوج کے محکمہ تعلقات عامہ سے منسلک ہوگئے، اور لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ اس زمانے میں اُن کا قیام دِلّی میں رہا۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو وہ لاہور آگئے اور کئی سال تک پاکستان ٹائمز کے اڈیٹر رہے۔ ۱۹۴۱ء میں ان کی شادی بیگم تاثیر کی بہن ایلیس سے ہوئی۔ جن سے اُن کی دو بیٹیاں سلیمہ اور منیزہ ہیں۔

پاکستان میں فیض کو قید و بند کی سختیاں بھی جھیلنی پڑیں۔ وہ ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی سازش کیس میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور کئی سال جیل میں رہے لیکن بالآخر ۱۹۵۵ء میں انہیں رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں وہ ایک دفعہ پھر گرفتار ہوئے اور تقریباً ایک سال انہیں پھر جیل میں گذارنا پڑا۔ رہائی کے بعد وہ کئی سال تک پاکستان آرٹ کونسل کے سیکرٹری رہے۔ ۱۹۶۲ء میں انہیں لینن ادبی ادبی انعام ملا۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک انہوں نے یورپ ایشیا، اور

افریقہ کے مختلف ملکوں کی سیاحت کی۔ بالآخر ۱۹۶۲ء میں وہ لندن چلے گئے۔ وہاں مکان خرید لیا، اور مستقل طور پر علمی کام کرنے کے خیال سے اس شہر میں قیام کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہاں اُن کا دل نہ لگا۔ اور وہ ۱۹۶۴ء میں پاکستان واپس آ گئے۔ کراچی میں عبداللہ کالج کے پرنسپل رہے۔ پھر پاکستان آرٹ کونسل سے اور آر۔سی۔ڈی کے اداروں میں کئی سال تک کام کیا۔ زندگی کے آخری چند سال اُنہوں نے رسالہ لوٹس کے اڈیٹر کی حیثیت سے بیروت میں گذارے، اور اس حیثیت سے اُنہوں نے ماسکو، لندن اور یورپ کے دوسرے ممالک کا سفر کیا۔

اس زمانے میں اُن کی صحت خراب ہو گئی۔ اس لئے وہ مُستقل طور پر لاہور آ گئے، اور کئی سال بیماریٔ دل میں مبتلا رہ کر ۱۹ر نومبر ۱۹۸۴ء کو انتقال کر گئے۔ ماڈل ٹاؤن لاہور کا قبرستان اُن کی آخری آرام گاہ ہے۔

فیض ایک شاعر کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ نظریئے کے شاعر ہیں۔ وطن دوستی کے شاعر ہیں، انسانیت کے شاعر ہیں۔ بُنیادی انسانی اقدار کے شاعر ہیں۔ ظلم کے ہاتھوں پامال اور زخم خوردہ انسانوں کے شاعر ہیں، جبر و استبداد کے خلاف آواز بُلند کرنے والے باشعور لوگوں کے شاعر ہیں، طبقاتی تفریق کے خلاف جہاد کرنے والے مجاہدوں کے شاعر ہیں۔ ایک نئے نظام کو قائم کرنے والے انقلاب دوستوں کے شاعر ہیں۔ محبت اور جذب و جنوں کے شاعر ہیں۔ زندگی کی خوبصورتی اور

نوعِ انسانی کی جذباتی اور جمالیاتی پہلوؤں کی پاس داری اور ذہن و شعور کے شاعر ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جس کی شاعری میں رس ہے، رعنائی ہے۔ جس میں روایت کا حُسن اور حُسن کی روایت ہے۔ اس شاعری میں الفاظ ایسے ڈھلے ڈھلائے اور ایسے رس میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ ان پر شہد و شکر کا گمان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری دلوں میں اُترتی اور حواس پر ایک سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے۔ اُن کی شاعری کی مقبولیت کا راز اسی میں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ فیض نے شاعری کی طرف زیادہ توجہ کی، اور اُن کی شاعری ہر اعتبار سے عظیم شاعری ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بنیادی طور پر وہ ایک اکیڈمک آدمی تھے۔ علم و ادب اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ ایک اُستاد اور پروفیسر تھے۔ سنجیدہ تحریروں کا مطالعہ اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کی نثر بھی لکھتے تھے، اور اُن کا مزاج عالمانہ اور تحلیلی و تجزیاتی تھا۔ اسی لئے وہ ایک اچھے محقق اور اعلےٰ پائے کے نقاد تھے۔ اُن کی تنقیدی تحریریں اس خیال پر صداقت کی مہر لگاتی ہیں۔

اسی تحقیقی اور تنقیدی مزاج کا یہ اثر تھا کہ اُنھوں نے تدریس کے پیشے سے منسلک ہونے کے فوراً بعد ادبی تحقیق کی طرف توجہ کی اور جدید اُردو شاعری کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے تحقیقی مقالہ لکھنے کا خیال اُن کے دل میں پیدا ہوا۔ چنانچہ اُنھوں نے ڈاکٹر تاثیر کی نگرانی میں اس موضوع پر کام کرنے کے لئے ایک مُفصل خاکہ تیار کیا، اور اس کو پنجاب یونیورسٹی میں پیش کیا۔ لیکن یونیورسٹی کے

اربابِ اختیار کی قدامت پرستی، نادانی اور کم فہمی کی وجہ سے اُنہیں اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت نہیں ملی، کیونکہ یہ کہہ کر اُن کے اس خاکے کو نامنظور کیا گیا کہ یہ موضوع بہت وسیع ہے ؂

بریں عقل و رائے بباید گریست

اگر پی ایچ ڈی کرنے کے بہانے سے فیض یہ کام مکمل کر لیتے تو اُردو تحقیق و تنقید کی روایت میں گراں قدر اضافہ ہوتا، اور ایک ایسی کتاب اُردو شاعری، خصوصاً جدید اُردو شاعری' سے دلچسپی لینے والوں کے ہاتھ آجاتی جس سے وہ ہمیشہ ہمیشہ استفادہ کرتے۔

افسوس ہے پنجاب یونیورسٹی کی قدامت پرستی، کم علمی اور نادانی کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ لیکن شکر ہے کہ فیض صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا انگریزی زبان میں یہ خاکہ کسی غیبی مدد سے میرے ہاتھ آگیا، اور میں نے اس کو ایک اہم ادبی دستاویز سمجھ کر محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ کئی سال تک اس پر کام کیا۔

اور اب یہ نادر و نایاب اہم ادبی، تحقیقی اور تنقیدی دستاویز آپ کے سامنے ہے جو فیض کی شخصیت، شاعری اور تحقیق و تنقید کے مطالعے میں ہمیشہ ہمیشہ ایک مینارۂ نور بن کر اس راستے پر چلنے والوں کے لئے نشانِ راہ اور رہبرِ منزل ثابت ہوتی رہے گی۔

عبادت بریلوی

۸۷/۸۸۔این سمن آباد، لاہور

۱۶؍فروری ۱۹۸۹ء

۶۳

بلاکشانِ محبّت

گزشتہ کئی سال سے میں اس دور کی اہم شخصیات پر کام کر رہا ہوں۔
اب تک اِن شخصیات سے متعلق خاکوں کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں،
اُن میں رہ نوردانِ شوق، آوارگانِ عشق، جلوہ ہائے صد رنگ اور یارانِ دیرینہ
قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بلاکشانِ محبت، غزالان رعنا، شجرہ ہائے سایہ دار،
محبانِ بادپیما اور خوش نوایانِ چمن طباعت و اشاعت کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔
اب تک جن اہم شخصیات پر کام ہو چکا ہے، اُن میں بابائے اُردو ڈاکٹر
مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، حضرت جگر مُرادآبادی، حضرت مولانا
ابوالکلام آزاد، شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی، علامہ نیاز فتح پوری،
پروفیسر صوفی تبسم، پروفیسر حمید احمد خاں، فیض صاحب، مجاز، میراجی،

بلونت سنگھ، پروفیسر محمد حسن عسکری، میاں بشیر احمد، جناب حفیظ جالندھری، ڈاکٹر برکت علی قریشی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر سید وقار عظیم، پروفیسر سید وزیرالحسن عابدی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، مولانا نورالحسن خان اور ڈاکٹر صابر علی خاں کے نام سرِفہرست ہیں۔

اس وقت خاکوں کا جو نیا مجموعہ 'بلا کشانِ محبت' کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے، اُس میں مولانا صلاح الدین احمد، مصوّرِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی، میاں ام اسلم، پروفیسر عزیز احمد، حبیب جالب، پروفیسر سراج الدین، ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر خواجہ صلاح الدین، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل کی شخصیتوں کے خاکے ہیں۔

یہ خاکے اس اعتبار سے توجہ کے طالب ہیں کہ ان میں جو مواد پیش کیا گیا ہے وہ بالکل اچھوتا اور نیا ہے، اور ان میں نہ صرف ان شخصیات کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں بلکہ بیسویں صدی کے اس عظیم دور کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، علمی، تعلیمی ادبی، شعری اور فنّی ماحول کے ان گنت مناظر بھی آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

اس طرح ان خاکوں کی بدولت اسلامیان پاکستان و ہند کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز اور اُن کے مختلف پہلوؤں سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے۔

اور یہی اِن کی ترتیب و تالیف اور طباعت و اشاعت کا مقصد ہے!

لاہور

۲۵ر جولائی ۱۹۸۹ء

عبادت بریلوی

۶۴

سیّد آغا حسن عابدی

قیام پاکستان کے بعد جن مقتدر شخصیات نے اس وطنِ عزیز کی زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، اور مادرِ وطن کے مِنّت پذیر شانہ گیسوؤں کو سنوارا، اُس میں ایک اہم نام سیّد آغا حسن عابدی کا بھی ہے۔ اُنہوں نے پردے کے پیچھے رہ کر اس وطن عزیز کو جس طرح سنوارا اور نکھارا ہے، اُس کو ہماری تاریخ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس کے موجودہ صدر سیّد آغا حسن عابدی بُنیادی طور پر ایک بینکر ہیں، اور بینکنگ کی دُنیا میں اُنہوں نے جو اہم کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اس کا صحیح جائزہ تو مستقبل کا وہ مؤرخ ہی لے گا جس کے پیشِ نظر قیام پاکستان

کے وقت سے لے کر اس وقت تک کے معاشی اور اقتصادی نشیب و فراز کی اَن گنت تصویریں ہوں گی۔ اِن تصویروں میں ایسے ایسے مناظر بھی سامنے آئیں گے جن سے آغا حسن کی بھرپور، رنگا رنگ اور دلکش و دِلآویز شخصیت کے اَن گنت رنگ روپ اپنی بہار دکھائیں گے اور جن کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ اُن کی ہمہ گیر اور پہلو دار شخصیت، ایک جلوۂ صد رنگ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بینکنگ کی دُنیا میں آغا حسن نے اپنی فہم و فراست اور محنت و جفاکشی سے قلیل عرصے میں بین الاقوامی شہرت حاصل کرلی، اور نہ صرف پاکستان بلکہ دُنیا کے مختلف ممالک میں ایسے ایسے عظیم منصوبوں پر کام کیا جن کی بدولت ان مُلکوں کی معاشی واقتصادی زندگی کو ترقی کی اَن گنت منزلوں سے ہم کنار ہونے کے بے شمار مواقع مِلے۔

بینکنگ کی دُنیا کی اہم شخصیتوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، اور مختلف طریقوں سے آغا حسن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے مجبور ہوئے ہیں۔ اُن کے خیال میں سیّد آغا حسن عابدی دُنیا کے اہم بینکروں کی صفِ اوّل میں نمایاں ترین مقام سے ہم کنار نظر آتے ہیں۔

آغا حسن مستقل اور مسلسل مثبت انداز میں کام کرنے کی دُھن سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں لیکن اس کے باوجود وطن پرست ہیں۔ اُنہوں نے پاکستان سے عشق کیا ہے، اور وہ آج بھی اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ پاکستانی ہونا ہماری شناخت ہے، اور ہم جس بین الاقوامی سطح پر جس شعبے میں بھی کام کرتے ہیں، اُس کی تہہ میں پاکستان کے وقار کا خیال اور اس کو ارتقا کے راستے پر گامزن کرنے کا جذبہ ضرور کارفرما ہوتا ہے ۔ وہ

خدمت کو عبادت اور خلوص و محبت کو اپنے لئے سعادت تصوّر کرتے ہیں۔

—— اور اسی میں اُن کی عظمت اور بلندی و برتری کا راز ہے۔

آغا حسن نہایت مخلص، مہذب، شائستہ، بلند اخلاق، انسان دوست، ہمدرد اور محبت اور خدمت کرنے والے انسان ہیں۔ اُن کے ایسے لوگ اس دُنیا میں آج کل ذرا مشکل ہی سے نظر آتے ہیں —— اُن کی شخصیت کی اُنہیں خصوصیات نے میرے دِل میں اِن کا خاکہ لکھنے کی تحریک پیدا کی، اور میں نے گزشتہ نصف صدی میں اُنہیں جس انداز میں بھی دیکھا ہے، اور اُن کے ساتھ رہ کر مجھے جو تجربات بھی ہوئے ہیں، اُن کی بے شمار تصویریں میں نے اس خاکے میں سچائی اور جذب و شوق کے ساتھ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اِن تصویروں کے خطوط کیسے تیکھے اور رنگ کس درجہ شوخ اور پُر بہار ہیں، اس کا اندازہ تو انہیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جو کسادبازاری کے اس دورِ پُر آشوب میں زندگی کی اعلیٰ اور ارفع قدروں کے علم بردار ہیں۔

گزشتہ نصف صدی میں، میں نے اس دور کی بے شمار شخصیتوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے لیکن حُسن و جمال، رنگینی و رعنائی اور دلبری و دل رُبائی کی جو کیفیت مجھے آغا حسن کی دلکش و دلآویز شخصیت میں نظر آتی ہے وہ میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اس عظیم شخصیت کا قُرب حاصل رہا ہے اور میں نے اُس سے اور اُس نے مجھ سے ایسی محبت کی ہے جو جذب و جنوں سے عبارت ہے۔

اسی لئے تو جب بھی اُس کا خیال ہزار چشمک برق و شرر چھپاتے ہوئے میرے

دل و دماغ کے افق پر رقص کرتا ہے تو اس شعر کی معنویت اور نغمگی میری رگ رگ میں سما جاتی ہے اور والہانہ انداز میں مجھ سے نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی ہے بقول حضرت امیر خسروؒ کے

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، امّا تو چیزے دیگری

لاہور
ستمبر ۱۹۸۹ء

عبادت بریلوی

٦٥

شاعری کیا ہے؟

جدید شاعری پر میری ایک ضخیم کتاب ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اِس میں جدید اُردو شاعری کے مختلف پہلوؤں، اُس کے معاملات و مسائل اور اس تحریک کے چند اہم علم برداروں کا تنقیدی مطالعہ تھا۔
اب بیس پچیس سال بعد یہ کتاب "جو شاعری کیا ہے"؟ کے نام سے شائع ہو رہی ہے اس میں شاعری پر کچھ نظریاتی اور اصولی مباحث ہیں، اور اُن کی روشنی میں جدید شاعری کے چند علم برداروں کے ایسے مطالعے شامل ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوتا کہ گذشتہ نصف صدی میں اُس نے ترقی کی کون کون سی منزلیں طے کی ہیں، اور اس میں کس قسم کے نئے رجحانات

پیدا ہوئے ہیں۔

جدید اُردو شاعری گذشتہ ایک صدی میں پیدا ہونے والے مختلف رُجحانات اور رنگا رنگ تجربات کا ایک حسین مُرقع ہے۔ اور خود اس کا مطالعہ بھی ایک دلچسپ تجربہ ہے۔ کیونکہ اُس نے اپنے عہد کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، ذہنی اور فکری پہلوؤں کو بڑے سلیقے سے اپنے دامن میں جگہ دی ہے اور ساتھ ہی جمالیاتی اظہار میں بھی ایسے ایسے گُل بوٹے کھلائے ہیں جس نے اُس کو دامان باغباں اور کفِ گل فروش بنا دیا ہے۔

اس کتاب میں اسی صورت حال کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نامور شاعروں کے ساتھ بعض ایسے شاعروں کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے جو ابھی اس محفل میں نو وارد ہیں۔

اس لئے مجھے یقین ہے کہ اس کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

لاہور

۳۰ نومبر ۱۹۸۹ء

عبادت بریلوی

۶۶

غزالانِ رعنا

میں اس اعتبار سے ایک خوش قسمت انسان ہوں کہ مجھے ایک طالب علم اور اُستاد کی حیثیت سے اعلیٰ درجے کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے اور تدریس و تحقیق کا کام کرنے کے مواقع ملے۔ اِن اداروں میں ایسے لوگوں سے میرا تعلق رہا جن کی زندگیاں محبت اور شفقت سے عبارت تھیں۔ اور جو عظیم انسان تھے۔ میں اِن سے متاثر ہوا، اور میں نے اِن سے زندگی کو خوبصورت بنانے اور اس کو بسر کرنے کے آداب سیکھے۔

اس کتاب "غزالان رعنا" میں ایسے ہی بعض ساتھیوں، دوستوں اور بزرگوں کی شخصیتوں کے خاکے ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک تعلیمی، علمی، ادبی، تہذیبی اور اخلاقی اعتبار سے برگزیدہ خصوصیات کا مالک تھا۔ اس لئے میں نے یہ ضروری سمجھا کہ اِن کی شخصیتوں کے اہم پہلوؤں کو اُجاگر کیا جائے

تاکہ پڑھنے والے اِن کے بنائے راستوں پر گامزن ہوں، اور اُن کے ہاتھوں انسانی زندگی کو خوبصورت بنانے کا کام انجام پائے۔

غزالانِ رعنا میں جن احباب کی شخصیتوں کے خاکے شامل ہیں، اُن میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے مخصوص شعبوں میں بڑے اہم کارنامے انجام دیئے، اور اپنے فکر و عمل سے انسانی زندگی کو بنانے، سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اِن میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ روشنی کا ایک مینار نظر آتا ہے۔

گذشتہ چند سال سے میں اس دور کی ایسی اہم شخصیات پر کام کر رہا ہوں جن سے اس حیاتِ مُستعار میں میرا رابطہ رہا ہے۔ اِن شخصیات کے خاکوں کے جو مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں، اُن میں (۱) رہ نوردانِ شوق (۲) آوارگانِ عشق (۳) جلوہ ہائے صد رنگ (۴) یارانِ دیرینہ اور (۵) بلاکشانِ محبت قابلِ ذکر ہیں۔

غزالانِ رعنا اس سلسلے کا چھٹا مجموعہ ہے جو اس وقت شائع کیا جا رہا ہے۔ اِن کے علاوہ چار مجموعے (۱) آہوانِ صحرا (۲) شجر ہائے سایہ دار (۳) خوش نوایانِ چمن (۴) شوریدگانِ شوق (۵) رندانِ بادہ کش اور (۶) یارانِ طریقت۔ طباعت و اشاعت کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ یہ مجموعے بھی انشاء اللہ جلد شائع ہو جائیں گے۔

شخصیات کے اِن خاکوں کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بُنیاد جذب و شوق پر استوار ہے اور ان میں اسلامیانِ پاکستان و ہند کی زندگی، ان کی معاشرت اور تہذیب سے متعلق ایسا نیا اور اچھوتا مواد ہے جس سے اس دور کی سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور ادبی زندگی کے

خدوخال، اس کے معاملات و مسائل، اور اُس کے رُجحانات و میلانات کی اَن گنت تصویریں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔

اس کام میں مجھے کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ تو میرے پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ میں تو ان شخصیات کے خاکوں کو دیکھ کر اصغر گونڈوی کے یہ اشعار پڑھتا ہوں اور ان کی پہلو دار معنویت پر سر دُھنتا ہوں ؂

یہ عشق نے دیکھا ہے، یہ عقل سے پنہاں ہے
قطرے میں سمندر ہے ذرّے میں بیاباں ہے

پھر گرمِ نوازش ہے ضو مہرِ درخشاں کی
پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھُلی دیکھا، اپنا ہی گریباں ہے

عبادت بریلوی

۲۱ سی، یونین پارک ہمن آباد لاہور
۲۵ مارچ ۱۹۹۰ء

(۶۷)

آہوانِ صحرا

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف
بہ اُمیدِ آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

جب بھی میں اپنے دوستوں، رفیقوں، شاگردوں اور پڑھنے والوں کو یاد کرتا ہوں تو حضرت امیر خسرو دہلویؒ کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے، اور اس پہلو دار اور حسین شعر کی معنویت میری رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔

اس حیات مستعار میں مجھے اچھے رفقائے کار، اعلیٰ پائے کے دوست اور جذب وشوق سے سرشار شاگرد ملے، اور میں اُن سے متاثر ہوا۔ اُنہوں نے ہمیشہ میرے ساتھ تعاون کیا اور وہ ہمیشہ میرے کاروبار حیات کو

چلانے میں مُمدو معاون ثابت ہوئے۔

یہ کتاب "آہوانِ صحرا" ایسے ہی چند دوستوں، رفیقوں، شاگردوں اور پڑھنے والوں کی شخصیات کے خاکوں پر مُشتمل ہے۔ اُنہوں نے اپنے اپنے مخصوص شعبوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، وہ ہماری تعلیمی، علمی، معاشرتی، تہذیبی اور ادبی زندگی میں سُنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ میں نے تو اِن کی شخصیتوں کے صرف چند پہلوؤں کی جھلکیاں ہی دکھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اِن سے اُن کی اہمیت کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

میرے یہ دوست اور عزیز محبت کے پُتلے، اخلاص کے پیکر اور جذب و جنوں کے مجسمے تھے۔ ہر آزمائش پر پورا اُترنا اُن کا نصب العین تھا۔

گُذشتہ چند سال سے میں اس دور کی اہم تہذیبی اور ادبی شخصیات پر کام کر رہا ہوں۔ شخصیات کے ان خاکوں کے چھ مجموعے (۱) رہ نوردانِ شوق (۲) آوارگانِ عشق (۳) جلوہ ہائے صد رنگ (۴) یارانِ دیرینہ (۵) بلاکشانِ محبت، اور (۶) غزالانِ رعنا۔ اِس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ "آہوانِ صحرا" اس سلسلے کی ساتویں کتاب ہے۔ اس کے علاوہ چار اور مجموعے (۱) شجر ہائے سایہ دار (۲) خوش نوایانِ چمن، (۳) شوریدگانِ شوق اور (۴) صفیرانِ سحر۔ کتابت وطباعت کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ یہ بھی انشاء اللہ جلد شائع ہوں گے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ اِن دلچسپ شخصیات کے مطالعے میں اُن کے عہد کی تہذیبی، معاشرتی، اخلاقی اور علمی و ادبی زندگی کے

مختلف پہلوؤں کی تصویریں بھی آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔
اس کا مقصد بھی اسلامیان پاکستان و ہند کی زندگی کے مختلف پہلوؤں
سے نقاب اُٹھانا اور اُن کی رنگارنگ خصوصیات کا جلوہ دکھانا ہے۔
اس لئے کہ ادب اور ادبی تاریخ کے مطالعے کا پودا اسی زمین میں
پھیلتا بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے۔

لاہور
یکم نومبر ۱۹۹۰ء

عبادت بریلوی

۶۸

شجر ہائے سایہ دار

گذشتہ چند سال سے اِس عہد کی اہم تہذیبی اور ادبی شخصیات پر جو کام میں کر رہا ہوں، "شجر ہائے سایہ دار" اس سلسلے کی آٹھویں کتاب ہے۔

اِس سے قبل اس عظیم دور کی اہم شخصیات کے سات مجموعے (۱) رہ نوردانِ شوق (۲)، آوارگانِ عشق (۳) جلوہ ہائے صد رنگ (۴)، یارانِ دیرینہ (۵)، بلاکشانِ محبت (۶)، غزالانِ رعنا اور (۷) آہوانِ صحرا شائع ہو چکے ہیں۔

ان سات کتابوں میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، حضرت جگر مُرادآبادی، مولانا حسرت موہانی، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت نیاز فتح پوری، پروفیسر حمید احمد خاں، پروفیسر

صوفی تبسم، ڈاکٹر سید عبداللہ، مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی، مولانا صلاح الدین احمدؔ، پروفیسر عزیز احمدؔ، میاں ام۔ اسلم، میاں بشیر احمدؔ، پروفیسر سید وقار عظیم، پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی، مولانا نور الحسن خاں، ڈاکٹر برکت علی قریشی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر صابر علی خاں، پروفیسر سراج الدین، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مولانا سید مرتضیٰ حسین، فاضل لکھنوی، ڈاکٹر نذیر احمدؔ، پروفیسر خواجہ صلاح الدین، ناصر کاظمی، حبیب جالب، پروفیسر محمدؐ حسن عسکری، سید آغا حسن عابدی، پروفیسر سید نور الحسن، مرزا منان اللہ بیگ، پروفیسر مرزا محمود بیگ، ڈاکٹر خورشید احمدؔ فارق، سید انعام الحق، پروفیسر سر سرل فلپس، پروفیسر رالف رسل، پروفیسر مارا اسیتپانیس، پروفیسر سوخا چیف، پروفیسر ڈاکٹر محمدؐ باقر، ڈاکٹر رانا احسان الٰہی، ڈاکٹر تاثیر، مولانا حامد علی خاں، پروفیسر خواجہ منظور حسین، ڈاکٹر سید ناظر حسن، ڈاکٹر عُبید اللہ خاں، ڈاکٹر سُہیل احمدؔ خاں، سید انور حسین شاہ نفیس الحُسینی، پروفیسر ڈاکٹر طارق سومر، ڈاکٹر شوکت بولو، حکیم حافظ جلیل احمدؔ وغیرہ کی شخصیات کے خاکے ہیں۔

"شجرہائے سایہ دار" اس سلسلے کا آٹھواں مجموعہ ہے جس میں قائدِ اعظم محمدؐ علی جناح، بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، جناب رفیع احمدؔ قدوائی، پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا محمدؐ حسین، پروفیسر سیّد احتشام حسین اور ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمٰن کی ایسی عظیم شخصیات کے خاکے ہیں جو میرے رہبر و رہنما اور اُستاد تھے، جن کی شفقت اور محبت مجھ پر بے اندازہ تھی، اور جن سے میں نے زندگی میں بہت کچھ حاصل کیا ہے۔

یہ خاکے اس اعتبار سے دلچسپ اور مُفید ہیں کہ اِن سے نہ صرف اِن عظیم انسانوں کی جیتی جاگتی تصویریں سامنے آتی ہیں بلکہ بیسویں صدی کے اس عظیم دور کے معاشرتی، تہذیبی، تعلیمی، علمی اور ادبی ماحول کا نقشہ بھی اُبھر کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

اور یہی اِن خاکوں کو تحریر و تسوید اور طباعت و اشاعت کا بُنیادی مقصد ہے!

عبادت بریلوی

۲۵ مارچ ۱۹۹۱ء

لاہور

(۶۹)

لندن کی ڈائری

(جلد اوّل)

میں نے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی میں بہ حیثیت اُستاد زندگی کے چھ سات سال گذارے۔

جس دن سے میں وہاں گیا، میں نے روزانہ کے حالات ڈائری کی صورت میں تحریر کئے، اور اب اس ڈائری کا ایک حصّہ، جو بہ ذات خود مکمل ہے، اشاعت کے لئے پیش کیا جارہا ہے۔

اس میں قیام لندن کی تفصیل ہے جو دلچسپ بھی ہے، اور مفید بھی!

لاہور

۷ رجنوری ۱۹۹۲ء

عبادت بریلوی

خطوط پروفیسر محمد حسن عسکری

پروفیسر محمد حسن عسکری صاحب اُردو کے نامور نقاد تھے۔ میں جس زمانے میں اینگلو عربک کالج دہلی میں تھا، عسکری صاحب کا میرے پاس آنا جانا تھا۔ تقریباً روزانہ وہ شام کو میرے پاس اینگلو عربک کالج ہوسٹل میں آتے تھے، اور مجھے نہایت بے تکلفی کی فضا میں چند ادبی لطیفے سناتے تھے۔ میں بھی اُن کے ہاں ترکمان گیٹ کے مکان میں اکثر جایا کرتا تھا۔ خوب باتیں ہوتی تھیں۔

جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو عسکری صاحب پہلے پاکستان آگئے اور میں کوئی ایک سال بعد پاکستان آیا۔ عسکری صاحب تو زیادہ عرصے تک مستقل طور پر لاہور میں قیام نہ کر سکے، اور چند ماہ بعد انگریزی زبان وادب کے اُستاد کی حیثیت سے وہ اسلامیہ کالج کراچی چلے گئے۔ میں اورینٹل کالج لاہور ہی میں رہا۔

عسکری صاحب سے اسی زمانے میں خط وکتابت شروع ہوئی۔ بے شمار خطوط اُنہوں نے مجھے لکھے، اور میں نے بھی انہیں بہت سے ذاتی خطوط لکھ کر اپنا مافی الضمیر اُن پر ظاہر کیا۔ چھٹیوں میں وہ لاہور بھی آتے تھے اور اُن کا مکان میرے مکان کے بہت قریب تھا، اس لئے لاہور کے دوران قیام میں تقریباً روزانہ اُن سے ملاقات ہوتی تھی، اور جب وہ کراچی جاتے تو اکثر مجھے اپنے خطوں سے نوازتے تھے۔

ان خطوط میں ادبی مباحث ہیں۔ اور ان میں عسکری صاحب کا انداز تحریر اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ ان خطوں کو شائع کر دیا جائے۔

چنانچہ ان خطوں کو اب شائع کیا جاتا ہے۔

۸۷/ ۸۸۔ این، سمن آباد، لاہور

۷ / جنوری ۱۹۹۳ء

عبادت بریلوی

عسکری صاحب سے میری مُلاقات ۱۹۴۴ء میں ہوئی، جب وہ الٰہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کرنے کے بعد دہلی آئے، اور یہاں تلاش معاش میں وقت گزارنے لگے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کو ملازمت، خاص طور پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ملازمت بڑی مشکل سے ملتی تھی عسکری صاحب بھی اُس زمانے میں انہی تجربات سے دوچار ہو رہے تھے جو ہر مُسلمان نوجوان کو ہوتے تھے۔ اس عالم میں انہوں نے وقتی طور پر شاہد احمد دہلوی صاحب کے، ساقی، کے ساتھ ایک رابطہ قائم کر لیا تھا، شاہد احمد صاحب خود ایک بڑے ہی محنتی اور تجربے کار ایڈیٹر تھے، لیکن عسکری صاحب کا دلی آنا ان کے لئے اور خود ساقی کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس زمانے میں انہوں نے شاہد صاحب کا ہاتھ بٹایا، ساقی میں خود بھی مضامین اور افسانے لکھے اور اپنے دوستوں کو بھی ساقی میں مضامین لکھنے پر آمادہ کیا۔

شاہد صاحب اس زمانے میں رہتے تو کھاری باؤلی میں تھے لیکن ان کا ایک مکان جامع مسجد کے سامنے والی آبادی مٹیا محل کی ایک گلی میں بھی تھا۔ اس گلی کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ میں پہلی بار اس مکان میں شاہد صاحب سے

ملا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ شاہد صاحب نماز سے فارغ ہو کر میرے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک صاحب نے باہر دروازے پر آواز دی "شاہد صاحب"! اور اندر آ گئے۔

یہ عسکری صاحب تھے۔

شاہد صاحب نے میرا اُن سے تعارف کروایا۔ میرے بارے میں کہا کہ یہ "عبادت صاحب ہیں۔ لکھنؤ سے آئے ہیں اور اب دِلّی ہی میں رہیں گے۔ اینگلو عربک کالج میں اُردو پڑھائیں گے۔"

عسکری صاحب بولے "عبادت صاحب! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اب انشاء اللہ ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔ اس وقت تو میں ذرا جلدی میں ہوں۔ ایک صاحب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے وہاں جلدی پہنچنا ہے۔ شاہد صاحب سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔ اس لئے صرف کھڑے کھڑے بات کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس لئے اس وقت اجازت لوں گا۔"

میں نے پوچھا "اب ملاقات کیسے ہوگی؟

کہنے لگے "کل عتیق صدیقی صاحب کے یہاں آیئے۔ آپ اُن سے واقف ہوں گے۔ لکھنؤ سے آتے ہیں اور دلی کے رہنے والے ہیں۔ جامع مسجد کے سامنے ہی ان کا مکان ہے۔ کل مغرب کے بعد وہیں مُلاقات ہوگی۔ میں مغرب کے بعد جامع مسجد کے سامنے آپ کا انتظار کروں گا۔"

میں نے اُن سے ملنے کا وعدہ کر لیا۔ عتیق صاحب کو میں جانتا تھا۔ لکھنؤ میں اُن سے ملاقات ہوتی تھی۔ وہ یونیورسٹی لائبریری اور پبلک لائبریری میں اکثر آیا کرتے تھے کچھ تحقیق کر رہے تھے۔ یہ نہیں معلوم ہوا کہ اب دلّی میں کیا کرتے ہیں۔

عسکری صاحب اس طرح چند منٹ باتیں کر کے چلے گئے۔
وہ واقعی جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ان پر کچھ اضطراب کی سی کیفیت طاری تھی۔ شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ عینک لگی ہوئی تھی، چہرہ لمبا تھا۔ بالوں کی وضع نے اس کو کچھ اور بھی لمبا بنا دیا تھا۔ گندمی رنگ، چھریرا بدن، آگے کے دانت قدرے باہر کی طرف نکلے ہوئے۔ ہر بات میں عاجزی اور انکساری کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ لیکن مجموعی طور پر وحشت سی ٹپک رہی تھی۔ جلدی جلدی باتیں کرتے تھے۔ آنکھ سے آنکھ نہیں ملاتے تھے۔ بے چینی ان کے ایک ایک انداز سے ٹپکتی تھی۔
میں نے انہیں غور سے دیکھا، اور دیر تک دیکھتا اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ غائبانہ طور پر ان سے واقفیت تھی۔ کیونکہ میں نے ان کے افسانے 'پھسلن' چائے کی پیالی، اور حرام جادی پڑھ رکھے تھے، اور ان کی شخصیت میں میں نے ایک بہت بڑے افسانہ نگار کی جھلک دیکھی تھی۔ میں ان سے بہت متاثر تھا۔ اس لئے دلی میں جب اس طرح ان سے اچانک ملاقات ہوئی تو ان سے مل کر مجھے بے حد مسرّت ہوئی۔
عسکری صاحب چلے گئے تو شاہد صاحب ان کے بارے میں دیر تک دلچسپ باتیں کرتے رہے۔ کہنے لگے "عسکری صاحب خوب آدمی ہیں۔ پارہ ہیں پارہ۔ انہیں ایک جگہ پر قرار نہیں۔ بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں لیکن جن سے ملتے ہیں خوب گھل مل کر ملتے ہیں۔ ساقی کو انہوں نے سہارا دیا ہے۔ میرا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ بڑے مخلص آدمی ہیں۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔"

میں شاہد صاحب کی یہ باتیں سُنتا رہا اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔

دوسرے دن مغرب کے وقت میں عتیق صدیقی صاحب کے مکان پر پہنچا۔ تلاش کرنے میں کچھ دیر ہوئی۔ بہر حال پوچھتا پوچھتا پہنچ گیا۔ عتیق صاحب کا مکان کیا تھا۔ بس ایک کمرہ تھا۔ میں نے آواز دی، عتیق صاحب باہر آگئے اور مجھے اندر لے گئے۔ عسکری صاحب یہاں پہلے سے بیٹھے تھے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ شام کو روزانہ وہاں آتے ہیں اور عتیق صاحب ہی سے آج کل ان کی دوستی ہے۔

عتیق صاحب سے دیر تک کچھ لکھنو کی باتیں ہوتی رہیں۔ ادب اور ادبی رُجحانات کا بھی ذکر رہا۔ عسکری صاحب خاموش رہے۔ ہماری باتیں سُنتے رہے۔ اور ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔

کوئی نو بجے کے بعد ہم لوگ وہاں سے رُخصت ہوئے۔ عتیق صاحب نے ہمیں خدا حافظ کہا۔ عسکری صاحب میرے ساتھ جامع مسجد تک آئے اور چاوڑی بازار کے موڑ تک میرا ساتھ دیا۔ کچھ دیر وہاں رُک کر باتیں کیں اور پھر ساقی کے لئے مضمون اور نظموں کا تقاضا کر کے رخصت ہوئے۔

وہ ان دنوں ترکمان دروازے کے باہر رہتے تھے۔ کل پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہ ترکمان دروازے کی طرف چل دیئے۔ میں اینگلو عربک کالج جانے کے لئے اجمیری گیٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔

دوسرے دن وہ اینگلو عربک کالج آئے اور اس طرح کالج میں ملاقاتوں کا سلسلہ باقاعدگی سے شروع ہوگیا۔ عسکری صاحب کو کالج کا ماحول بہت پسند آیا۔ اس وجہ سے کہ اس میں بڑی تہذیب اور

شائستگی تھی۔ بڑا سکون تھا۔ بڑی آزادی تھی۔ ہر شخص ایک دوسرے کی عزّت کرتا اور خیال رکھتا تھا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ چند ہفتے کے بعد انگریزی کے ایک اُستاد چھ مہینے کی طویل رُخصت پر ملک سے باہر چلے گئے۔ یہ جگہ خالی ہوئی تو میں نے عسکری صاحب سے کہا کہ آپ اس کو قبول کر لیجئے۔ پہلے تو انہوں نے انکار کیا لیکن پھر میرے اصرار پر کالج میں انگریزی پڑھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ چند روز پڑھانے میں ان کا ایسا دل لگا کہ مستقل طور پر عربک کالج میں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن وہ جگہ عارضی تھی اس لئے میں کوشش تو کرتا رہا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ ان کو مستقل کرانے کے معاملے میں مجھے کامیابی ہو سکے گی۔

عسکری صاحب سے میں نے کبھی کبھی دبی زبان سے اس کا اظہار بھی کیا تاکہ کہیں اور بھی ملازمت کی کوشش جاری رہے لیکن عسکری صاحب بڑے ہی بے نیاز آدمی تھے۔ انہوں نے اب سوچ رکھا تھا کہ ملازمت کریں گے تو اینگلو عربک کالج میں۔

چنانچہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب عسکری ایک روز آئے اور مجھ سے کہا کہ الہ آباد یونیورسٹی میں اُنہیں انگریزی کی لکچراری مل رہی ہے لیکن وہ وہاں جانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

میں نے تفصیل دریافت کی تو بتایا کہ ڈیب صاحب کا خط الہ آباد سے آیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے وہ میرے محترم استاد ہیں اور مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ لکھا ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے ایک لکچرار کی جگہ خالی ہے، اس پر میرا تقرر ہو سکتا

ہے۔ اس لئے انہوں نے مجھے فوراً الہ آباد پہنچنے کی تاکید کی۔ لیکن میں نے آپ سے مشورہ کئے بغیر یہ لکھ دیا ہے کہ مجھے اینگلو عربک کالج اور دہلی سے کوئی شکایت نہیں۔ اس لئے میں الہ آباد یونیورسٹی میں ملازمت کرنے سے قاصر ہوں۔ ویسے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے نوازش فرمائی اور میرا خیال رکھا۔"

میں ان کی یہ باتیں سُن کر حیرت زدہ رہ گیا، اور میں نے کہا"الہ آباد یونیورسٹی تو عظیم یونیورسٹی ہے۔ پھر یہ آپ کی اپنی یونیورسٹی ہے۔ دیب صاحب آپ کے شفیق استاد بھی ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب بھی ان کے نام معنون کی ہے۔ عربک کالج کی یہ جگہ جس پر آپ کام کر رہے ہیں عارضی ہے۔ آپ کو دیب صاحب کی بات مان لینی چاہیئے تھی۔"

عسکری صاحب کہنے لگے"مجھے معلوم تھا کہ آپ یہی سب کچھ کہیں گے۔ اسی لئے تو میں نے آپ سے مشورہ کئے بغیر دیب صاحب کے خط کا جواب لکھ دیا۔ اور ابھی ابھی اسے پوسٹ کر کے آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ آپ کے کہنے سے مجھے اپنا فیصلہ بدلنے کا خیال تک پیدا نہ ہو۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

اب میں عسکری صاحب سے بحث کیا کرتا۔ مجھے ان کے مزاج کا علم تھا۔ اس لئے میں نے یہی کہا کہ"آپ نے اچھا کیا،"اس خیال سے کہ انہیں ملال نہ ہو۔

خیر تو عسکری صاحب الہ آباد نہیں گئے۔

اور میرے لئے یہ بات پریشانی کا باعث ہوئی، کیونکہ اس زمانے میں مسلمانوں کو ملازمت ملنا اور خصوصیت کے ساتھ یونیورسٹیوں میں اور

پھر انگریزی میں، تقریباً ناممکن سی بات تھی۔ میں یہ سوچتا رہا کہ عسکری صاحب نے ایک بہت اچھا موقع کھو دیا، اور دیب صاحب کی شفقت اور محبت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔

لیکن کوئی کیا کر سکتا تھا۔ عسکری صاحب مزاج کے اعتبار سے بادشاہ تھے۔ جو بات دل میں سما جائے وہی کرتے تھے۔ کوئی انہیں دوسری طرف نہیں لے جا سکتا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ چھ مہینے کے بعد عربک کالج کی ملازمت ختم ہو گئی۔ کوشش کے باوجود اس میں توسیع کرانے میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ پرنسپل نے اپنی سی پوری کوشش کی۔ لیکن وہ بھی ایک نئی پوسٹ کا اضافہ نہ کروا سکے۔ گورننگ باڈی نے ان سے اتفاق نہیں کیا۔ اور عسکری صاحب کی ملازمت ختم ہو گئی۔

اسی زمانے میں مجھے یہ علم ہوا کہ شبلی کالج اعظم گڑھ میں انگریزی کے پروفیسر کی ایک جگہ خالی ہے، اور وہ لوگ کسی مُسلمان کو اس جگہ پر رکھنا چاہتے ہیں۔

میں نے عسکری صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ اور کسی طرح انہیں اعظم گڑھ جانے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ وہ میرے اصرار پر دلّی سے اعظم گڑھ کے لئے روانہ ہوتے۔ میں نے خود انہیں رُخصت کیا۔ جاننے والوں کو خطوط بھی لکھ دیتے۔

لیکن تیسرے روز دیکھا کہ عسکری صاحب اینگلو عربک کالج میں چلے آرہے ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے خیریت پوچھی اور دریافت کیا کہ آپ اتنی جلدی کیسے واپس آگئے۔

عسکری صاحب کہنے لگے "صاحب! آپ نے مجھے کہاں بھیج دیا تھا۔ میں اعظم گڑھ تک تو پہنچ گیا۔ لیکن شبلی کالج تک نہ پہنچ سکا۔ درمیان سے واپس آگیا۔"

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

کہنے لگے میں "اعظم گڑھ کے اسٹیشن پر اُترا۔ ویران سا اسٹیشن تھا۔ باہر نکل کر میں نے ایک تانگے والے سے کہا کہ "میاں شبلی کالج پہنچا دو"۔ وہ تیار ہو گیا۔ میں اس کے تانگے میں سامان رکھ کر بیٹھ گیا۔ اُجاڑ سی سڑک پر تانگہ چلنے لگا۔ کچھ دور اور آگے گیا تو سڑک کچھ اور بھی ویران نظر آنے لگی۔ اس سڑک پر تو بجلی کے کھمبے تک نہیں تھے۔ میونسپلٹی کی لالٹین لگی تھیں، گاؤں کا سا ماحول معلوم ہوتا تھا۔ لوگ عجیب سے پوربی لہجے میں اُردو بول رہے تھے۔ اس ماحول کو دیکھ کر میری طبیعت گھبرا گئی اور اختلاج سا ہونے لگا۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اس ویران جگہ میں نہیں رہ سکوں گا۔ اس لئے میں نے تانگے والے سے کہا، "میاں! اسٹیشن واپس چلو، میں شبلی کالج نہیں جاؤں گا۔ میں اس شہر میں رہنے کے لئے تیار نہیں۔"

تانگے والا میری باتیں سُن کر حیران اور پریشان ہوا، لیکن اُس نے میری ہدایت کے مطابق مجھے اسٹیشن پہنچا دیا۔ اور میں گاڑی میں بیٹھ کر دوسرے ہی دن دلی واپس پہنچ گیا، شکر ہے کہ اعظم گڑھ اور شبلی کالج سے مجھے نجات ملی۔ دِلّی پہنچا تو جان میں جان آئی۔ عبادت صاحب! میں دِلّی چھوڑ کر کہیں اور نہیں جا سکتا۔"

مجھے عسکری صاحب کی اِن باتوں نے بہت لُطف دیا اور میں یہ سوچتا رہا کہ اس معصوم آدمی کا دِلّی چھوڑ کر اعظم گڑھ یا کسی اور جگہ ملازمت

کے لئے جانا ہرگز مناسب نہیں۔

میں نے یہ روداد اینگلو عربک کالج کے پرنسپل کو سنائی۔ وہ بہت محظوظ ہوئے، اور کہنے لگے "عسکری صاحب کے لئے کسی نہ کسی طرح عربک کالج ہی میں ملازمت کا انتظام کرنا پڑے گا۔ ایسے معصوم اور دلچسپ آدمی کو دلّی سے باہر نہیں جانا چاہیئے۔"

چنانچہ چند روز میں عسکری صاحب کے لئے انگریزی کی ایک جگہ کسی طرح بنائی گئی، اور اس پر ان کا تقرر ہو گیا۔

اور عسکری صاحب لڑکوں کو ایک دفعہ پھر انگریزی پڑھانے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اینگلو عربک کالج اس تحریک کا گڑھ تھا۔ قائد اعظم اس کالج کے سرپرست اور نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب اس کے صدر تھے۔ مسلم لیگ کے جلسے اسی کالج میں ہوتے تھے۔ ہر وقت ایک جشن کا سا سماں رہتا تھا۔ اساتذہ اور طلباء سب مسلم لیگ کے حامی تھے۔ اور تحریک پاکستان میں پیش پیش تھے۔

عسکری صاحب اس ماحول سے متاثر ہوئے اور وہ تحریک پاکستان میں پیش پیش نظر آنے لگے۔ بظاہر تو ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا، زیادہ وقت وہ ادبی مطالعے میں گذارتے تھے، لیکن ذہنی طور پر وہ پاکستان کی تحریک سے پوری طرح وابستہ ہو گئے اور اس وابستگی نے ان کے ہاں بڑی شدت اختیار کر لی۔ اب ہر وقت وہ پاکستان کی باتیں کرتے تھے، اور مسلمانوں کے لئے اس کی تشکیل و تعمیر کو ضروری خیال کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ آگ اور پانی کا میل بھلا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ غرض

عسکری صاحب خاصے جذباتی انداز میں اس قسم کی باتیں کرتے تھے۔

اس زمانے میں مذہب کا ان پر برائے نام بھی اثر نہیں تھا۔ وہ صرف ایک ادبی آدمی تھے۔ انہوں نے جدید ادب کے بڑے بڑے عَلم برداروں کا بغور مطالعہ کیا تھا، اور ان دنوں وہ اپنا زیادہ وقت مغرب کو سمجھنے اور تہذیب مغرب سے آشنا ہونے میں صرف کر رہے تھے۔ ساتھ ہی مشرقی ادبیات خصوصاً اُردو شاعروں کے مطالعہ کا سلسلہ بھی جاری تھا عسکری صاحب ان موضوعات پر خوب پڑھتے اور مضامین و مقالات لکھتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے ساقی، میں تنقیدی جھلکیاں، کے عنوان سے ایک ادبی کالم لکھنا شروع کیا تھا اس میں جیمس جوائس، بادلیر، پروست، ییٹس، ایلیٹ اور ازرا پاؤنڈ وغیرہ پر ان کے ایسے معیاری مقالات شائع ہوئے کہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی کم کم شائع ہوئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں میر، جرأت، حالی، امیر اور محسن کاکوروی وغیرہ پر بھی انہوں نے مضامین لکھے۔ ادبی اور شعری مسائل پر بھی بے شمار تنقیدی مضامین شائع کئے اور ساتھ ہی افسانوں کی تخلیق کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "جزیرے" اسی زمانے میں شائع ہوا تھا۔

عسکری صاحب اس زمانے میں ترکمان دروازے کے اندر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ عسکری صاحب یہاں رہتے ہیں۔ ان کے دوستوں کی تعداد اس زمانے میں تین چار سے زیادہ نہیں تھی۔ ان میں ایک تو عتیق صدیقی صاحب تھے دوسرے مشہور افسانہ نگار غلام عباس، تیسرے ایک صاحب تھے عطا محمد شعلہ اور چوتھے

میں۔ شاہد احمد دہلوی صاحب سے ان کی ملاقات تو تھی لیکن اس کو دوستی نہیں کہا جا سکتا۔ ان سے تو صرف کچھ ادارتی نوعیت کے تعلقات تھے۔ عسکری صاحب خود ان دوستوں کے پاس جاتے تھے، ان کے پاس بیٹھتے تھے، باتیں کرتے تھے، لطیفے سُناتے تھے، لیکن ان کی باتیں زیادہ سُنتے تھے، خود کم بولتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ سوائے میرے انہوں نے اپنا مکان کسی کو نہیں دکھایا۔

ایک دن شام کو میرے پاس آئے اور کہنے لگے، "عبادت صاحب! آج آپ میرے ساتھ چلئے۔ میں آپ کو اپنے گھر لے چلوں گا۔ ذرا گپ ہوگی"۔ میں بڑی خوشی سے تیار ہوگیا۔ اجمیری دروازے سے نکل کر ہم لوگ رام لیلا گراؤنڈ سے ہوتے ہوئے ترکمان دروازے کے اندر پہنچے اور ایک گلی میں مڑے۔ اس میں ایک مکان تھا، جس کی دوسری منزل پر عسکری صاحب رہتے تھے۔ یہ مکان کیا تھا، ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک چارپائی کی جگہ تھی۔ اس کے آس پاس عسکری صاحب نے ایک دو کرسیاں اور ایک چھوٹی سی میز ڈال لی تھی۔ کمرے میں سامنے کی طرف ایک مچان سا تھا۔ اس پر عسکری صاحب نے کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ وہ مچان خاصا اونچا تھا۔ آسانی سے کتابیں نہیں اتاری جا سکتی تھیں۔ لیکن اس کے قریب ہی دیوار سے لگا ہوا ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی کا جھلنگا رکھا ہوا تھا۔ اس جھلنگے کی موجودگی اس کمرے میں مجھے عجیب سی معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں نے عسکری صاحب سے پوچھا کہ "اس کا کیا مقصد ہے"؟

وہ کہنے لگے۔ "اس کے سہارے مچان پر چڑھ جاتے ہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے کتابیں نیچے اتار لیتے ہیں"۔

اس پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی، میں نے کچھ نہ کہا، اور دیر تک عسکری صاحب کے اس معصومانہ اور قلندرانہ انداز سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

اس مکان میں دو کھڑکیاں تھیں جو سامنے کی طرف ایک چھوٹے سے صحن میں کھلتی تھیں۔ گرمیوں میں ان کھڑکیوں کا کھلا رہنا ضروری تھا۔ کیونکہ پنکھے وغیرہ کی علّت عسکری صاحب نے نہیں پالی تھی۔

میں نے پوچھا "آپ کو گرمی تو ضرور لگتی ہوگی، ایک پنکھا رکھ لیجئے۔"

کہنے لگے "پنکھے سے طبیعت پر خراب اثر ہوتا ہے۔ دھیان بھی بٹتا ہے۔ اس لئے میں پنکھے کا قائل نہیں۔ کھڑکیاں کھلی رکھتا ہوں۔ لیکن ایک دِقّت یہ ہے کہ صاحب! سامنے کچھ لڑکیاں رہتی ہیں، وہ ہڈیاں وغیرہ اس طرح پھینکتی ہیں کہ کمرے میں آکر گرتی ہیں مجھے بہت ستاتی ہیں۔ شاید کسی کالج یا اسکول کی لڑکیاں ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ میں یہاں رہتا ہوں۔ بس مجھے پریشان کرتی رہتی ہیں لیکن میں کیا کرسکتا ہوں۔ کھڑکیوں کو بند بھی نہیں کرسکتا۔ ان کے والدین سے شکایت بھی نہیں کرسکتا۔ عجب اُلجھن ہے۔"

مجھے شرارت سوجھی۔ چنانچہ میں نے کہا "عسکری صاحب! مصحفی کا یہ شعر پڑھا کیجیئے۔"

اے مُصحفی تو ان سے محبت نہ کیجیو!
ہوتی بڑی غضب کی ہیں یہ دلّی والیاں

ذرا زور سے ترنّم کے ساتھ یہ شعر پڑھیں گے تو یہ سلسلہ بند ہو جائے گا۔ تجربہ کرکے دیکھیئے۔"

عسکری صاحب یہ سُن کر مُسکرائے۔ لیکن کچھ بولے نہیں۔
اور مجھے ان کے اس انداز پر بہت ہی پیار آیا۔

اس چھوٹے سے کمرے میں عسکری صاحب دن بھر پڑھتے لکھتے تھے۔ صرف ایک دو گھنٹے کے لئے کالج جاتے تھے۔ پھر واپس آجاتے تھے اور پھر شام تک کام کرتے رہتے تھے۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ ان کا محبوب مشغلہ اس زمانے میں لطیفے بنانا تھا۔ ہر روز وہ چند لطیفے بناتے تھے، اور پھر ان کو لے کر باہر نکلتے تھے۔ سب سے پہلے رات کو اینگلو عربک کالج ہوسٹل میں آکر یہ لطیفے مجھے سناتے تھے، اور پھر غلام عباس کے ہاں منٹو روڈ پر چلے جاتے تھے۔ وہاں سے کوئی بارہ بجے کے قریب ان کی واپسی ہوتی تھی اور وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں واپس آکر کچھ دیر پڑھنے لکھنے کے بعد سو جاتے تھے۔

یہ لطیفے عسکری صاحب کی ذہانت کے آئینہ دار ہوتے تھے اور ان لطیفوں کو سنا کر انہیں ایک تسکین سی ہو جاتی تھی۔ ان میں بعض لطیفے مجھے ابھی تک یاد ہیں لیکن افسوس ہے کہ میں انہیں یہاں لکھ نہیں سکتا۔

عسکری صاحب کے تخلیقی مزاج کا ایک یہ پہلو بھی تھا۔ ان کی ذہانت اس زمانے میں اس طرح کی نہ جانے کتنی ہی صورتوں میں اپنے آپ کو نمایاں کرتی تھی۔

اس طرح دن گزرتے رہے اور ۱۹۴۷ء آگیا۔ اگست کے مہینے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے قبل ہی وسیع پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ پہلے امرتسر میں ہنگامہ ہوا۔ پھر یوپی کے مغربی اضلاع میں فسادات کی آگ پھیل گئی اور بالآخر دلّی بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔

کالج بند ہو گئے اور علمی و تعلیمی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔

عسکری صاحب اگست کے آخر میں میرٹھ چلے گئے اور ہم لوگ رفیوجی ہونے اور اپنی اپنی جانیں بچانے کی غرض سے پُرانے قلعے میں پناہ لینے کے لئے دِلّی میں رہ گئے۔

ستمبر کے آخر میں جب اس آگ اور خون کے دریا کو تیر کر میں کسی طرح لکھنؤ پہنچا تو وہاں ریڈیو سے یہ خبر ملی کہ عسکری صاحب کسی فوجی سپیشل میں بیٹھ کر لاہور پہنچ گئے ہیں۔ اور اب اسی شہر نگاراں میں ان کا قیام ہے۔

لاہور سے انہوں نے میری خیریت معلوم کرنے کے لئے لکھنؤ خط لکھے۔ اور ان خطوں میں اپنے لاہور پہنچنے کی تفصیل بھی لکھی جس کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان بن گیا ہے۔ مسلمانوں کو ایک نئی مملکت مل گئی ہے۔ یہ تاریخ کا بہت ہی اہم واقعہ ہے۔ ہندوستان کے تمام مُسلمانوں کا فرض ہے کہ اس کو مضبوط بنائیں۔ اس لئے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پاکستان آکر اس کو مضبوط بنانا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

عسکری صاحب کے ان مشوروں پر بے شمار مُسلمانوں نے عمل کیا۔ اور بالآخر میں بھی پاکستان آ گیا۔ عسکری صاحب میرے آنے سے بہت خوش ہوئے۔

لاہور میں آکر عسکری صاحب نے پاکستانی ادب کا تصوّر پیش کیا، اسلامی ادب کی تحریک چلائی، اور ناصر کاظمی کو دریافت کیا۔

ان کے خیال میں ناصر کاظمی پہلا پاکستانی شاعر تھا جس نے اپنے اشعار میں قیام پاکستان کے وقت ہونے والی سازشوں کے نتیجے میں جو بُرا وقت مُسلمانوں کو دیکھنا پڑا، اس کے تمام پہلوؤں کو اپنی شاعری میں مجسم کر دیا۔ ان کے خیال میں پاکستان اور پاکستانی کلچر کی روح اس کی شاعری میں ہر جگہ اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔

اور ناصر کاظمی عسکری صاحب کی ان باتوں سے بہت جلد مشہور ہوگیا۔ اور واقعی ایک پاکستانی شاعر کی حیثیت سے اسے مشہور ہونا ہی چاہیئے تھا۔

یہ سب عسکری صاحب کی تنقیدی بصیرت کی کارفرمائی تھی۔

منٹو صاحب بھی اس زمانے میں بمبئی سے لاہور آگئے تھے۔ اور عسکری صاحب سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ چنانچہ ان دونوں نے مل کر اس زمانے میں "اُردو ادب" نکالا جس میں اعلیٰ پائے کے ادبی مضامین اور افسانے شائع ہوتے۔ عسکری صاحب منٹو کی ادبی اہمیت کے قائل تھے، اور انہیں ایک بڑا افسانہ نگار سمجھتے تھے۔ ادب ان کے اس ملاپ اور دوستی کی بنیاد تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ منٹو صاحب اور عسکری صاحب کی راہیں زندگی اور ادب دونوں میں جُدا جُدا تھیں۔ عسکری صاحب بنیادی طور پر ایک ادبی آدمی تھے۔ چنانچہ ادب اکثر ان کی دوستی کی بُنیاد بن جاتا تھا۔ ادب میں جوہر قابل کو عسکری صاحب کی نگاہیں دیکھ لیتی تھیں اور اس جوہر قابل سے کام لینا انہیں خوب آتا تھا۔

کچھ عرصے بعد عسکری صاحب کو ملازمت کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا۔ لیکن لاہور سے انہوں نے اپنا رشتہ توڑا نہیں۔ وہ رہتے تو کراچی میں تھے لیکن ان کا ذہنی رابطہ اسی شہر غزالاں کے ساتھ تھا۔ چنانچہ سال میں دو تین بار طویل تعطیلات میں لاہور آکر قیام کرتے تھے۔

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ لاہور ایک ادبی مرکز تھا۔ اور یہاں کے ادبی ماحول سے وہ گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ لاہور میں میرے ساتھ اکثر عسکری صاحب کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔

عسکری صاحب شروع شروع میں لاہور آکر کرشن نگر میں ارجن روڈ پر ٹھہرتے تھے۔ میں اس مکان میں بارہا ان سے ملنے گیا۔ میرا خیال تھا یہ مکان عسکری اور ان کے بھائیوں نے اپنے نام الاٹ کروالیا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کرائے پر تھا۔ چنانچہ جب سمن آباد کی آبادی بن گئی تو عسکری صاحب کے بھائی اسی سڑک پر ایک مکان میں منتقل ہو گئے جہاں میرا قیام تھا۔ میرے مکان اور اس مکان میں کوئی سو دو سو گز کا فاصلہ ہوگا۔ اس لئے عسکری صاحب جب بھی کراچی سے لاہور آئے تو ان کا زیادہ وقت میرے ساتھ ہی گزرتا۔

صبح کی سیر کے بعد وہ سیدھے میرے پاس آتے، ہم لوگ ایک ساتھ ناشتہ کرتے، چائے پیتے اور گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔

برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔

اس زمانے میں عسکری صاحب میں غضب کا تحمل تھا۔ کچھ ہوتا رہے، کوئی کچھ کہتا رہے، وہ بولتے نہیں تھے۔ ایک چپ سو کو ہرائے۔ یہ ان کا مسلک تھا۔ باتیں تو دوسرے کرتے تھے، عسکری صاحب تو صرف سنتے تھے۔ کبھی ایک آدھ فقرہ کہہ دیا تو کہہ دیا، ورنہ خاموشی ہی ان کی گفتگو تھی۔

ایک دن تو میں نے اس خاموشی اور تحمل کا کمال دیکھا۔

میاں ام اسلم سے ہم لوگوں کے پرانے تعلقات تھے، اور وہ ہم سے بہت اچھی طرح ملتے اور بڑی خاطر مدارت کرتے تھے، ایک دن ہم لوگوں نے یہ طے کیا کہ ذرا میاں صاحب سے ملنا چاہیئے اور ان کے ساتھ کچھ وقت گذارنا چاہیئے۔

میں نے عسکری صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ میاں صاحب کے

ہاں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ ایک شام میں، عسکری صاحب اور انتظار حسین میاں اسلم کے ہاں بارود خانے پہنچے۔ میاں صاحب نے بڑی خاطر کی۔ قسم قسم کے کھانوں کا اہتمام کیا۔ بڑی محبت سے کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔

فسادات کے بارے میں میاں صاحب کا ناول "رقص ابلیس" شائع ہو چکا تھا اور عسکری صاحب اس پر مقدمہ لکھ چکے تھے۔

میں نے رسماً میاں صاحب کے اس ناول کی تعریف کی اور عسکری صاحب کے مقدمے کو بھی سراہا۔

میاں صاحب کچھ دیر تو خاموشی سے میری باتیں سُنتے رہے۔ لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ پھٹ پڑے اور عسکری صاحب کے بارے میں شکوہ وشکایت کا ایک دفتر کھول دیا۔

کہنے لگے، "صاحب! دیکھئے عسکری صاحب میری بھائی ہیں۔ انہوں نے رقص ابلیس کا دیباچہ تو لکھا لیکن اس قدر مقبولیت حاصل کرنے والے ناول پر کہیں تبصرہ نہیں کیا۔ حالانکہ یہ مختلف موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ہزارہا صفحے لکھے ہیں لیکن مجھے اور میرے ناول کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ کم ازکم میرے مسلمان ہونے کا تو خیال کیا ہوتا۔"

غرض میاں صاحب کئی گھنٹے تک اسی قسم کی باتیں کرتے رہے لیکن عسکری صاحب کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ بس سُنتے رہے، سُنتے رہے، سُنتے رہے۔

میں تو تھک گیا، اس لئے کئی گھنٹے کی اس آزمائش کے بعد میں یکایک اُٹھا۔ میاں صاحب سے اجازت لی، اور ہم لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

میاں صاحب نے یہ کہہ کر ہمیں رخصت کیا کہ "عسکری صاحب میری باتوں کا ضرور اثر قبول کریں گے۔

عسکری صاحب اس پر بھی خاموش رہے۔

میں نے ایسا کم گو خاموش اور متحمل مزاج آدمی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ عسکری صاحب ساری زندگی مجمعوں سے گھبراتے اور محفلوں سے کتراتے رہے۔ وہ ادیب تھے لیکن ادبی جلسوں میں کبھی نہیں گئے۔ وہ استاد تھے لیکن زیادہ طالب علموں سے کبھی بے تکلف نہیں ہوتے۔ بے شمار لوگ ان کے شیدائی تھے۔ لیکن وہ ان سے ملتے ہوئے اور ان سے باتیں کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ وہ تو اپنے صرف چند مخصوص دوستوں سے بات کر سکتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوں، اور اگر کہیں سے کوئی اجنبی ٹپک پڑے تو ان کی زبان میں تالے لگ جاتے تھے اور ان پر ایک بے چینی اور پریشانی کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔

مجمعے سے گھبرانے کا ایک واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔

آج سے کوئی پندرہ بیس سال ادھر کی بات ہے، عسکری صاحب گرمیوں کی تعطیلات میں کراچی سے لاہور آتے ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں عید آگئی۔

میں نے ایک دن پہلے عسکری صاحب سے کہا کہ "عید کی نماز ایک ساتھ پڑھنے چلیں گے۔"

عسکری صاحب تیار ہو گئے۔ وعدہ کر لیا کہ نماز کے وقت سے چند منٹ پہلے ہی میرے ہاں پہنچیں گے اور پھر سمن آباد کی گراؤنڈ میں نماز ادا کریں گے۔

چنانچہ عسکری صاحب عید کے دن صبح صبح وقت پر آئے۔ اور ہم سب مل کر عید کی نماز ادا کرنے کے لئے گراؤنڈ کی طرف چلے۔

لیکن ابھی ہم برگد کے درخت تک پہنچے تھے کہ عسکری صاحب کو نہ جانے کیا ہوا ؟ اور ان کے اندر نہ جانے کیسی لہر اُٹھی کہ انہوں نے یہ کہہ کر ہمارا ساتھ چھوڑ دیا کہ "عبادت صاحب ! میں تو گھر چلا۔ اتنے بڑے مجمع کو میں کیسے برداشت کروں گا۔"

اور یہ کہہ کر وہ واپس لوٹ گئے، نماز رہ گئی۔

اور میں حیران رہ گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ان پر مذہب کا اثر اتنا گہرا نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی یہ بات مجھے ایسی کچھ عجیب نہیں معلوم ہوئی۔ ورنہ آگے چل کر تو ایک زمانہ ان کی زندگی بھی ایسا بھی آیا جب وہ ہر نماز باجماعت پڑھتے تھے۔ لیکن لوگوں سے زیادہ ملنا جُلنا، ان سے بے تکلف اور باتیں کرنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔

وہ تو ذوقِ تنہائی کے پرستار تھے۔ اس لئے میں ان کے سامنے دل ہی دل میں میر حسن کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا ؎

ذوقِ تنہائی میں خلل ڈالا   آکے مجھ پاس اک گھڑی تو نے

عسکری صاحب کے ملنے والوں کا حلقہ بہت محدود تھا۔ وہ صرف چند لوگوں کی صحبت میں بیٹھ سکتے تھے اور صرف انہیں سے باتیں کر سکتے تھے۔ نئے دوست بنانے کا گُر انہیں ضرور آتا تھا۔ چنانچہ وہ بعض نوجوانوں تک کو اپنی محفلوں میں بلانے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ جوہر قابل کو تلاش کرنا انہیں خوب آتا تھا، اور وہ ایسے لوگوں کو دوست بنانے کا بڑا

سلیقہ رکھتے تھے جن میں انہیں کوئی چنگاری نظر آتی تھی۔ ایسے لوگوں کا انتخاب وہ ادیبوں اور شاگردوں میں سے کر لیتے تھے۔

اور ایسے لوگوں سے ان کی دوستی پختہ ہو جاتی تھی۔

عسکری صاحب ایک عظیم استاد تھے۔ انہوں نے ساری زندگی اس عظیم اور مؤقر پیشے کے لئے وقف کر دی۔

ان کی شفقت اور محبت طالب علموں کو گرویدہ بنا لیتی تھی۔ وہ طالب علموں کی مدد مختلف طریقوں سے کرتے تھے۔ کوئی بھی طالب علم ان کے پاس کسی وقت بھی جا سکتا تھا۔ اور نہ صرف اپنے کالج کے طالب علم بلکہ دوسرے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم بھی عسکری صاحب سے استفادہ کرتے تھے۔ ان کے بعض شاگرد تو ایسے تھے کہ وہ داخلہ تو لیتے تھے یونیورسٹی میں لیکن پڑھنے کے لئے آتے تھے عسکری صاحب کے پاس۔ اگر میں یہ کہوں کہ عسکری صاحب نے سینکڑوں طالب علموں کو ایم۔ اے کروا دیا۔ بیسیوں کو پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دلوا دیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔

عسکری صاحب کے ایسے استاد آج کل خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

علم و ادب عسکری صاحب کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اُن کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا تھا۔ اور وہ بڑی محنت سے ایک سچے اور صحیح طالب کی طرح پڑھتے تھے اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ انگریزی ادب کے بارے میں ان کی معلومات اتنی تھی کہ شاید ہی انگریزی کے کسی پروفیسر کو اتنی معلومات ہو۔ پھر یورپ کی مختلف علمی اور ادبی تحریکوں سے جتنے وہ واقف تھے شاید ہی ہمارے ہاں کسی کو اس کا عشر عشیر بھی معلوم ہو۔

اور ساتھ ہی وہ مشرقی علوم، اور مشرقی ادبیات سے اپنے آپ

پوری طرح آگاہ رکھتے تھے، فارسی اور اُردو کے کلاسیکی اور جدید دونوں ادبیات کا مطالعہ انہوں نے بڑی محنت سے کیا تھا اور وہ ان کے مختلف پہلوؤں پر حاوی تھے۔

عسکری صاحب کے سپرد کوئی علمی کام کر دیا جائے تو وہ اس کو انتہا تک پہنچا دیتے تھے، بس اس میں ڈوب جاتے تھے۔

لندن سے لاہور واپس آکر میں نے زبان اور لسانیات کے موضوع پر ایک کتاب چھاپنے کا منصوبہ بنایا تاکہ اس پس منظر میں اُردو زبان کا مطالعہ کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں عسکری صاحب سے بھی مشورہ کیا۔ وہ کئی سال تک اس مجموعے کے لئے مضامین لکھوانے کی کوشش کرتے رہے۔ اور خاصی تعداد میں نہ صرف ہندوستان اور پاکستان کے لکھنے والوں بلکہ فرانسیسی انگریز اور جرمن لکھنے والوں سے بھی مضامین لکھوائے ان مضامین کو میں نے اورینٹل کالج میگزین میں شائع کیا اور ان کو علمی دنیا میں بہت پسند کیا گیا۔

شام کو کتابوں کی دوکان میں جانا اور کتابوں کا تلاش کرنا عسکری صاحب کا معمول تھا۔ علم کی پیاس انہیں کشاں کشاں ان دوکانوں میں لے جاتی تھی اور وہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ میرے لئے بھی کتابیں خریدتے تھے۔ برسوں تک ان کا یہ معمول رہا کہ وہ ٹامس اینڈ ٹامس سے میرے لئے ادبی کتابیں منتخب کر کے لاہور بھجواتے تھے۔

اور یہ عسکری صاحب کی اس عنایت کا نتیجہ ہے کہ اس وقت اورینٹل کالج میں ادبی اور تنقیدی کتابوں کا بہترین انتخاب موجود ہے۔

ادھر چند سال سے عسکری صاحب ایک اور ہی عالم میں تھے۔ مذہب کا اثر ان پر بہت گہرا ہو گیا تھا اور روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ادیب کی حیثیت

سے بھی ان کی دلچسپی صرف دینی ادب تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے کلام پاک کا غور سے مطالعہ کیا تھا اور بار بار کیا تھا۔ تصوف سے ان کی دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی۔ اور انہوں نے نہ صرف اسلامی تصوف کے علم برداروں کا مطالعہ غور سے کیا تھا بلکہ مغربی صوفیا اور ان کے فکر و فلسفہ کو بھی قریب سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ فرانس میں اس وقت اسلام اور اسلامی تصوّف اور فلسفے پر جو کام ہو رہا ہے، اس سے وہ بہت متاثر تھے۔ اپنی فرانسیسی پر انہوں نے اس مقصد سے جلا کی تھی۔ اور وہ فرانسیسی جو انہوں نے بغیر کسی استاد کے پڑھی تھی، وہ اس میں مضامین تک لکھنے لگے تھے۔ ان مضامین کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ معیاری فرانسیسی رسالوں میں شائع ہوتے تھے اور اسلامی دنیا میں ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ مغرب میں بھی ان کا چرچا تھا۔

یہ سب دین داری کا فیض تھا جو عسکری صاحب کو علمی دنیا میں ایسی بلندی نصیب ہوئی۔ دین اور مذہب سے عسکری صاحب کی یہ دلچسپی بڑے خلوص پر مبنی تھی۔ تقریباً پندرہ سولہ سال ان کی زندگی میں ایسے ضرور گزرے ہیں جب انہوں نے اپنا زیادہ وقت عبادت اور ریاضت میں گذارا ہے اور اوراد وظائف میں اپنی زندگی کی راتیں بسر کی ہیں۔ لیکن ان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اپنے ان معمولات کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ لوگوں کو اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ چپکے سے اُٹھ جاتے تھے۔ کوئی بیٹھا ہو تو کوئی کتاب یا رسالہ ہاتھ میں تھما دیتے تھے، اور یہ کہہ کر چل دیتے تھے کہ "بس ابھی آیا۔"

وہ خدا جانے کیوں دینی معاملات کے علمی پہلو پر مجھ سے کبھی بات نہیں کرتے تھے۔ کبھی کوئی بات موضوعِ گفتگو بن بھی جاتا تھا تو وہ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتے تھے، اور اس راستے سے ہٹ جاتے تھے۔ ایک وجہ تو اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ مجھے ان کے ماضی کا علم تھا۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے نئے رجحان کے بارے میں مجھ سے باتیں کریں۔ البتہ فوٹوگرافی، موسیقی، مُصوّری اور ادب پر ان سے خوب باتیں ہوتی تھیں۔ وہ بولتے کم تھے لیکن کم لفظوں اور اشاروں کنایوں میں بڑی ہی بلاغت سے ان موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "مولانا اشرف علی تھانوی کی کتابیں پڑھا کیجئے اور رسالہ "الحق" کا مطالعہ جاری رکھئے، آپ کو انشا پردازی کے اعلیٰ نمونوں سے آشنا ہونے کا موقع ملے گا۔"

میں چُپ چاپ سُنتا رہا۔

مجھے اس عالم میں دیکھا تو کہنے لگے "ذرا یوں ہی بیٹھے رہیئے۔ میں آپ کی ایک تصویر کھینچوں گا۔"

یہ کہہ کر اُس کمرے کا بٹن دبایا جو اُس زمانے میں ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا۔ تصویریں وہ اسی طرح کھینچتے تھے، اور خوب کھینچتے تھے۔

عسکری صاحب کی زندگی بڑی ہی پاک صاف تھی۔ ان کی دین داری نے اسے اور بھی مُصفا اور مجلاّ کر دیا تھا۔ اور گذشتہ چند سال میں تو میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے اندر ایک رُوحانیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اتنے ڈوب گئے تھے کہ ان میں جذب و کشش کی خصوصیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور بعض اوقات تو کشف کا سا عالم ان پر طاری ہو جاتا تھا۔

ایک واقعہ میں کبھی بھول نہیں سکتا۔

دو تین سال ادھر کی بات ہے میں موسم گرما کی تعطیلات میں چند روز کے لئے کراچی گیا تھا۔ تقریباً ہر دوسرے روز عسکری صاحب سے ملاقات ہوتی تھی، میں ان کے ہاں ضرور جایا کرتا تھا۔ لیکن چار پانچ دن ایسے آئے کہ میں عسکری صاحب کی طرف نہ جاسکا۔ ایک دن میں چار بجے کے قریب سہ پہر کو آرام کر کے اُٹھا۔ اس شام مجھے کسی دعوت میں جانا تھا۔ لیکن میں نے گھر والوں سے یہ کہہ کر معذرت کی کہ میں آج عسکری صاحب کی طرف ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ میں باہر نکلا اور سواری لے کر کشمیر روڈ کی طرف چل دیا۔ اور ٹھیک پانچ بجے وہاں پہنچ گیا۔ گھنٹی بجائی، عسکری صاحب باہر نکلے۔ کہنے لگے مجھے معلوم تھا کہ آج آپ پانچ بجے ضرور آئیں گے۔ میں آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔"

میں نے کہا "اس وقت تو میں ایک پروگرام کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ یہاں پہنچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔"

عسکری صاحب کہنے لگے، "مجھے یقین تھا کہ آپ ٹھیک پانچ بجے یہاں پہنچیں گے۔" اور آپ یہاں پہنچ گئے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال بغیر کسی روحانیت، جذب و کشش اور کشف کی کیفیت کے پیدا نہیں ہو سکتی۔

بظاہر عسکری صاحب زندگی سے دُور بھاگتے ہوئے نظر آتے تھے اور ہر چیز سے بیزار دکھائی دیتے تھے۔ لیکن جن لوگوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ انہیں زندگی سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ فنون لطیفہ کے شیدائی تھے۔ زندگی کو اچھی طرح بسر کرنا جانتے تھے۔ محفلیں

بھی سجا لیتے تھے۔ گپ بھی کرتے تھے۔ پہاڑوں اور میدانوں میں سیر کے لئے بھی نکل جاتے تھے۔ عزیزوں اور دوستوں کی صحبتوں سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔ شوق سے پان کھاتے تھے۔ سگریٹ بھی مزے لے لے کر پیتے تھے۔ اچھی چائے سے بھی حظ حاصل کرتے تھے۔ مزے دار کھانے بھی شوق سے کھاتے تھے۔ لباس بھی اچھی طرح پہنتے تھے۔ لیکن اعتدال اور وضعداری کے رنگ ان کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں میں نمایاں رہتے تھے۔

اس لئے ان کو آدم بیزار اور زندگی سے فرار کا علمبردار نہیں کہا جاسکتا۔

یہ صحیح ہے کہ عسکری صاحب نے شادی نہیں کی۔ گھر نہیں بسایا۔ دنیا کے جھگڑوں میں نہیں پھنسے۔ وہ ایک آزاد آدمی تھے اور آزاد رہنا چاہتے تھے، کسی قسم کی پابندیاں، چاہے وہ کسی نوعیت کی ہوں، ان کی برداشت سے باہر تھیں۔ وہ تو صرف ایک پابندی کے قائل تھے اور وہ مطالعہ تھا۔ انہوں نے تو علم و ادب سے شادی کی تھی۔ وہ تو صرف لکھنے پڑھنے کے پابند تھے۔ ویسے وہ اپنے متعلقین کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے ساری زندگی اپنی والدہ اور اپنے بھائیوں اور بہنوں کی خدمت کی۔ ان کو صحیح راستوں پر ڈالا اور ان کی زندگیاں بنائیں۔ یہ اتنے اہم کام تھے کہ انہیں کبھی گھر بنانے اور بسانے کا خیال تک نہیں آیا اور ان کی زندگی ایک اعتبار سے بہ یک وقت ایک المیہ بھی تھی اور ایک طربیہ بھی!

ایک زمانے میں عسکری صاحب کو فوٹوگرافی سے بڑی دلچسپی تھی۔

انہوں نے ایک اعلیٰ درجے کا کیمرہ خرید لیا تھا۔ اس کیمرے کو وہ بے تکلفی سے گلے میں ڈالے پھرتے تھے اور اپنے شوق اور دلچسپی کی تصویریں کھینچتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس زمانے میں مناظر کی، دوستوں اور عزیزوں ادیبوں اور شاعروں کی زندگی سے بھرپور بے شمار ایسی تصویریں کھینچیں جو منہ سے بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

ایک دن انہوں نے اپنی کھینچی ہوئی بہت سی تصویریں مجھے دکھائیں اور کہنے لگے۔ "میں کسی وقت آپ کی بھی کچھ تصویریں کھینچنا چاہتا ہوں۔"

چنانچہ ایک روز کیمرہ لے کر آ گئے۔ کہنے لگے "میں آج آپ کی تصویریں کھینچنے آیا ہوں۔ بس آپ جس طرح بیٹھے ہیں بیٹھے رہئے، جو کچھ کر رہے ہیں کرتے رہیئے۔ کیمرے کی طرف بالکل نہ دیکھئے، میری موجودگی کو بھی محسوس نہ کیجئے۔ تصویر تو اسی طرح صحیح آتے گی۔"

میں خاموش بیٹھا رہا اور وہ تصویریں کھینچتے رہے اور اس طرح پوری ایک فلم ختم کر دی۔

چند روز بعد تصویریں لے کر آئے۔ وہ تصویریں واقعی فوٹوگرافی کا شاہکار تھیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ عسکری صاحب فنون لطیفہ کے شیدائی تھے۔ فوٹوگرافی سے ان کی یہ دلچسپی بھی فنون لطیفہ اور ان کی انسانی بنیادوں سے دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے۔

چند سال ہوئے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ عسکری صاحب کو موسیقی اور خصوصاً کلاسیکی موسیقی سے بھی گہری دلچسپی ہے۔

ایک دن میں کراچی میں ان کے کشمیر روڈ والے چھوٹے سے فلیٹ میں ملنے کے لئے پہنچا تو باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھنے لگے، آپ کو

موسیقی سے بھی کچھ دلچسپی ہے"؟
میں نے کہا "بس سن لیتا ہوں۔
کہنے لگے "کلاسیکی موسیقی سے دلچسپی لینی چاہیئے۔ اس سے رُوحانی سکون ملتا ہے یہ مسلمانوں کے تخلیقی مزاج کی صحیح عکاسی کرتی ہے"۔
پھر وہ دیر تک بڑے بڑے اُستادوں کا ذکر کرتے رہے۔ تھوڑی دیر میں ایک اُستاد وہاں آ بھی گئے۔ نہایت ہی نستعلیق آدمی تھے مشرقی تہذیب کا نمونہ کہے جا سکتے تھے۔ ان کا تعارف کرایا۔ اور دیر تک ان سے موسیقی کے موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ چیزیں انھوں نے سُنائیں بھی۔ اور عسکری صاحب ان کو سُن کر جھومتے اور داد دیتے رہے۔
چند سال ہوئے عسکری صاحب لاہور آئے تو ان کے ساتھ بڑے بڑے اساتذہ کے کچھ ریکارڈ بھی تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھے یہ ریکارڈ سنائے۔ ان میں موسیقی کے نمونوں کے ساتھ ساتھ مختلف راگوں اور سروں کی تفصیل بھی تھی جس کو موسیقاروں نے خود پیش کیا تھا۔
کلاسیکی موسیقی کے ریکارڈوں کا ایسا اچھا انتخاب شاید ہی کسی کے پاس ہو۔
دراصل بات یہ ہے کہ عسکری صاحب ایک تہذیب کے آدمی تھے۔ تہذیب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اس تہذیب کو انھوں نے اپنے اندر اس طرح جذب کر لیا تھا کہ وہ اس کا مجسّمہ معلوم ہوتے تھے۔
اس کا اظہار ان کے افعال، اقوال اور افکار و خیالات میں ہوتا تھا۔ ان کی تخلیقی کاوشیں، ان کے افسانے اور تنقیدی مضامین اور دینی مقالات ان کے اسی تہذیبی میلان کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اور نثر لکھنے

کا جو انداز انہوں نے پیدا کیا ہے اس میں بھی اس تہذیب کی رُوح مختلف زاویوں سے اپنی جھلکیاں دکھاتی ہے۔

حیرت تو اس بات پر ہے کہ مغربی تہذیب اور مغربی ادبیات کے اتنے بڑے مزاج داں ہونے کے باوجود وہ اپنی تہذیب کے پرستار تھے اور خالص مشرقی طرز پر زندگی بسر کرتے تھے۔

عسکری صاحب بڑی محبت کے آدمی تھے، جس سے ملتے تھے محبت اور خلوص کے ساتھ ملتے تھے۔ مجھ پر تو ان کی خاص نظر اخلاص تھی۔ میرے لئے ہمیشہ دُعا کرتے تھے۔ میری بہتری کی تدبیریں سوچتے تھے۔ اکثر یہ کہتے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ میں تو آپ کو انتہائی بلندیوں پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری کتابوں کی ضرورت سے زیادہ تعریف کر دیتے تھے۔ ہر ہفتے مجھے خط ضرور لکھتے تھے، اور ان خطوں میں دنیا جہاں کی باتیں ہوتی تھیں۔ لیکن تان یہیں پر جا کر ٹوٹتی تھی کہ میں آپ کے لئے دُعا کرتا رہتا ہوں۔ اللہ تعالےٰ آپ کو خیریت سے رکھے!

شاید اس وجہ سے کہ انہیں اس بات کا علم تھا کہ میرے آس پاس بعض ایسے لوگ موجود ہیں جن کا کام صرف فساد پھیلانا ہے اور جو صرف شر کے سہارے زندہ ہیں۔

عسکری صاحب ہم سے اچانک رُخصت ہو گئے۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح ہم سے چُپ چُپاتے رُخصت ہو جائیں گے کہ کالج جاتے ہوئے سڑک پر گریں گے۔ طالب علم انہیں ایک ٹیکسی میں ڈال کر ان کے کشمیر روڈ والے چھوٹے سے فلیٹ میں لے جائیں گے، وہاں پہنچ کر وہ ٹیکسی کا کرایہ ادا کریں گے۔ لیکن سیڑھیاں

چڑھ کر جب اوپر اپنے کمرے میں پہنچیں گے تو ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہوگی۔

ان کی موت میرے لئے صرف ایک مفکر، ادیب اور انشاء پرداز ہی کی موت نہیں ہے ایک عظیم انسان، ایک مخلص دوست، ایک ہمدرد اور ایک بہی خواہ کی موت بھی ہے۔

عسکری صاحب میرے لئے تو خلاء ہی خلاء چھوڑ گئے ہیں۔ اب میں ہر لمحہ یہ سوچتا ہوں کہ عسکری صاحب تو رُخصت ہو گئے۔ اب مجھے ہر ہفتے خط کون لکھے گا۔ میرے لئے دُعائیں کون مانگے گا۔ مجھے تسلّی کون دے گا۔ غائبانہ میرا ذکر اپنی محفلوں میں کون کرے گا۔ کراچی کے کُتب فروشوں کی دوکانوں میں جاکر میرے لئے کتابوں کا انتخاب کون کرے گا۔ میری کتابوں کے فلیپ کون لکھے گا۔ اور میرے کاموں کی داد کون دے گا تو بس حدِ نظر تک مجھے خلا ہی خلا نظر آتا ہے اور اس مفارقت اور تنہائی کے شدید احساس کی وجہ سے ہر لمحہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کلیجہ مُنہ کو آرہا ہے۔

عبادت بریلوی

۱۷

لندن کی ڈائری

(جلد دوم)

"لندن کی ڈائری" کی دوسری جلد پیش خدمت ہے۔ پہلی جلد اس سے قبل گذشتہ سال شائع ہو چکی ہے۔

اِس میں لندن اور یورپ کے حالات کسی قدر تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف!

میں نے لندن میں چھ سات سال بہ حیثیت اُستاد لندن یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو پاکستان میں گذارے اور اس طرح مجھے یورپ کی سیاحت کرنے کا موقع بھی مِلا۔ صرف دو تین ممالک کو چھوڑ کر، تقریباً تمام ممالک میں سفر کرنے کے مواقع مجھے مِلے۔

یہ سفر مجھے بہت عزیز تھا، کیونکہ مجھے اس سفر میں ایسے ممالک کو دیکھنے کا بھی موقع ملا جو اس سے قبل مجھے دیکھنے کو نہیں ملے تھے۔ لوگوں کے رہن سہن کو دیکھنے کا موقع بھی ملا، اُن کے عادات واطوار کو بھی میں نے دیکھا۔

اس سفر کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے یہ سفر کمانڈر قاسم حسین صاحب کی نئی موٹر میں کیا۔ موٹر نئی ہونے کی وجہ سے بہت عمدہ تھی۔ اِس میں خوب گھوما، اور صحیح معنوں میں اس نئی موٹر نے مجھے بہت لُطف دیا۔

بہر حال جو سفر میں نے کیا اُس کی کچھ تفصیل اس کتاب میں موجود ہے۔

لاہور

۱۶ر فروری ۱۹۹۳ء

عبادت بریلوی

خطوطِ پروفیسر سیّد احتشام حُسین

پروفیسر سیّد احتشام حسین اُردو کے ممتاز نقاد تھے۔ اُنھوں نے تنقید پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات لکھے اور اس طرح اُردو تنقید میں گراں قدر اضافہ کیا۔

میں کئی سال تک لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں اُن کا شاگرد رہا اور اُنھوں نے میرے معاملات میں جو دلچسپی لی، وہ ان خطوط سے صاف ظاہر ہے۔ میرے لئے اُنھوں نے اپنے دوستوں کو چند خطوط

بھی لکھے جو اس مجموعے میں شامل کئے گئے ہیں۔

اس مجموعے میں ان کے ۸۵ خطوط شامل ہیں جو اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ اُنھیں اپنے شاگردوں سے کتنی دلچسپی تھی، اور وہ اُن کے معاملات کو سُلجھانے میں کس درجہ دلچسپی لیتے تھے۔

احتشام صاحب اُردو کے ایک گراں قدر لکھنے والے تھے۔ اُنہوں نے اپنی تحریروں سے اُردو تنقید میں گراں قدر اضافہ کیا۔ اُردو کے ایک نقّاد کی حیثیت سے اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اُنہوں نے اپنی اِن تنقیدی تحریروں کے کئی مجموعے مُرتّب کئے۔ یہ مجموعے نہ صرف اُن کے اپنے زمانے میں مقبول ہوئے بلکہ آج بھی تنقیدی کتابوں کی حیثیت سے اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

یہ مجموعے آج بھی قدر کی نگاہوں سے پڑھے جاتے ہیں، اور جب تک اُردو کا ایک طالب علم بھی موجود ہے، اِن مجموعوں میں شائع ہونے والے مضامین، اُردو زبان اور ادب کے طالب علموں کے لئے مُفید ثابت ہوں گے۔

پروفیسر سیّد احتشام حسین اُردو کے ممتاز نقّاد تھے۔ اُنہوں نے اپنے تنقیدی مضامین سے اُردو تنقید میں گراں بہا اضافے کئے ہیں۔ اُردو تنقید میں اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

اُن کے ذاتی خطوط بھی بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اِن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذہنی کیفیت کو بڑی خوبی سے، ان خطوط میں ظاہر کرتے ہیں، اور اُردو ادب کے طالب علموں کی بڑی خوبی سے رہنمائی کرتے ہیں۔ اِن کے خطوط کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔

میں کئی سال تک احتشام صاحب کا طالب علم رہا ہوں، اور میں نے اُن کے خطوں سے بھی اِستفادہ کیا ہے۔ اِن میں ادب اور تنقید کی باتیں اور ایک اُستاد کی حیثیت سے اُن کے مفید مشورے بھی شامل ہیں۔ اسی خیال سے میں نے اِن خطوط کو مُرتب کیا، اور اب یہ شائع کئے جاتے ہیں۔

عبادت بریلوی

لاہور

۲۱ دسمبر ۱۹۹۳ء

اُستادِ محترم پروفیسر سیّد احتشام حسین صاحب ایک عظیم انسان، ایک مخلص دوست، ایک بہت بڑے عالم، ایک منفرد دانش ور ایک بلند پایہ ادیب ایک اہم نقاد اور ایک نہایت ہی شفیق اُستاد تھے۔ اُنھوں نے اپنی ساری زندگی محبت اور خدمت کے کاروبار میں گذار دی۔ ہزارہا انسانوں اور خصوصاً طالب علموں کی آبیاری کی، اور انھیں ایک اچھا انسان، علم و دانش کا پرستار اور اعلےٰ و ارفع تہذیبی و ادبی اقدار کا پرستار بنایا۔ اس اعتبار سے وہ بلند مرتبے پر فائز نظر آتے ہیں۔ اُن کی دلنشیں و دلآویز شخصیت کی چاندنی آج بھی بے شمار انسانوں اور خصوصاً اُن کے شاگردوں کی زندگیوں میں چھٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُن کی حسین یاد اپنی تمام تر جمال آرائی و زیبائی سے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچی اور زندگی کو دامن باغباں اور کفِ گُل فروش بناتی ہے۔

احتشام صاحب عرصۂ دراز تک لکھنؤ یونیورسٹی اور الٰہ آباد یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاد رہے۔ میں جب ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔اے کے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوتو وہ اسی سال لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو

کے سینئر لیکچرار کی حیثیت سے آئے، اور پھر یہیں اُردو کے ریڈر، پروفیسر اور صدر شعبہ ہوئے۔ انتقال سے چند سال قبل وہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہو گئے تھے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے دورانِ قیام میں میں اُن سے بہت قریب رہا، اور اُن کی شفقت مجھ پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ اور یہ کہ وہ صحیح معنوں میں ایک شجر سایہ دار ہیں۔

میں اُس زمانے میں ایک معمولی سا طالب علم تھا لیکن احتشام صاحب نے علم وادب کے سبزہ زاروں میں ایسی سیر کرائی کہ میں چند سال میں علم و دانش کا پرستار اور ادب وفن کی زلفِ گرہ گیر کا گرفتار ہو گیا، اور مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوا جیسے وہ انگلی پکڑ کر مجھے علم وادب کے اِن باغوں، سبزہ زاروں اور گلستانوں کے جمالِ جہاں آرا سے آشنا کر رہے ہیں۔ وہ میرے اُستاد بھی تھے، اور رہبر ورہنما بھی! اُنہوں نے زندگی کے ان گنت حقائق کا شعور میرے اندر پیدا کیا۔ شفقت اور محبت کے آداب مجھے سکھائے۔ انسان دوستی، احترام آدمی، اعلٰے اخلاقی معیار اور ارفع تہذیبی اقدار کے خیالات سے میرے دل میں شمعیں سی فروزاں کیں۔ دیئے سے روشن کئے، اور میں اُن کی روشنی میں زندگی کی تاریک راہوں پر گام زن ہو کر اَن گنت ایسی منزلوں سے ہم کنار ہوا جو انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہیں۔

آج میں جو کچھ بھی ہوں وہ سب احتشام صاحب کی بدولت ہے۔ اُنہوں نے اپنے فکر وعمل سے مجھے زندگی کے صحیح معنی سمجھائے۔ محبت اور شفقت کے اسرار ورموز مجھ پر روشن کئے۔ خدمت کے رازہائے سربستہ سے مجھے آشنا کیا۔ ادب سے دلچسپی کے چراغ میرے دل میں روشن کئے، خدمت

کے رازہائے سربستہ سے مجھے آشنا کیا۔ ادب سے دلچسپی کے چراغ میرے دل میں روشن کیئے، اور علمی ادبی کام کرنے کی ایسی دھن اور لگن میرے اندر پیدا کی کہ میں نے اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ اختشام صاحب کے شاگرد ہونے کی دولتِ بیش بہا مجھے نصیب نہ ہوتی تو شاید میں آج علم وادب کا کوچہ گرد نہ ہوتا۔ بلکہ اپنے آبا و اجداد کی روش اختیار کرتا، جائیدادوں سے دلچسپی لیتا، مقدمے بازی کرتا، شکار کھیلتا، شطرنج چوسر اور دلچسپی سے دل بہلاتا کیونکہ سو پشت سے میرے آبا کا پیشہ سپہ گری تھا، اور وہ شجاعت کے اس کاروبار کے ساتھ ایسے ہی کاموں میں اپنا بقیہ وقت گذارتے تھے۔ احتشام صاحب نے میرے اندر ادب کا جو چسکا پیدا کیا، اُس نے میری دُنیا ہی بدل دی۔ یہ ادب ہی کا فیضان تھا کہ میں انسان کو مجبور، ماحول و وراثت کا اسیر، خطا کا پُتلا سمجھنے لگا، اور میرے اندر نفرت، انتقام اور بغض و کینہ کے جذبات سرد پڑنے لگے۔ عفو و درگذر کا خیال میرا شعار بن گیا، اور اس طرح انسانی زندگی کے ان گنت روپ میں مجھے خوبصورتی نظر آنے لگی۔

احتشام صاحب بڑی ہی جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔ سرو قد، گول چہرہ، کشادہ پیشانی، سُرخ سفید رنگ، دُبلے پتلے لیکن بھرا بھرا صحت مند جسم، جسم پر لکھنوی وضع قطع کی شیروانی، سر پر تعلقہ داران اودھ کی کشتی نُما ٹوپی، ہاتھوں میں ایک رجسٹر اور چند کتابیں، — بس اپنے اس مخصوص انداز سے وہ پہچانے جاتے تھے۔ اُن کی اس شخصیت ہی کا یہ اثر تھا کہ اُن کے بعض طالب علم بھی اسی احتشام صاحب کا مخصوص لباس پہننے لگے تھے۔ ویسے اس زمانے میں لکھنؤ کے شرفا کا یہی مخصوص

لباس تھا۔ اس لئے مسلمان طالب علموں کو احتشام صاحب کے مخصوص لباس کو اپنانے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔

یہ احتشام حسین صاحب یونیورسٹی میں ابھی نئے نئے آئے تھے۔ عمر بھی ایسی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ مشکل سے تیس بتیس سال کے تھے۔ طالب علموں کے ساتھ اچھی طرح ملتے جُلتے تھے۔ شفقت بھی اُن کے مزاج میں بہت تھی۔ اس لئے طالب علم انہیں گھیرے رہتے تھے۔ لیکچروں کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھتے تھے، تو ایسے طالب علم جن کو ادب کا چسکا تھا، اُن کے پاس آجاتے تھے، اور اُن سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے تھے۔ دوپہر کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ احتشام صاحب طالب علموں کو خاصا وقت دیتے تھے۔ اُن کی رہنمائی کرتے تھے مطالعے کے لئے اہم کتابوں اور مُصنّفوں کے نام بتاتے تھے۔ اہم ادبی تخلیقات کا تعارف اور تجزیہ بھی کرتے تھے۔ اس طرح طالب علموں کے علم میں اضافہ ہوتا تھا۔ اُن کے اندر صحیح ذوقِ ادب کی شمع بھی فروزاں ہو جاتی تھی اور وہ نہ صرف مطالعۂ ادب بلکہ تخلیقِ ادب کی طرف بھی مائل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ احتشام صاحب کی تربیت اور رہنمائی کی بدولت لکھنؤ یونیورسٹی میں شاعر، افسانہ نگار، اور نقاد پیدا ہونے لگے۔ غرض یہ کہ اُن کی موجودگی سے یونیورسٹی میں خاصا ادبی ماحول پیدا ہو گیا تھا۔

میں گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ سے انٹرمیڈیٹ پاس کر کے لکھنؤ یونیورسٹی آیا تھا۔ جوبلی کالج میں میرے اُستاد، پروفیسر سید علی عباس حسینی، پروفیسر حامد اللہ افسر اور مولانا اختر علی تلہری تھے جن سے میں نے استفادہ کیا تھا۔ یہ بزرگ اعلےٰ درجے کے ادیب تھے، اور اس زمانے کی ادبی دُنیا میں اُن

کی بڑی شہرت تھی۔ اِن اُستادوں نے جو ادبی ذوق اور مطالعے کا شوق پیدا کیا تھا، وہ یونیورسٹی میں میرے بہت کام آیا۔ اُنہیں کی معرفت احتشام صاحب سے میرا تعارُف ہوا، اور انہیں کی وجہ سے اُنہوں نے مجھے اپنے خاص شاگردوں کے حلقے میں شامل کرلیا۔ ہمیشہ میری رہنمائی کی، اور اُن کی اس رہنمائی کی بدولت میرے علم میں اضافہ اور میرے ذوقِ ادب و شعور میں وزن اور نکھار کی کیفیت پیدا ہوئی اور میں ادب کا ایک سنجیدہ طالب علم بن گیا۔

اس زمانے میں مجھے نہ صرف اُردو ادب بلکہ عالمی ادبیات کے مطالعے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ اس کی طرف توجہ دلانے کا سہرا بھی احتشام صاحب ہی کی رہنمائی اور شفقت و محبت کے سر ہے۔

ہوا یوں کہ جب احتشام صاحب نے ہم لوگوں کو پڑھانا شروع کیا، تو ہم اُن کے لکچروں سے بہت متاثر ہوتے۔ اُن کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ پہلے شاعروں اور نثر نگاروں کے حالات زندگی، اُن کی شخصیت، تصانیف انداز تحریر اور ادبی مرتبے پر تجزیاتی انداز میں باقاعدہ لکچر دیتے تھے۔ اس کے بعد متن کی طرف توجہ کرتے تھے۔ اِن لکچروں سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوا، اور ہمیں لُطف بھی آیا۔ کیونکہ احتشام صاحب کا خطیبانہ رنگ و آہنگ اور شہد و شکر میں ڈوبا ہوا لہجہ ایسا تھا کہ اُن کی باتیں ہمارے دلوں میں اُتر جاتی تھیں۔ اور پھر طالب علموں کے ساتھ اُن کا رویہ اتنا محبت آمیز تھا کہ ہم لوگ بہت تھوڑے عرصے میں اُن سے خاصے مانوس ہوگئے، اور کلاس کے بعد بھی خالی وقت میں اُن کے ساتھ۔ اُن کے کمرے میں بیٹھنے لگے۔ یہاں گفتگو مختلف ادبی موضوعات پر ہوتی تھی۔

میں اُن کے سامنے چُپ چاپ بیٹھتا تھا، اور علم و ادب کے اس بحرِ ذخّار کی دلکش اور معلومات افزا باتیں شوق و انہماک سے سُنتا تھا۔

ابھی اُن کے پاس جاتے ہوئے چند ہفتے ہی گذرے تھے کہ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا "آپ کس کالج سے آئے ہیں"؟

میں نے کہا "میں ابتدائی جماعتوں سے انٹرمیڈیٹ تک گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ میں پڑھتا رہا ہوں"۔

پھر اُنہوں نے پوچھا "آپ کے اُستاد وہاں کون کون تھے"؟

میں نے کہا "اُردو میں نے پروفیسر حامداللہ افسر اور مولانا اختر علی تلہری سے پڑھی ہے۔ میرے انگریزی زبان و ادب کے اُستاد پروفیسر خواجہ اطہر حسین اور پروفیسر اے۔ پی۔ بینر جی تھے۔ تاریخ میں نے پروفیسر سیّد علی عباس حسینی صاحب سے پڑھی ہے۔ یہ سب میرے شفیق اُستاد تھے، اور ان مضامین سے جو دلچسپی مجھے ہے وہ اُنہیں اُستادوں کی شفقت اور محبت کی دین ہے۔ میں کئی سال تک اُن کے قدموں میں بیٹھا ہوں، اور میں نے اُن سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اور اب یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں آپ کے قدموں میں زانوئے ادب تہہ کر رہا ہوں"۔

احتشام صاحب نے کہا "یہ تو بڑے پائے کے اساتذہ اور ادیب، شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ یقیناً آپ کو ان کی رہنمائی سے فائدہ ہوا ہے۔ اور اسی وجہ سے آپ ادب سے اتنی دلچسپی لے رہے ہیں"۔

غرض دیر تک احتشام صاحب سے باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ "آپ نے اب تک کون کون سے ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ کیا ہے"؟

میں نے کہا "ابھی میرا مطالعہ کوئی خاص نہیں ہے۔ البتہ میں نے تھوڑا بہت ولی، میر، سودا، میر حسن، جرأت، مصحفی، غالب، مومن وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے، اور نثر نگاروں میں میر امن، غالب، سر سید، حالی، نذیر احمدؒ، شبلی اور آزاد اور سرشار وغیرہ کو پڑھا ہے۔ جدید شاعروں میں مجھے علامہ اقبالؒ، جوش ملیح آبادی، مولانا حسرت، جگر صاحب، اصغر گونڈوی جذبی، مجاز اور فیض سے دلچسپی ہے۔"

یہ سُن کر احتشام صاحب نے فرمایا اُردو کے شاعروں اور نثر نگاروں کے ساتھ ساتھ آپ کو دُنیا کے کچھ نامور ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ بھی کرنا چاہیئے۔ مثلاً شیکسپیر، شیلے، کیٹس، بائرن وغیرہ، فرانسیسی ادیبوں میں آپ بالزاک، فلابیر، موپساں وغیرہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ روسی ادیبوں میں پشکن ٹالسٹائے، ترجنیف چیخوف اور گورکی وغیرہ کو پڑھیئے۔ اِن کے ترجمے انگریزی میں موجود ہیں۔ اِن کے مطالعے سے آپ کا ذہن روشن ہوگا، اور ادبی ذوق میں نکھار کی کیفیت پیدا ہوگی۔"

میں نے اُن کی اِن تجاویز کو گرہ میں باندھا، اور اِن مصنفین کی کتابوں کو لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری سے حاصل کر کے اِن کا مطالعہ شروع کر دیا، یونیورسٹی کے دورانِ قیام میں اُردو کے مصنفین کے مطالعے کے ساتھ بین الاقوامی شہرت کے اِن مصنفوں کا مطالعہ بھی میں نے شوق سے کیا۔ اور اسی سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔"

پھر ایک دن احتشام صاحب کہنے لگے "اُس وقت دُنیا کے ادب میں دو رُجحانات بہت نمایاں ہیں۔ ایک تو عمرانی یا مارکسی، دوسرے نفسیاتی۔ عمرانی رُجحان کے لئے آپ مارکس، لینن اور گورکی مایاکافسکی،

کاڈویل اور رالف فاکس وغیرہ کو پڑھئے اور نفسیاتی رُجحان کے لئے فرائڈ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ابھی اس کے خطبات پڑھ لیجئے۔ یہ کتاب بظاہر تو نفسیات کی کتاب ہے اور اس کا موضوع لاشعور ہے، لیکن اس میں فرائیڈ نے ادب اور ادیبوں کے مطالعے کو خاص طور پر اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔"

غرض اس طرح مختلف مُلاقاتوں میں احتشام صاحب میری رہنمائی کرتے رہے، اور یہ اُنہیں کا فیض ہے کہ ادب کے مطالعے کا جذب وجنوں میرے اندر پیدا ہو گیا۔ اس زمانے میں میں نے بہت کچھ پڑھا۔ کچھ سمجھ میں آیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مطالعے کے شوقِ فراواں نے میرے اندر ایک ایسی تبدیلی پیدا کی جس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

میں نے بی۔ اے کے پہلے ہی سال میں انگریزی ادبیات میں آنرز لے لیا تھا، اور میں لکھنؤ یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر سدھانت صاحب، دیا موائے متر اصاحب، رادھے شیام ستوگی صاحب اور ڈاکٹر رام بلاس شرما صاحب سے بھی استفادہ کرتا تھا۔ ان کے لکچروں اور ٹیوٹوریل میں باقاعدگی سے شریک ہوتا تھا، اور انگریزی ادبیات کے یہ اساتذہ بھی مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔ اِن کی شفقت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ انگریزی ادب کے مختلف پہلوؤں پر بھی میں بات کر سکتا تھا۔

لیکن میرے اُردو کے اساتذہ اور خصوصاً احتشام صاحب نے مجھے اُردو ادب میں بی۔ اے آنرز کرنے کا مشورہ دیا احتشام صاحب

نے کہا کہ اُردو ادب میں بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کرنے کا فائدہ ہے۔ کیونکہ ابھی یہ نیا مضمون ہے۔ اس میں ایم۔ اے کرنے کے بعد ملازمت ملنے کا اِمکان بھی زیادہ ہے۔ ہو سکتا ہے اُردو میں بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی ہی میں لیکچرار کی جگہ مل جائے۔"

یہ بات میرے دل کو لگی، اور میں نے اُردو ادب میں بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اور اس طرح میں اپنے اُردو کے اساتذہ اور خصوصاً احتشام حسین صاحب سے کچھ اور بھی قریب ہوگیا۔ اب میں نے اُن کی نگرانی میں ادبیات کا مطالعہ خاصی تفصیل سے کیا جس کی وجہ سے میرے اندر اعتماد پیدا ہوگیا، اور ادبی موضوعات پر تجزیاتی انداز میں بات کرنے کا سلیقہ مجھے آگیا۔ یہ تنقید سے میری دلچسپی کی ابتدا تھی۔

احتشام صاحب نے اسی زمانے میں مجھے مضامین لکھنے کی طرف بھی توجہ دلائی۔ میں اس زمانے میں اُردو کے رسالے، نگار، ہمایوں، ساقی، نیرنگ خیال اور عالمگیر وغیرہ کا مطالعہ تو باقاعدگی سے کرتا تھا۔ لیکن ان کے لئے کوئی مضمون لکھ کر بھیجنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

ایک دن احتشام صاحب کلاس میں آئے تو اُن کے پاس اُدبی دنیا کا ایک شمارہ تھا۔ ادبی دنیا اُس زمانے میں بڑے سائز پر شائع ہوتا تھا۔ یہ پرچہ اُنھوں نے مجھے دے دیا، اور کہا کہ "اُس کو پڑھ کر واپس کر دینا۔ اس میں میرا مضمون شائع ہوا ہے۔"

میں نے اُن سے یہ پرچہ لیا، اور مضمون، نظمیں اور افسانے یونیورسٹی ہی میں بیٹھ کر پڑھ ڈالے۔ رسالہ مجھے بہت اچھا لگا، اور میرا جی چاہا کہ اس

کے لئے مضمون لکھوں۔ چنانچہ چند روز میں ایک تنقیدی مضمون میں نے تیار کیا، اور یہ مضمون احتشام صاحب نے مولانا صلاح الدین احمد کو اڈیٹر ادبی دنیا بھیج دیا۔ دوسرے ہی مہینے وہ مضمون ادبی دنیا میں چھپ گیا، اور مجھے اس کی اشاعت سے خوشی ہوئی۔ احتشام صاحب بھی اس مضمون کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ کیونکہ یہ اُن کی شاگرد کی پہلی ابتدائی کوشش تھی۔ احتشام صاحب نے میری ہمت افزائی کی اور اس ہمت افزائی کی وجہ سے میں نے اس وقت کے ادبی رسائل میں باقاعدگی سے لکھنا شروع کر دیا۔ یہ سب کچھ احتشام صاحب کا فیض تھا کہ انہوں نے بہت تھوڑے عرصے میں مجھے ادیب اور نقاد بنا دیا۔

اس طرح احتشام صاحب نے میرے ادبی ذوق و شوق کی آبیاری کی، اور اُن کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں ادب کے ساتھ پوری طرح وابستہ ہو گیا۔ اس زمانے میں میں نے نہ صرف ادبیات کا مطالعہ کیا بلکہ خود بھی لکھا۔ احتشام صاحب نے مجھے لکھنے کے لئے نئے نئے موضوعات بھی سُجھائے۔ میں نے اِن موضوعات پر مضامین لکھے۔ اور یہ مضامین اس زمانے کے مشہور ادبی رسالوں میں شائع ہوئے۔

میں کوئی پانچ سات سال احتشام صاحب کا شاگرد رہا، اور میں نے فرسٹ کلاس میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کیا۔ ایم۔ اے کرلے کے بعد میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لے لیا، اور اُن کی نگرانی میں اُردو تنقید پر تحقیق کا کام شروع کر دیا۔ چند سال کی محنت کے بعد میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کر لیا۔ احتشام صاحب کی رہنمائی اور شفقت و محبت مجھے حاصل نہ ہوتی تو اس تحقیقی کام کو میں اتنے تھوڑے عرصے

میں مکمّل نہ کر پاتا۔

احتشام حسین صاحب اپنے زمانے کے مشہور ادیب اور نامور نقاد تھے۔ ادبی دُنیا میں اُن کی بڑی شہرت تھی۔ اس وقت کے تقریباً تمام اہم ادیبوں، شاعروں اور نقّادوں سے اُن کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ اور وہ سب اُن کی تنقیدی تحریروں کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ ازراہِ نوازش وہ ادیبوں اور شاعروں کی اِن محفلوں میں مجھے بھی شریک کر لیتے تھے۔ چنانچہ ان ادیبوں اور شاعروں سے میری ملاقات بھی احتشام صاحب ہی کے توسط سے ہوئی۔ جن ادیبوں اور شاعروں سے احتشام نے ملاقات کروائی ان میں مولانا حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، جگر مُرادآبادی، احسان دانش، فراق صاحب، اثر صاحب، روش صدیقی، فیض احمد فیض، ساغر نظامی، مخدوم محیٓ الدین، مجروح سُلطان پوری، سلام مچھلی پُری، سید سجاد ظہیر، سید سبطِ حسن، رشید جہاں، پروفیسر سید اعجاز حسین، ڈاکٹر حفیظ، سید رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری وغیرہ کے نام سرِفہرست ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں ایسے بلند پایہ اور نامور شاعروں اور ادیبوں کی محفلوں میں شریک ہو سکوں گا، اور وہ میرے ایسے نو وارد اور مبتدی شخص پر شفقت فرمائیں گے۔ احتشام صاحب نے اس کے لئے مواقع فراہم کئے، اور اُن سب نے بڑی محبت سے مجھے اپنے قبیلے کا آدمی تصور کیا۔

احتشام صاحب اُس زمانے میں لکھنؤ کے محلّے بارود خانہ (گولہ گنج) میں رہتے تھے۔ یہ دو منزلہ مکان تھا۔ نیچے کے حصّے میں احتشام صاحب

کی اسٹڈی تھی جہاں وہ لکھتے پڑھتے تھے۔ اس حصّے میں دو کمرے مہمانوں کے لئے مخصوص تھے۔ اوپر کی منزل میں اُن کی بیگم اور بچوں کا قیام تھا۔ اُن کی بیگم پردہ کرتی تھیں۔ اس لئے کبھی نیچے نہیں آتی تھیں۔ البتہ اُن کے بچے اکثر نیچے ہی کے کمروں میں نظر آتے تھے اور ایسا ہنگامہ برپا کرتے تھے کہ اکثر اوقات بیٹھنا اور بات کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں جب احتشام صاحب سے ملنے کے لئے جاتا تھا تو وہ ضرور نیچے آجاتے تھے۔ کبھی احتشام صاحب کی گود میں بیٹھ جاتے تھے، کبھی میرے پاس آجاتے تھے۔ کبھی برابر کے کمرے میں کھیلنا شروع کر دیتے۔ لیکن احتشام صاحب نے کبھی اُن سے کچھ نہیں کہا۔ وہ بچوں پر سختی کرنے اور اُن کو سرزنش کرنے کے قائل نہیں تھے۔ برخلاف اس کے وہ اُن کے ساتھ محبت سے پیش آتے تھے اور اُن کی ہر فرمائش پوری کر دیتے تھے۔ مہمانوں کا یہ حال تھا کہ نیچے کے دونوں کمرے مہمانوں سے بھرے رہتے تھے۔ بعض مہمانوں کا قیام تو وہاں مستقل طور پر تھا۔ بعض اُن کے وطن سے آتے تھے اور مہینوں لکھنؤ میں احتشام صاحب کے ہاں قیام کرتے تھے۔ یہ سب اُن کے عزیز اور رشتے دار تھے، اور احتشام ان کی بھی ہر فرمائش کو پورا کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ میں اُن کا شاگرد تھا لیکن میں جب بھی اُن کے ہاں ملنے کے لئے جاتا تھا تو وہ اپنے چھوٹے بھائی جنّا میاں سے کہتے تھے۔ "جنّا! ذرا چائے کے لئے کہہ دینا" اور وہ چند منٹ میں چائے لے آتے تھے۔ احتشام صاحب چائے تو پی لیتے تھے لیکن نہ پان کھاتے نہ سگریٹ پیتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں کبھی کبھی پان کھا لیتا ہوں، بلکہ اس بات کا بھی انہیں علم تھا کہ میں اور میرے کلاس فیلو دُلارے لال ماتھر، اپنے اُستاد مسعود صاحب کی ڈبیا

ہیں سے پان چُرا کر کھاتے ہیں۔ اس لئے وہ جانے کے بعد ہمیشہ کہتے تھے "جنا! پان بھی منگوانا"۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں پانوں کا خاص دان بھی آجاتا تھا، اور میں ہمّت کر کے ایک دو پان کھا لیتا تھا۔

غرض احتشام صاحب کے ہاں خاصی خاطر تواضع ہوتی تھی، باتیں بھی وہ خوب کرتے تھے اور میں اُن کی باتیں سُنتا تھا خود کم بولتا تھا۔ مقصد تو اُن باتوں سے علمی استفادہ اور بعض مسائل کو حل کرنا ہوتا تھا۔ احتشام صاحب کبھی باتیں کرتے ہوئے تھکتے نہیں تھے، اور نہ کبھی بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ نہ کبھی یہ سوچتے تھے کہ اُن کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ زیادہ تر وہ علمی ادبی باتیں کرتے تھے۔ درمیان میں اُن کے بچے، مہمان اور دوسرے لوگ بھی آتے رہتے تھے۔ احتشام صاحب اِن سب کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے اور بیٹھے بیٹھے اُن کی فرمائشیں پوری کرتے رہتے تھے۔ کوئی فقیر باہر آواز لگاتا تھا تو باہر جا کر اُسے بھی کچھ دے دیتے تھے۔ اُن کے دروازے سے کوئی فقیر کبھی مایوس واپس نہیں گیا۔ احتشام صاحب کے مزاج میں بڑی دل سوزی تھی۔ وہ کسی کو محروم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر ایک کی خواہش کو پورا کرنا اُن کا نصب العین تھا۔ وہ اس کو ایک طرح کی عبادت سمجھتے تھے۔

احتشام صاحب کے دل میں وہ کیفیت بدرجۂ اتم تھی جس کو ورڈسورتھ نے MILK OF HUMAN KINDNESS کہا ہے۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسی لئے ہر ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، اور بعض اوقات تو لوگوں کی ضرورت کو پورا کرنے میں وہ اپنی حدود سے تجاوز کر جاتے تھے، یا باہر نکل جاتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک واقعے کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔

میرے ایک ساتھی ایک امتحان میں دو تین سال فیل ہوئے۔ تیسری دفعہ جب اُنہوں نے امتحان دیا تو ایک پرچہ پھر خراب ہو گیا۔ اُنہوں نے جب مجھے بتایا کہ اُن کا ایک پرچہ پھر خراب ہو گیا ہے، اور اگر وہ اس سال پاس نہیں ہوں گے تو تعلیم کو خیر باد کہہ دیں گے تو میں نے صورتِ حال کی سنگینی کے پیشِ نظر یہ سوچا کہ احتشام صاحب سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ میں اُنہیں احتشام صاحب کے پاس لے گیا۔ ساری روداد انہیں سنائی۔ اُن کا دل بھر آیا، اور اُنہوں نے ایک ذاتی خط ممتحن کو لکھ دیا۔ اُن کے اس خط کا اثر ہوا، اور اُنہوں نے ایک ذاتی خط ممتحن کو لکھ دیا۔ اُن کے اِس خط کا اثر ہوا، اور اُنہوں نے میرے دوست کے ساتھ رعایت کی، اور وہ پاس ہو گئے، اور پھر بہت ترقی کی یہاں تک کہ آج وطنِ عزیز کی اہم شخصیات میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ احتشام صاحب امتحان کو ایک غلط نظام سمجھتے تھے، اور وضع داری، روایت پسندی، بلند اخلاقی، انسان دوستی، پیار و محبت یہ خصوصیات انہیں اسی ماحول سے ملیں۔ پھر انہوں نے پڑھ لکھ کر اس وضع داری کو جدید علوم اور طرزِ فکر کے ساتھ اس طرح شیر و شکر کیا کہ وہ ایک منفرد شخصیت کے مالک بن گئے۔

احتشام صاحب نے اپنی زندگی میں زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ انگریزوں کے دورِ غلامی کی کساد بازاری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے افلاس کو نہ صرف دیکھا بلکہ خود اس میں سے ہو کر گذرے۔ اس صورتِ حال نے اُن کے اندر رحم دلی، دل سوزی اور فرض شناسی کی خصوصیات پیدا کیں، اور یہ خصوصیات ایسی ہیں جو ایک اُستاد کو مثالی اُستاد بنا دیتی

بنا دیتی ہیں احتشام صاحب ایک مثالی اُستاد اور ایک مثالی انسان تھے۔
اپنے طالب علموں کی زندگی کو بنانے سنوارنے اور نکھارنے کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ عجب عجب طرح اُن کی مدد کرتے تھے۔ ایک صاحب کسی دُور افتادہ جگہ سے لکھنؤ آئے، اور اُردو میں پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ کیا۔ احتشام صاحب سے ملے۔ اُنہوں نے ہمت افزائی کی پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ کروا دیا۔ موضوع طے ہو گیا لیکن جب کام کرنے کا وقت آیا تو احتشام صاحب کو علم ہوا کہ انہیں کام کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ ادب سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں رکھتے۔ سال دو سال مطالعہ بھی برائے نام ہے۔ سال دو سال تک کچھ نہ کر سکے۔ یہ دیکھ کر احتشام صاحب نے تھیسز کے کئی باب انہیں DICTATE کروا دیئے، اور اس طرح تین سال کی مقررہ مدت میں اُن کا تھیسز تیار ہو گیا، اور اُنہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ احتشام صاحب نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ یہ داخلہ اُن کی سفارش پر ہوا تھا، اور یہ کہ وہ اسکالر کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ لوگوں سے کام لینا اور خود کام کرنا اُنہیں خوب آتا تھا۔

احتشام صاحب زبان، ادب، فلسفے و نفسیات اور عمرانیات و جمالیات کے ماہر تھے۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس لئے انہیں اس طرح کے کاموں میں کوئی دُشواری پیش نہیں آتی تھی۔ اِن موضوعات پر وہ گھنٹوں باتیں کر سکتے تھے۔ اُن کا مزاج تجزیاتی تھا۔ اس لئے وہ فوراً اِن علوم کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ مزاج میں باقاعدگی اور ترتیب و تہذیب کا ایسا شعور تھا کہ وہ ہر موضوع کو اظہار و ابلاغ کا شاہکار بنا دیتے تھے۔ یہ تمام پہلو اُن کی تحریر و تقریر دونوں میں اپنا جلوہ دکھاتے تھے۔

احتشام صاحب نے اپنی ساری زندگی ادب کے مطالعے اور اس کی تخلیق میں گُزار دی۔ وہ ایک اعلےٰ درجے کے شاعر، ایک بلند پایہ افسانہ نگار اور ایک منفرد ادیب و نقاد تھے۔ اُنہوں نے اُردو تنقید کو ایک نئے رنگ سے آشنا کیا، اور تجزیاتی و عمرانی تنقید کی ایسی داغ بیل ڈالی جو اپنی مثال آپ ہے۔ وہ اُردو میں مارکسی تنقید کے بہت بڑے علم بردار تھے۔ اُنہوں نے تنقیدی موضوعات پر ہزارہا صفحات لکھے۔ اُن کا انداز تنقید نہایت عالمانہ اور تجزیاتی تھا۔ اس میں سنجیدگی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے مطالعے سے ادبی مسائل کو سمجھنے کا شعور بیدار ہوتا ہے، اور وہ پڑھنے والے کو گرمی اور روشنی سے ہم کنار کرتی ہے۔

ویسے احتشام صاحب کا مزاج بُنیادی طور پر تخلیقی تھا۔ وہ اعلےٰ درجے کے شاعر بھی تھے، اور اپنا خوبصورت کلام ایسے ترنم سے پڑھتے تھے کہ سماں بندھ جاتا تھا، اور سامعین اُن کے کلام کو سُن کر مسحور ہو جاتے تھے۔ افسانے بھی اُنہوں نے ایسے لکھے ہیں جن کو اُردو کے بہترین افسانوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اُن کی شاعری کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا لیکن جو کلام مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوا ہے وہ تخلیقِ جمال کا شاہکار اور تہذیبِ جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اُن کی زبان سے مخصوص ترنم کے ساتھ جو اشعار میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں سُنے تھے وہ آج بھی میرے اندر دھومیں سی مچاتے ہیں۔ دو غزلوں کے صرف دو شعر یاد رہ گئے ہیں کیا خوب اشعار ہیں ؎

جب حریمِ دل میں روشن ہی نہ تھے غم کے چراغ
چاندنی راتیں تھیں ایسی چاندنی راتیں نہ تھیں

کل تو خیر، اُن کی یاد آئی تھی
آج کیوں ہے فضا اُداس اُداس

یہ اور بات ہے کہ احتشام صاحب کی تنقید کے گھنے اور تناور درخت نے اُن کی شاعری اور افسانہ نگاری کو پوری طرح پھلنے پھولنے نہیں دیا، اور وہ بُنیادی طور پر ایک نقّاد، ہی رہے۔

پروفیسر سید احتشام حسین صاحب ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ایک عظیم اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہت بڑے ماہر لسانیات اور ایک بہت بڑے محقق اور نقّاد تھے۔ لیکن انہیں اپنی اس بڑائی کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ وہ طالب علموں کی طرح رہتے تھے۔ عام انسانوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ نمود و نمائش سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سخت زندگی گذارتے تھے۔ لوگوں کی خدمت کرتے تھے، ہر ایک کا دل ہاتھ میں لیتے تھے۔ محبت اُن کا نصب العین تھا۔ لکھنے پڑھنے اور علمی ادبی کام کو انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ بس یہی اُن کی تفریح تھی۔ وہ کم آمیز تھے۔ لیکن اچھے لوگوں سے اچھی طرح ملتے تھے۔ یونیورسٹی میں اُن کے احباب کا ایک حلقہ تھا، اور یہ لوگ بین الاقوامی شہرت کے عالم اور کردار کے لوگ تھے۔ شام کو ان کا معمول یہ تھا کہ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں جانے کی بجائے کتابوں کی دوکانوں میں نظر آتے تھے۔

احتشام صاحب کے مزاج میں قلندری اور درویشی تھی۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو دولت، شہرت، آرام طلبی سب سے بے نیاز کر لیا تھا۔ وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لہو و لعب سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اُنھوں نے اپنے گھر میں نمود و نمائش کے لئے کبھی کوئی ڈرائنگ روم نہیں بنایا۔

کبھی کار نہیں خریدی، نہ کبھی کار رکھنے کا ارادہ کیا۔ وہ سائیکل یا تانگے پر یونیورسٹی جاتے تھے۔ شام کو باہر نکلتے تھے تو عام طور پر پیدل چلتے تھے۔ وہ کبھی کسی کلب کے ممبر نہیں ہوئے۔ کبھی لکھنؤ کے دوران قیام میں سوٹ نہیں پہنا۔ جب راک فیلر اسکالر کی حیثیت سے امریکہ گئے تو البتہ انہیں سوٹ پہننا پڑا۔ لیکن وطن واپس آکر انہوں نے سوٹ کو خیرباد کہہ دیا۔ اُن کے پاس اپنے مکان میں صرف ایک کمرہ تھا جس کو اُن کی اسٹڈی یا مطالعے کا کمرہ کہا جاسکتا ہے۔ اس میں ایک میز اور چند کُرسیاں اور کتابوں کی کچھ الماریاں تھیں۔ اِسی کمرے میں بیٹھ کر وہ کام کرتے، لکھتے پڑھتے اور لوگوں سے ملتے تھے۔

دِلّی کے دورانِ قیام میں ایک دفعہ احتشام صاحب نے مجھے میزبانی کا شرف بخشا۔ میں اس زمانے میں اینگلو عربک کالج ہوسٹل کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ احتشام صاحب اسی کمرے میں میرے ساتھ ٹھہرے اور دِلّی میں جہاں بھی جانا پڑا کرائے کی سواری میں میرے ساتھ گئے۔ لکھنؤ واپس جانے لگے تو میں نے بھی اُن کے ساتھ جانے کا پروگرام بنالیا، اور اُنہوں نے بغیر ریزرویشن کے میرے ساتھ انٹر کلاس میں سفر کیا۔ انہیں اس طرح سفر کرنے میں تکلیف بھی ہوئی لیکن اُنہوں نے میری خاطر اس تکلیف کو برداشت کرلیا۔

ایک دفعہ ہم لوگ اُردو کانفرنس میں شرکت کے لئے ناگپور گئے۔ اُنہوں نے میرے ساتھ انٹر کلاس میں سفر کیا۔ لکھنؤ سے جھانسی پہنچے۔ رات کو دو بجے گاڑی بدلی، ناگپور کی گاڑی دو بجے رات کے وقت جھانسی کے اسٹیشن پر آئی۔ ریل کا ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دروازہ بند

تھا۔ہم لوگ کھڑکیوں میں سے اندر داخل ہوئے۔ اُس ڈبے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی صاحب اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی بھی ناگپور جارہے تھے۔ انہوں نے ہمیں جگہ دی اور ہم اس طرح رات بھر جاگتے ہوئے ناگپور پہنچے، اور کانفرنس میں شرکت کر کے اسی طرح لکھنؤ واپس آئے۔

احتشام صاحب کے احسانات مجھ پر بے شمار ہیں۔ اُنہوں نے مجھے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ پڑھایا۔ ادب کا ذوق اور مطالعے کا شوق میرے اندر پیدا کیا، اور مجھے اپنی رہنمائی سے ادیبوں اور نقادوں کی صف میں میرے لئے جگہ بنا دی۔ امریکہ گئے تو وہاں سے مجھے لمبے لمبے خط لکھے، جن سے امریکہ کی یونیورسٹیوں اور وہاں کے ادیبوں، نقادوں، پروفیسروں اور تعلیم و تدریس کے ماہروں کے بارے میں میری معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد جب میں نے اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے رختِ سفر باندھا تو نہ صرف میری ہمت افزائی کی بلکہ اپنے احباب مثلاً سیّد سعید جعفری صاحب ڈپٹی کمشنر لاہور، ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی صاحب ظفر الاحسن صاحب، فضل احمد کریم فضلی صاحب اور کئی ایسے احباب کو تعارفی خط لکھے جو پاکستان میں اس وقت اعلےٰ عہدوں پر فائز تھے۔ احتشام صاحب کی بدولت مجھے ان بزرگوں اور دوستوں کی شفقت اور محبت بھی نصیب ہوئی جس کی بدولت پاکستان میں نئی زندگی کے بہت سے مراحل خوش اسلوبی کے ساتھ طے ہو گئے۔

آج احتشام صاحب اس دُنیا میں نہیں ہیں، لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اُن کی عظیم شخصیت میرے اوپر سایہ کئے ہوئے ہے، اور میں

اُس کی اَن گنت خصوصیات کے سائے میں زندگی کی پُرپیچ اور دُشوار گذار راہوں پر سکون و اطمینان کے ساتھ گامزن ہوں۔ اُن کے ساتھ جو وقت میں نے گذارا ہے، اُن کے قدموں میں رہ کر جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے، جو کچھ اُن سے سیکھا ہے، اُس کی گرمی اور روشنی آج بھی میری رہنمائی کرتی ہے، اور اس رہنمائی کی بدولت زندگی کی اَن گنت نئی منزلوں سے ہم کنار ہونے کا شوقِ فراواں میرے اندر جذب و جنوں کے طوفانوں کو موج زن کرتا، اور مجھے اُونچے سُروں میں یہ نغمہ سُناتا ہے جس کے بول ہیں ؎

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

عبادت بریلوی

(۷۳)

غالب اور مُطالعۂ غالب

غالب ایک عظیم شاعر ہیں اور اُن کی اس شاعرانہ عظمت کو اُردو کے شاعروں، تذکرہ نگاروں، ادبی مؤرخوں اور قدیم و جدید نقادوں، سب ہی نے تسلیم کیا ہے۔ گذشتہ سو سال میں اُن کی اس عظمت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت ان بے شمار کتابوں اور مقالوں میں ہوتی رہی ہے، جو وقتاً فوقتاً چھپ کر شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور شاعری پر اچھا خاصا تحقیقی اور تنقیدی مواد جمع ہو گیا ہے۔ لیکن ان کی اس شخصیت اور شاعری دونوں میں کچھ ایسی پہلودار کیفیت ہے کہ ہر دور میں اُس کے مختلف پہلوؤں پر کچھ نئی باتیں کہنے اور نئے خیالات کو پیش کرنے

کی گنجائش ہمیشہ باقی رہے گی۔

یہ کتاب غالب اور مطالعۂ غالب بھی اسی صورت حال کی پیداوار ہے۔ اس کی تیاری میں غالب کے متعلق تقریباً تمام تحقیقی اور تنقیدی مواد کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور اُس سے حسب ضرورت استفادہ کر کے غالب کی شخصیت اور شاعری کے بعض نئے گوشوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کا لکھنے والا گذشتہ تیس سال سے غالب کی شخصیت اور شاعری کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعے میں مصروف رہا ہے۔ اس مطالعے کے جو نتائج نکلے ہیں، وہ سب اس کتاب میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ چونکہ مطالعے کا سلسلہ ابھی جاری ہے، اس لئے ان نتائج کو حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ آئندہ جو نتائج سامنے آئیں گے، اُن کو یا تو اس کتاب کے آئندہ ایڈیشنوں میں پیش کر دیا جائے گا یا ایک نئی کتاب مرتب کر کے شائع کر دی جائے گی۔

یہ کتاب اُردو شاعروں کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعے کے ایک باقاعدہ اور بڑے منصوبے کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کوشش اور کاوش مومن اور مطالعۂ مومن، کے نام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اس منصوبے کے مطابق غالب کے اس مطالعے کو مومن اور مطالعۂ مومن، کی اشاعت کے دو تین سال بعد شائع ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ۱۹۶۲ء میں راقم انگلستان چلا گیا اور پانچ سال تک لندن یونیورسٹی میں تدریس کے ساتھ مطالعے اور ادبی تحقیق میں مصروف رہا۔ اس لئے اس کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔

لیکن حسن اتفاق سے اس تاخیر کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اب یہ کتاب غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر شائع ہو رہی ہے۔ شاید اس کی اشاعت میں یہ تاخیر اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ اس عظیم شاعر کے جشن صد سالہ کے موقع پر یہ بھی اس خراج عقیدت میں شریک ہو، جو اس سال اُس کو دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔

شفیق مکرم مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی صاحب نے اس کتاب کا نہایت ہی حسین و دلآویز سرورق بنایا ہے، عزیز گرامی ڈاکٹر ناظر حسن زیدی صاحب نے بڑی محنت سے اس کا اشاریہ تیار کیا ہے۔

ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے راقم کے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

لاہور

۲۵ ستمبر ۱۹۹۴ء

عبادت بریلوی

خطوطِ احمد ندیم قاسمی

اُردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار اور شاعر جناب احمد ندیم قاسمی صاحب میرے عزیز دوست ہیں۔ اُردو دنیا میں اُن کی بڑی شہرت ہے۔ اُنہوں نے گذشتہ ساٹھ ستّر سال میں ایسے افسانے لکھے ہیں، اور کچھ ایسی نظموں اور غزلوں کی تخلیق کی ہے جو ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ اُن کا اسلوب ایک منفرد اسلوب ہے جو رہتی دُنیا تک قائم رہے گا۔

قاسمی صاحب نے قیامِ پاکستان سے قبل جو خطوط مجھے لکھے وہ اس

اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ اِن میں اُن کا بے پایاں خلوص اپنے معراج کمال پر نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ اُردو کے ایک رسالے "نقوش" کے اڈیٹر تھے لیکن وہ نئے لکھنے والوں کی اہمیت کو محسوس کرتے تھے۔ خاص طور پر ایسے نئے لکھنے والوں سے جنہوں نے صرف چند سال پہلے لکھنا شروع کیا تھا، لیکن جن میں انہیں زندگی اور ادب کو سمجھنے کی صلاحیت بدرجہ اتم نظر آتی تھی۔

میں نے جب قیام پاکستان سے قبل اُنہیں ۱۹۴۱ء میں اپنا ایک طویل مضمون اُردو ادب ۱۹۴۳ء میں اشاعت کی غرض سے بھیجا تو ایک خط میں انہوں نے اس کی بڑی تعریف کی، اور مجھے نقوش میں باقاعدگی سے لکھنے کے لئے کہا۔ چنانچہ میں نے اُن کی فرمائش پر کئی مضامین لکھے، جن کو اُنہوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے رسالے "نقوش" میں شائع کیا۔

اُس زمانے میں اشاعت کی دُنیا میں عجیب و غریب صورتِ حال تھی۔ ابھی تک قیام پاکستان کی جدوجہد کا سلسلہ جاری تھا لیکن ابھی تک اس کے قیام کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ہر مسلمان اُس کے قیام کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ لیکن ابھی تک کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ اِس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ہر طرف ایک انتشار کا عالم تھا۔ لوگ پکڑے بھی جاتے تھے، اور اُن پر مقدمات بھی چلتے تھے۔ لیکن کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

پنجاب میں خاص طور پر آئے دن رسالوں کو حکومت کی طرف سے ذرا سی بات کرنے یا کسی مضمون میں معمولی سی باتیں کہنے کی اجازت

نہیں تھی۔ اگر کبھی کوئی مضمون رسالے میں ایسا چھپ بھی جاتا تھا، جس میں معاشرے اور حکومت کی مخالفت ہوتی تھی تو رسالے کے اڈیٹر کو عدالت میں جانا پڑتا تھا۔ عدالتوں کی کاروائی میں مہینے بلکہ سال لگ جاتے تھے۔ اور فیصلہ ہمیشہ حکومت کے حق میں ہوتا تھا۔

احمد ندیم قاسمی نے اِن خطوں میں اس صورتِ حال کی تفصیل بھی لکھی ہے، اور بہت سی ایسی باتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے، جن سے اس زمانے میں ترقی پسند رسالے دوچار تھے۔ نقوش بھی اُس زمانے میں ایسا ہی ترقی پسند رسالہ تھا جس کو احمد ندیم قاسمی صاحب مُرتب کر کے چھاپتے تھے۔ چنانچہ آئے دن انہیں عدالتوں میں جانا پڑتا تھا، اور ایسی باتیں سہنی پڑتی تھیں جن کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔

یہ خطوط اپنے موضوعات کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہیں، اور ایک ترقی پسند شاعر افسانہ نگار اور ادیب کی یہ تحریریں، نہ صرف ادیبوں اور شاعروں کے لئے دلچسپ ہیں بلکہ عام پڑھنے والوں کے لئے بھی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

اس لئے میں نے قاسمی صاحب کے ان خطوط کو محفوظ رکھا، اور اب کوئی پچاس پچپن سال بعد یہ خطوط شائع کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں مجھے اپنی چند غیر مطبوعہ نظمیں بھی بھیجی تھیں، جن کو اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

عبادت بریلوی

۸۷/۸۸۔ این سمن آباد، لاہور
۷، جولائی ۱۹۹۵ء

His poems reflect his nobility of character and his human approach to life and endear his personality to the reader. His poetical compositions show that he was inspired as a youth by the national lyric movement of the eighteenth century in Scotland. He has given expression to his patriotism and his love for his homeland in his pastorals and in his poems describing sea voyages. He borrows his poetic expressions and his images from the lore and the landscape of the Highlands and sings about "the harvest that waves in the breeze and the music that fleets on the gale".

I, therefore, decided to publish these poems in such a manner that the correct text is produced and the specimen of the handwriting of this great man-of-letters is also preserved for ever. My friend and colleague Professor S. V. H. Abedi, Ex-Associate Professor of Spoken Iranian in the University of the Punjab at Oriental College, Lahore and at present Research Officer in the Department of Literary History of the University of the Punjab, helped me a great deal in correcting the text and also in producing the book in this form, which is not only beautiful but useful. I must thank Professor Abedi for his valuable assistance. I must also thank Professor J. D. Pearson, sometimes Librarian of the School of Oriental & African Studies and now Professor of Bibliography in the University of London and Mr. Bloomfield, Deputy Librarian (now Librarian) of the S O A S for their help in the discovery of this valuable manuscript. I must also thank my friends snd colleagues in the Department of India, Pakistan & Ceylon, S O A S, particularly Professor J. C. Wright, Professor of Sanskrit in the University of London and Head of the Department of India, Pakistan and Ceylon and Mr. Ralph Russell, Reader in Urdu in the University of London for their advice and help in completing this work.

I hope that these unpublished poems of Dr. John Gilchrist, being a new discovery in the world of Literature, will be of interest not only to the scholars of Urdu but also for the students of English Language and Literature.

Oriental College,
University of the Punjab,
Lahore (Pakistan).

Dr. Ebadat Brelvi

Dr. Gilchrist was not only a grammarian and a Lexicographer but a Scholar of very high calibre having a literary bent of mind, and a high refined taste of poetry and literature. Nobody knows that he was a poet of sufficient literary merit. In his early life, before he came to India, he wrote poems in English on "Various Subjects", as early as 1780, when he was hardly 20 years old. He collected these poems but they remained unpublished, perhaps because of Dr. Gilchrist's preoccupation with his academic work in the field of Linguistics and Philology. The Manuscript of these poems, however, survived and I have the honour of discovering this rare piece of literature during my stay in London as Visiting Lecturer in Urdu at the School of Oriental and African Studies, University of London.

After the death of Dr. Gilchrist his published and unpublished papers were transferred to Gilchrist Trust in London, an Organisation which was founded for the purpose of awarding educational Scholarships to the students. This Trust, along with other Gilchrist papers, transferred the manuscript of his poems to the Library of the School of Oriental & African Studies, University of London. But nobody cared to see this valuable manuscript, which not only contains rare material on the early life of Dr. Gilchrist. but which has its own literary and poetic value.

My stay in London as Visiting Lecturer in Urdu at the School of Oriental and African Studies in this respect was very fruitful. Along with a number of rare Urdu manuscripts I discovered this valuable manuscript, and it was a great joy of my life when I came to know that Dr. Gilchrist was not only a linguist, a grammarian, a lexicographer, but also a poet of sufficient merit. When I saw this manuscript of his poems I felt I have found a valuable treasure because the peoms were written in Dr. Gilchrist's own hand. I read these poems and was very much impressed by their literary and poetic value and also by the new light they threw on the early life of Dr. John Gilchrist.

took keen interest in this language, started work on its various aspects and became well-known as an expert and a specialist in the subject.

It was because of his reputation as an expert in this field that when Fort William College was established at Calcutta in 1800, he was appointed first Professor of Hindustani (Urdu). This distinguished position accelerated the work he had already started on Urdu language, and he settled down to work according to his plans as a very ambitious man, and in a short period of time he established his position as a distinguished Professor, a well-known Scholar, an eminent linguist, a renowned man of letters and a great patron of Urdu language and literature.

During his stay in the College of Fort William as Professor of Hindustani (Urdu), he organised teaching of Urdu language for British Officers and invited some renowned writers of Urdu to work in his Department as Munshis to prepare reading material for the students. They worked under the guidance of Dr. Gilchrist and produced works in Urdu prose of such a high standard that they became a valuable part of the tradition of literary prose in Urdu. Mir Amman, Syed Haider Bakhsh, Mir Bahadur Ali Husaini, Mazhar Ali Khan Wila & Hafizuddin Ahmad are the prose writers who worked under the guidance of Dr. Gilchrist, and the prose works they produced in Urdu, became well-known and were regarded as a landmark in the tradition of Urdu prose.

Dr. Gilchrist himself worked on Urdu language and produced some very good works on Grammar, Linguistics & Philology. These works were published in early Nineteenth century but they are still useful for the students aud scholars of Urdu language and literature. They have a distinguished place in the field of Linguistics and confirm that Dr. Gilchrist was a great Scholar devoted to the Study of Urdu language and literature. In this respect he holds a unique position as a Scholar of Urdu in the tradition established by the orientalists.

Vol, I

By John Borthwick Gilchrist
London
Reprinted from the Edition of 1810
for Kingsbury, Parbury, Allen, Leadenhall Street,
1825

---

(3)

Oriental Green Bag,

or a Complete sketch of Edwards Alter in the Royal Exchange, Containing a full account of the Battle with the Books, between a Belle and a Dragon, by a radical admirer of the Great Sir William Jones's Civil, religious and Political Creed, against whom informations have recently been lodged for Treasonable offence and heinous crime, of deep rooted hostility and despotism, in every shape and form on the sacred oath of peeping Tom at Coventry.
London : Printed and sold by the
Author J. B. Gilchrist, No. 48. Duke Street. St. James's Square, 1820. Price Half a Crown.

Dr. John Gilchrist was an eminent Orientalist of nineteeth century. Although he was a physician by profession, he was so much interested in India and Indo-Muslim Culture that during his stay here he showed keen interest in Indian languages, particularly the Urdu language, which was spoken by the majority of Muslims and Hindus in the Sub-continent. This language in those days was called Hindustani by the British. Urdu or Urdu-i-Mualla by the Muslims and Hindi by the Hindus. As has been stated Dr. Gilchrist

centered in this respect that he always thought that he is the only competent person to undertake this work, and to a great extent it was true. His interest in the subjects reflects in the details he gives on the front pages of his books. They are interesting in understanding the personality of Dr. Gilchrist. Some of them are, therefore, reproduced here.

(1)

The British Indian Monitor.
Anti-Jargonist, or the Strangers' Guide.
Oriental Linguist,
and various other works
Compressed into series of portable Volumes
on the Hindustani Language
improperly called Moors
with
Considerable Information
respecting
Eastern Tongues, Manners, Customs etc.,
by the Author of
Hindoostani Philology
Volume II
Edinburgh, 1808

(2)

Hindoostani Philology
Comprising
A Dictionary
English and Hindoostani
with a
Grammatical Introduction

To which is prefixed a Copper Plate exhibiting a comparative view of the Roman and Oriental Characters in the Hindoostani Language

Hindustani language privately. During this period he was not keeping good health. So he handed over this private Institution to Dr. Duncan Forbes, a renowned Scholar of Urdu and left for Scotland and settled down in Edinburgh. But his health deteriorated and, therefore, he had to go to France for treatment, stayed there for sometime but could not recover and died in Paris on 9th January 1841.

The following are the well-known published works of Dr. Gilchrist :

1. Dictionary, (English and Hindoostani : 2 volumes) (Calcutta. 1787).
2. A Grammar of the Hindustani Language, Calcutta, 1796.
3. The Oriental Linguist.
4. The Anti-Jargonist.
5. A New Theory and prospects of Persian Verbs.
6. Hindee Exercises.
7. The Stranger East India Guide to the Hindoostani, or Grand popular Language of India : (London, 1820).
8. The Hindoostani Directory or Students' Introductor.
9. The Hindi Principles.
10. The Hindoostani Manual or Casket of India (Calcutta, 1802).
11. The Oriental Fabulist : Calcutta, 1803.
12. Moral Preceptor.
13. The Hindi Arabic Mirror.
14. The Hindi Roman Ortheopical Ultimatum.
15. The British Indian Monitor : Edinburgh, 1808.
16. The Oriental Green Bag.

This list of books produced by Dr. Gilchrist shows that he was interested in various aspects of the Hindustani language and throughout his life he remained busy with this work. He was so much self-

where officers of East India Company were given instructions in Indian Languages. He worked there successfully for 1½ years. The G. G. Lord Wellesly admired his services" to Hindustani (Urdu) language. This "Oriental Seminary", however, was closed on 10th of July 1800 and Lord Wellesley founded a full-fledged Institution known as the College of Fort William at Calcutta. Lord Wellesley wrote in one of his letters about this College.

> "The G. G. considered the College at Fort William to be the most becoming public monument which the East India Company could raise to commemorate the conquest of Mysore. He has accordingly dated the law for the formation of the College on the 4th May 1800, the first anniversary of the reduction of Serangapatam."[1]

Dr. Gilchrist was appointed first Professor of Hindustani in the College of Fort William on the 29th September 1800 and worked in this position until 1804.

During this period of four years he started work on various projects concerning Hindustani (Urdu) language. He was an ambitious man and spent large amount of money on publications which was not liked and approved by the Authorities. According to Ranken "Gilchrist had submitted a statement showing that the expense of compiling and printing Books for 1802, Hindustani alone, was Rs. 63,000. So the differences between Gilchrist and the College Council began and as a disgusted man he had to resign his post in 1804. His resignation was accepted. However, the work he had done in the field of Hindustani (Urdu) language was very much appreciated and this apprecation was put on record.

He left for England the same year, spent few years in Scotland but ultimately came to London in 1816 and founded a College of Hindustani Language in Leicester Square which remained alive until 1825. Although the East India Company closed this Institution after some time but Dr. Gilchrist continued his teaching of

1. Letters of Marquess Wellesley respecting the College of Fort William, No. 43.
2. Ranken : Fort William, College, p. 52.

Introduction

Dr. John Brothwick Gilchrist was born in Edinburgh in 1759. He was educated at George Heriot's Hospital and qualified to be a Physician by Profession. It has been mentioned in the Dictionary of National Biography that "having studied for the Medical Profession and obtained the appoinment of Assistant Surgeon in the East India Company's Service on 3 April 1783, he went out to Calcutta." He was promoted to a Surgency on 21st October 1794 (Dodwell and Miles, Medical Officers of Indian Army, pp. 22, 23)[1]

It is not correct that after completing his studies in Medicine he was employed in England as an Assistant Surgeon by the East India Company. In fact he came to India privately at his own expense and landed at Bombay in 1782. Various documents in the National Archives of India, confirm that Dr. Gilchrist first came to India and was appointed as Assistant Surgeon in November 1783. Colonel Morgen, Commander of the Madras Army stationed in Bengal, recommended his appointment to the Governor - General Warren Hastings in a letter on 26th January 1783.[3]

Dr Gilchrist served as Assistant Surgeon but at the same time started taking interest in local languages, particularlly Urdu language which was commonly spoken in Northern India. This interest in the language urged him to work on various aspects of Urdu and in a short period he was able to produce a Dictionary and a Grammar. First part of this Dictionary was published in 1786 and the Grammar came out of the press in 1798. In 1798 he also published 'The Oriental Linguist' which is in fact an introduction to the Indian Languages.

These publications made him a renowned Linguist and throughout India he was regarded as an expert in the subject. He also founded a School for teaching Indian languages known as "Oriental Seminary"

---

1. Dictionary of National Biography, Vol. XXI.
2. Dodwell and Miles: Medical Officers of Indian Army.
3. M. Atiq Siddiqui: Gilchrist Aur US Ka Ahd, p. 64.

Poems of DR. JOHN GILCHRIST

Professor of Hindustani (Urdu)
in the College of
Fort William, Calcutta.

Edited with Introduction
By
DR. EBADAT BRELVI, M.A., Ph.D.,
Professor of Urdu Literature.
University of the Punjab,
Principal,
University Oriental College, Lahore.

UNIVERSITY ORIENTAL COLLEGE
Lahore, Pakistan.

ڈاکٹر عبادت بریلوی

مطبوعات

۱۔ اقبالیات

۱۔ جشن نامۂ اقبال (اُردو) شائع کردہ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۲۔ جشن نامۂ اقبال (انگریزی) 〃 〃 〃 〃
۳۔ اورینٹل کالج میگزین اقبال نمبر (اُردو) 〃 〃
۴۔ اورینٹل کالج میگزین اقبال نمبر (انگریزی) 〃 〃
۵۔ اقبال کی اُردو نثر اقبال اکیڈمی، لاہور
۶۔ اقبال ـــــ احوال و افکار مکتبۂ عالیہ، لاہور
۷۔ جہانِ اقبال (ادبی سوانح) (زیرِ طبع) ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۸۔ اقبال کی غزل 〃 〃 〃 〃
۹۔ منظوماتِ اقبال 〃 〃 〃 〃
۱۰۔ اقبال کا فن 〃 〃 〃 〃

۲۔ ادبی دریافت (نادر قلمی نسخوں کی دریافت اور ترتیب و تدوین)

۱۱۔ شکنتلا، مؤلفہ مرزا کاظم علی خاں (مع مقدمہ) اُردو دنیا، کراچی
۱۲۔ ہفت گلشن، مؤلفہ منظر علی خاں ولا 〃 〃 〃

۱۳۔ مادھونل اور کام کندلا، مؤلفہ مظہر علی خاں ولاؔ (مع مقدمہ) اردو دُنیا، کراچی۔
۱۴۔ دیوانِ ولاؔ، مؤلفہ مظہر علی خاں (مع مقدمہ) ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۱۵۔ گلزارِ چین، مؤلفہ خلیل علی خاں اشک اورینٹل کالج لاہور
۱۶۔ رسالہ کائنات " " " "
۱۷۔ شکوہ فرنگ، " آغا حجو شرف " "
۱۸۔ چار گلشن، مؤلفہ بینی نارائن جہاں (مع مقدمہ) " "
۱۹۔ دیوان مبتلا، " عبید اللہ خاں مبتلاؔ " " "
۲۰۔ دیوان حیدری، مؤلفہ سید حیدر بخش حیدری، اُردو دنیا، کراچی
۲۱۔ مختصر کہانیاں " " " "
۲۲۔ تذکرہ گلشن ہند (تذکرۂ حیدری) " " "
۲۳۔ گلزار دانش (دفتر اول) مع مقدمہ " اورینٹل کالج، لاہور
۲۴۔ گلزار دانش (دفتر دوم) مع مقدمہ مؤلفہ سید حیدر بخش حیدری، اورینٹل کالج لاہور
۲۵۔ مرقع مخلص مؤلفہ آنند رام مخلص مع مقدمہ و حواشی " "
۲۶۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی انگریزی نظمیں۔ مؤلفہ ڈاکٹر جان گل کرسٹ اورینٹل کالج لاہور

DR. JOHN GILCHCRIST: UNPUBLISHED POEMS

۲۷۔ نقلیات ہندی جلد اول و دوم۔ مؤلفہ ڈاکٹر جان گل کرسٹ اورینٹل کالج لاہور
۲۸۔ افسانۂ عشق، مؤلفہ الٰہی بخش شوق اکبر آبادی مع مقدمہ " "

۲۹۔ سیاحت نامہ، مؤلفہ نواب کریم خاں مع مقدمہ: ادارۂ ادب و تنقید لاہور
۳۰۔ نالۂ درد مؤلفہ حضرت خواجہ میر درد (اُردو ترجمہ مع مقدمہ) " "
۳۱۔ نکات الشعراء، مؤلفہ میر تقی میر (مع مقدمہ و حواشی) " "
۳۲۔ دیوان فارسی مؤلفہ حضرت خواجہ میر درد (" ") " "
۳۳۔ جشن نامہ اورینٹل کالج (جلد اوّل) اورینٹل کالج لاہور
۳۴۔ جشن نامہ اورینٹل کالج (جلد دوم) " "
۳۵۔ خطوط عبدالحق بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی " "

۳۔ تحقیق و تنقید

۳۶۔ اُردو تنقید کا ارتقا انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی
۳۷۔ روایت کی اہمیت " " "
۳۸۔ غزل اور مطالعۂ غزل " " "
۳۹۔ خطباتِ عبدالحق مع مقدمہ " " "
۴۰۔ مقدماتِ عبدالحق مع مقدمہ اُردو مرکز لاہور
۴۱۔ انتخاب خطوطِ غالب " "
۴۲۔ تنقیدی زاویے۔ پہلا ایڈیشن: مکتبہ اُردو، لاہور
دوسرا ایڈیشن: اُردو مرکز، لاہور
۴۳۔ تنقیدی تجربے اُردو دنیا، کراچی
۴۴۔ مومن اور مطالعۂ مومن " "
۴۵۔ جدید شاعری " "
۴۶۔ کلیاتِ میر مع مقدمہ " "

٤٧۔ کلیات مومن، مع مقدمہ	اُردو دنیا کراچی
٤٨۔ شاعری اور شاعری کی تنقید	〃 〃
٤٩۔ سحرالبیان ۔ ایک تنقیدی مطالعہ	اورئینٹل کالج، لاہور
٥٠۔ غالب اور مطالعۂ غالب	رائٹرز اکیڈمی، لاہور
٥١۔ غالب کا فن	گلوب پبلشرز، لاہور
٥٢۔ اقبالؒ کی اُردو نثر	اقبال اکیڈمی، لاہور
٥٣۔ اقبالؒ احوال و افکار	مکتبۂ عالیہ، لاہور
٥٤۔ میر تقی میر (حیات اور شاعری)	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
٥٥۔ ولی اورنگ آبادی (〃)	〃 〃 〃
٥٦۔ پاکستان کے تہذیبی مسائل	〃 〃 〃
٥٧۔ حضرت خواجہ میر دردؒ	〃 〃 〃
٥٨۔ ادب اور ادبی قدریں	〃 〃 〃
٥٩۔ تنقید اور اصولِ تنقید	〃 〃 〃
٦٠۔ افسانہ اور افسانے کی تنقید	〃 〃 〃
٦١۔ شاعری کیا ہے؟	〃 〃 〃
٦٢۔ جہانِ میر	〃 〃 〃
٦٣۔ میر کی غزل	〃 〃 〃
٦٤۔ منظوماتِ میر	〃 〃 〃
٦٥۔ نظیر اکبر آبادی	〃 〃 〃
٦٦۔ جدید اُردو ادب	〃 〃 〃
٦٧۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	〃 〃 〃

۶۸- میر امن دہلوی	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۶۹- سید حیدر بخش حیدری	" " "
۷۰- ڈاکٹر جان گلکرسٹ	" " "

۴- رپورتاژ، ڈائری وغیرہ

۷۱- ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک	گلوب پبلشرز، لاہور
۷۲- جشنِ صد سالہ اورینٹل کالج، لاہور	اورینٹل کالج، لاہور
۷۳- جشنِ اقبالؒ نئی دہلی	" "
۷۴- آزادی کے سائے میں	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۷۵- اورینٹل کالج میں تینتیس۳۳ سال	" " "
۷۶- لندن میں پانچ سال	" " "
۷۷- لندن کی ڈائری	" " "

۵- خاکے

۷۸- رہ نوردانِ شوق :	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۷۹- آوارگانِ عشق :	" " "
۸۰- جلوہ ہائے صد رنگ	" " "
۸۱- یارانِ دیرینہ	" " "
۸۲- شجر ہائے سایہ دار	" " "

۶- ادبی سوانح

۸۳- یادِ عہدِ رفتہ (خود نوشت)	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور

۸۴۔ جہانِ میر ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۸۵۔ جہانِ اقبالؒ " " "
۸۶۔ جہانِ غالبؔ " " "
۸۷۔ سر سیدؔ احمد خاں " " "
۸۸۔ مولانا حسرتؔ موہانی " " "
۸۹۔ جگرؔ مراد آبادی " " "
۹۰۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق " " "
۹۱۔ جوشؔ ملیح آبادی " " "

مُستقبل کے منصوبے — ترتیب و تدوین

۹۲۔ مطبوعہ و غیر مطبوعہ خطوطِ اقبالؒ (علامہ اقبالؒ کے خطوط کی ترتیب و تدوین مع مقدمہ و حواشی)
۹۳۔ غیر مطبوعہ خطوط بابائے اُردو بنام ڈاکٹر عبادت بریلوی
۹۴۔ غیر مطبوعہ خطوط نیاز فتحپوری "
۹۵۔ غیر مطبوعہ خطوط طاہر فاروقی "
۹۶۔ غیر مطبوعہ خطوط پروفیسر سید احتشام حسین "
۹۷۔ غیر مطبوعہ خطوط پروفیسر مسعود حسن ادیب "
۹۸۔ غیر مطبوعہ خطوط محمد حسن عسکری "
۹۹۔ غیر مطبوعہ خطوط رالف رسل "
۱۰۰۔ مقالات عبدالحق (چار جلدوں میں)